

سلطان میرزا

میرزا



سلطان ٹیپو شہید

جنوبی ہند (بھارت) کے اس شہید وطن کی خوں فشاں داستان جو برصغیر کی تاریخ میں ایک ایسا خونچکاں باب رقم کر گیا جو تا ابد منور رہے گا۔

سلطنت خداداد میسور کو، جسے نواب حیدر علی نے اسلامی سلطنت کے پیکر میں ڈھالا اور مسلمانوں کے اس تاج کو قائم رکھنے کے لیے نذرانہ بنا پیش کیا۔

بنگال کے سراج الدولہ اور دکن کے سلطان شہید مسلمانوں کی آزادی کے لیے، سنگ میل ہیں جن پر چلتے ہوئے ہم نے پاکستان حاصل کیا۔

الہامس، ایم۔ اے





جنوبی بھارت میں بنگلور سے شمال مشرق کی جانب بائیس میل کے فاصلے پر وہ خوش نصیب
 مہاراجہ لہن بلی رہے جس کی سر زمین کو عظیم حکمران نواب حیدر علی خاں کے منظم بیٹے ابوالفتح
 فتح علی شاہان پٹو کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔
 یہ سال شہنشاہ برادر شاہ ۲۰ - ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۵۲ء پہلی ساعت میں سالم وجود
 میں آیا۔

سلطان کی پیدائش قلعہ کے باہر ایک مکان میں ہوئی تھی۔ اب وہ مکان موجود نہیں البتہ
 ایک بوتل ہے جس پر ایک گنبد لگا ہے جو سلطان کی تاریخ پیدائش بتاتا ہے۔ اس چوڑے
 لہ کرہ اگر د ایک چار دیواری میں کی جاتی ہے۔
 سلطان ٹیپو کی پیدائش بڑے عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی۔ ان کے جلیل القدر
 والد نواب حیدر علی خاں نے دو شادیاں کیں۔ حیدر علی کی عرس انیس سال کی تھی تو مہسور کے
 وہ دیرسند راج نے ان کی شادی اپنے خراج پر پیرزادہ شاہ میاں ساکن سرائی لڑکی سے کرا
 دیا تھی۔ ان کی اس بیوی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد وہ بیوی معذور ہو گئی۔
 کچھ دنوں بعد معذور بیوی نے خود حیدر علی کو مجبور کر دیا کہ وہ دوسری شادی کر لیں۔
 پھر حیدر علی نے دوسری شادی میرزا علی خاں کی ہمشیرہ فاطمہ بیگم عرف غزالہ سے کی۔
 معذور بیوی نے دوسری شادی کی اجازت اس وجہ سے دی تھی کہ دوسری بیوی کے بطن

سے حیدر علی کے اولاد زرمینہ پیدا ہونا کہ اس کی نسل برقرار ہے۔

حیدر علی خاں نے بھی دوسری شادی اسی لالچ میں کی تھی کہ انہیں نئی بیوی سے بیٹا حاصل ہو گا مگر ان کی بہرادر پوری ہوئی دکھائی نہ دے رہی تھی اور چھ سات سال گزرنے کے باوجود ان کا کاخانہ اقبال اس وقت مقصود سے خالی تھا جسے لڑکا مانتے ہیں۔

اسی دنوں فاطمہ بیگم کی کسی سہیلی نے اسے ٹیپوستان کا بیٹہ بنایا اور ترغیب دی کہ ان کے مزار پر جا کر دعا مانگے تو کیا عجیب اے اولاد حاصل ہو۔

فاطمہ کے دل میں سہیلی کی بات لگ گئی۔ اس نے اس کا تذکرہ شوہر سے اس قدر شدت سے کیا کہ حیدر علی بیوی کو لے کر اسی وقت ٹیپوستان کے مزار کی طرف چل پڑے۔ یہ مزار ارکاٹ میں تھا۔

دونوں میاں بیوی وہاں پہنچے اور ٹیپوستان کی وساطت سے بارگاہ ایزدی میں دعا مانگی۔ یہ دعا مستجاب ہوئی اور جب حسبِ منت، بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام ٹیپوستان کے آپر ابو الفتح فتح علی ٹیپو سلطان رکھا گیا۔

ٹیپو سلطان کی بدلتش نے جیسے حیدر علی کی قسمت کھول دی۔ ایک ہی سال کے اندر وہ ترقی کے ڈنڈے لگنے لگے گزرنے ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے زور بازو کا مالک بنا دیا کہ ریاستوں اور بادشاہتوں کی قسمتیں ان کے اشاروں کی محتاج ہونے لگیں۔

آئندہ چند برسوں میں ایسا ہوا کہ ۳۳ دیہات پر مشتمل ریاست میسور، وریلے کرشنا کے جنوب میں پورے جنوبی ہند پر محیط ہو گئی اور اس نے ریاست سے ایک عظیم مملکت کا روپ دھار لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ارکاٹ (والاجہ محمد علی) اور نظام دکن جو مضبوط اسلامی ریاستیں تھیں، وہ کبھی تو سلطنت میسور کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور کبھی میسور کی مضبوط جڑیں اکھاڑنے میں لگ پڑیں۔

انہوں کے علاوہ غیروں یعنی انگریزوں، فرانسیسیوں، وندیزیوں اور مرہٹوں کو بھی حیدر علی سے پرغاش ہو گئی اور وہ تیزی سے بڑھتی ہوئی اس طاقت سے حمایت رہنے لگے۔

ایسی مشنوں مرادوں سے پیدا کرنے والے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے حیدر علی خاں نے کیسے کیسے علی استاد اور ماہرین فن مقرر کیے ہوں گے۔ پانچ سال کی عمر سے شہزادہ ٹیپو نے

فارسی زبان میں تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ساتھ ساتھ انہیں جہان بینی اور جہانگیری سکھانے کے لیے بھی اعلیٰ پیمانے پر انتظامات کیے گئے۔

عجیب بات یہ تھی کہ سلطان ٹیپو کو انداز ہی سے "سببِ ظلم" سے تقریباً یکساں طور پر دلچسپی تھی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں شہزادہ ٹیپو ہیں ایک مکمل شہسوار اور دوسرے فنونِ جنگ میں ماہر سپاہی نظر آتا ہے۔ بلکہ اس سے صحت پختہ یعنی گیارہ سال کی عمر میں شہزادہ ہیں بدخود کے میدانِ جنگ میں باپ کے ساتھ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

شہزادہ ٹیپو کے بچپن کے حالات میں سب سے دلچسپ اور حیرت انگیز وہ واقعہ ہے کہ جب ایک روز وہ سرنگا پٹم کی ایک لگی میں ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا تو اودھر سے ایک فقیر روشن نمبر کا گزر ہوا۔

اس وقت سلطان ٹیپو کے والد حیدر علی، راجہ میسور کی فوج میں محض ایک ناہک کا حیثیت سے ملازم تھے اور زبردستی تھے۔

فقیر روشن ضمیر نے ٹیپو سلطان کے پاس رک کر اس سے کہا: "تیری خوش نصیبی ایک دن تجھے اس ملک کا بادشاہ بنائے گی۔ جب وہ وقت آئے تو اس جگہ آبد۔ ایسی مسجد تعمیر کرنا جو زمانے میں تیری یادگار رہے۔"

ذہن شہزادے نے مسکراتے ہوئے بزرگ کو جواب دیا تھا: "جب میں بادشاہ ہوں گا تو ایسا ضرور کروں گا۔"

ایک بچے کا یہ یقین کتنی قدر تعجب خیز ہے کہ اس وقت اس کا باپ حیدر علی خاں راجہ میسور کا معتب ہو کر میدانِ جنگ میں کھانڈے راؤ سے اپنی آخری بازی کھیل رہا تھا۔ اس کی ماں اور دوسرے اعزہ قلعہ میں اسیر تھے مگر بچہ پر یقین انداز میں کہہ رہا تھا کہ فقیر روشن ضمیر کی پیش گوئی کی یقیناً تعمیل ہوگی۔

چھ روزہ نے دیکھا کہ شہزادہ ٹیپو واقعی سلطان بنا اور اس نے اسی جگہ ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی جس جگہ کھڑے ہو کر فقیر روشن ضمیر پیش گوئی کی تھی اور شہزادے نے اس کے پورا کرنے کا عہد کیا تھا۔

ٹیپو سلطان کی بنائی ہوئی اس مسجد کا نام "مسجدِ علی" ہے جو آج بھی سرنگا پٹم میں اس کی عظمت اور شہادت کی یاد دلاتی ہے۔

شہزادہ پندرہ سال کی عمر میں باقاعدہ طور پر حیدری نوج میں شامل ہو کر ایک ہبلور سپاہی کی طرح وادِ شجاعت دینے لگا تھا۔

پھر دو ہی سال کے اندر اس نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا دوست اور دشمن سے منوایا اور حیدر علی نے جوان سال بیٹے کو ایک جنرل کی طرح فوجوں کی علیحدہ کمان سپرد کر دی تھی۔

شہزادہ بیٹو کے تمام جنگی کارنامے جو اس نے اپنے والد نواب حیدر علی خاں کی حیات میں سرانجام دیے، ان کا حال آپ کچھل اقساط میں ملاحظہ فرما چکے ہیں مگر یہاں دوبارہ سلسلہ قائم کرنے کے لیے ان کا اجمالاً ذکر کیا جا رہا ہے۔ (تفصیل کے لیے پماری کتاب حیدر علی ملاحظہ کیجیے)

۱۷۷۴ء میں جب شہزادے کی عمر صرف اکیس سال تھی، حیدر علی خاں نے اسے آٹھ ہزار سوار بوجھن پوشش اور بائیس توپوں کے ساتھ مرہٹہ سردار نرنگ راؤ کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ شہزادہ پانچ گھنٹے پہنچ کے میدانِ کادیڑی میں خیمہ زن ہوا۔

اس وقت جاسوسوں نے اطلاع دی کہ مرہٹہ فوج دھرم پوری کو لوٹ رہی ہے اور اس کے ہمراہ دوسری آبادیوں کا لوٹا ہوا سامان ادنیٰ، بیلیوں اور ٹماٹھیوں پر لدا ہوا بھی موجود ہے۔

شہزادے نے اپنی فوج کے چند دستوں کو مرہٹی لباس پہنواٹے اور خود بھی مرہٹہ لباس پہن کے ان دستوں کو ساتھ لے کر دھرم پوری پہنچا۔ مرہٹہ فوج نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ بھی مرہٹہ فوج کا حصہ ہیں، ان پر کوئی توجہ نہ دی۔

جب لوٹ مار ختم ہوئی اور سامان جانوروں پر بار کیا جانے لگا تو شہزادے نے مخصوص انداز اور آواز میں حکم کا حکم دے دیا۔

اس حکم کے ساتھ ہی شہزادے کے سپاہیوں نے مرہٹوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ مرہٹے اس اچانک حملے سے ایسا گھبراتے کہ بے حواس ہو کر در تمام سامان چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے۔

وہ بھاگتے جا رہے تھے۔

اور گولیاں ان کا نقاب کر رہی تھیں۔

اس طرح شہزادے کی حکمتِ علی کے طفیل سینکڑوں مرہٹے قتل ہوئے۔ شہزادے کو اس ہم میں چار ہزار گھوڑے، سینکڑوں بیل، اونٹ اور بیس ہاتھی بھی ماتہ آئے جن پر لوٹ کا ساما لدا ہوا تھا۔ شہزادہ یہ سارا مال و اسباب لے کر محلے گاڑی کی طرف واپس ہوا۔

اس جنگ میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس میں شہزادے نے فراست اور شہر زنی کے جوہر دکھائے۔

شہزادہ دریائے ماگری درگ کے کنارے خیمہ زن تھا۔ اس کے ساتھ چھ ہزار سوار تین ہزار شتر سوار اور تین ہزار سواروں کے علاوہ توپ خانہ بھی تھا۔

ادھر دریائے رائے پتی کے کنارے مرہٹوں کا رسد کا قافلہ آ کر ٹھہرا جس میں ۸۳ ہاتھی، اونٹ اور بیل وغیرہ تھے۔ ان صوب پر سامان رسد بار تھا۔ اس قافلہ کی حفاظت پیردس ہزار سوار مامور تھے۔

شہزادے کو خبر ملی تو اس نے قافلہ پر شب خون مارا۔ رات بھر جنگ ہوتی رہی اور شہزادے کا لشکر مرہٹوں کا قتل عام کرتا رہا۔

صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ تمام مرہٹہ لشکر قتل ہو چکا ہے۔ صرف چند گنتی کے افراد جان بچا کر بھاگ سکے تھے۔

شہزادے نے تمام سامان رسد اور بہت سا اسلحہ جو اس قافلہ سے حاصل ہوا، فی الفور مرزا پیم روانہ کر دیا۔

۱۷۷۶ء کی میسوری پہلی جنگ میں شہزادہ بیٹو نے ایک اور معرکہ مارا۔

حیدر علی خاں نے شہزادے کو سات ہزار کا لشکر دے کر "ننگر" کی طرف روانہ کیا جہاں انگریز لشکر مقیم تھا۔

شہزادہ بندرگاہ کو ڈیال پہنچا جہاں انگریزوں کے کئی جہاز ان کی مدد کو موجود تھے۔ قلعہ پر بھی انگریزوں کا قبضہ تھا اور قلعہ سے ساحل سمندر تک انگریزوں کا لشکر پھیلا ہوا تھا۔

شہزادے نے فوراً حملے کی نادرانی نہیں کی بلکہ باپ کو اطلاع دی کہ دشمن کا لشکر بے شمار ہے، قلعہ سے ساحل سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔ اب کیا حکم ہے؟

حیدر علی اس مراسلہ کے جواب میں خود ملک لے کر پہنچ گئے۔ پھر شہزادے کو قلعہ پر حملہ کا حکم دیا۔

شہزادے نے ایسا طوفانی حملہ کیا کہ انگریزوں کو قلعہ چھوڑ کر جہازوں میں پناہ لینی پڑی۔ شہزادے نے دشمن کو ساحل پر بھی نہ ٹھہرنے دیا اور آخر کار انگریز اپنے بڑی جہاز لے کر مائل کھڑے ہوئے۔

انگریزوں کے ساتھ اس پہلی جنگ میں مرہٹے اور نفاؤدکن انگریزوں کے حلیف تھے اور
دو برسوں کے خلاف جنگ جگہ جگہ سناڑ کھول رکھے تھے۔ حیدر علی نے اس وقت شہزادہ ٹیپو
کو ایک لشکر دے کر مدراس پر حملہ کے لیے بھیج دیا۔

شہزادے نے مدراس پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ انگریز سراسیمہ ہو گئے اور انہیں
حیدر علی کی شرائط پر معاہدہ کرنا پڑا۔

اسی سال نوجوان شہزادے نے بحیثیت سپہ سالار کے کڑپٹہ، کونول، بلاری، اناگندی
اور دھاڑواڑ پر شکست کھائی اور ان تمام معرکوں میں نصرت و فتح مندی نے اس کے قدم چومے۔
شہزادہ ٹیپو کے ہر معرکہ اور کام میں جرات اور استعجاب کا ایک پہلو ضرور نظر آتا ہے۔
یہاں تک کہ اسی کی شادی بھی ایک جرات الگبر و افندہ بن گئی۔

جب حیدر علی خاں کو لڑائیوں سے کچھ فرصت ملی تو انہوں نے شہزادہ ٹیپو اور خاندان کے
دوسرے شہزادوں اور شہزادیوں کی شادیوں کی طرز و توجہ دی۔

دوسرے شہزادوں اور شہزادیوں کے معاملات تو خوش اسلوبی سے طے ہو گئے مگر شہزادہ ٹیپو
کی شادی میں ایک زبردست رخصت پیدا ہو گئی۔

حیدر علی، جس جگہ شہزادہ ٹیپو کی شادی کرنا چاہتے تھے وہاں ان کے خاندان والے اور
خاص کر ان کی بیوی فاطمہ بیگم رضامند نہیں تھیں۔ فاطمہ بیگم اور دیگر خواتین محل نے شہزادے کے
لیے خاندان ہی کی ایک لڑکی رقیہ ابوبنت لالہ میاں، عیشہ برہان الدین، کو پسند کر لیا تھا جبکہ
نواب بہادر نے اپنی بیوی کے لیے امام صاحب بخشی نامی لڑکی کو منتخب کیا تھا۔ اس معاملہ پر میاں
بیوی میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا۔

آخر اس کا حل حیدر علی خاں کی والدہ محترمہ مجیدہ بیگم نے پیش کیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ
شہزادے کی شادی ان دونوں لڑکیوں سے کی جائے جنہیں حیدر علی اور فاطمہ بیگم نے الگ الگ
پسند کیا ہے۔

اس طرح ایک ہی رات میں شہزادے کی بارات دوبار چڑھی۔ ایک بار بارات امام صاحب
کے گھر گئی اور دوسری بار بارات لالہ میاں کے دولت گھر سے پرہیچنی۔ دونوں لڑکیوں کا شہزادہ
کے ساتھ عقد ہوا اور دہنیں بیاہ کر ت ہی محل میں آ گئیں۔

نواب بہادر حیدر علی خاں ابھی ان شادیوں سے بمشکل فارغ ہوئے تھے کہ انہیں مرہٹوں کا

انعام دکن اور انگریزوں سے کئی جنگوں میں الجھنا پڑ گیا۔ ان تمام جنگوں میں نو عمر شہزادہ ٹیپو ان
کے ہمراہ تھا۔

پہلے قلعہ گتئی فتح ہوا۔ پھر قلعہ چنل درگ، علائقہ کڑپٹہ اور کینچی کوٹہ سلطنت خداداد میسور
میں شامل کیے گئے۔

میسور کی دوسری جنگ وہ آخری جنگ تھی جس میں شہزادے نے اپنے باپ کے
مانے میں جو ہر شمشیر دکھائے۔

اس جنگ میں حیدر علی کو انگریزوں کے دہڑے جرنیلوں، کرنل ہیلی اور جرنل کوٹسے
تقابلہ کرنا پڑا۔

حیدر علی نے کرنل ہیلی کو جو شکست دی اس میں شہزادے ٹیپو کی بہادری اور کارگزاری
سب سے زیادہ دخل تھا۔

انگریزوں کا دوسرا جرنل سر آرمی کوٹ انتائی تجربہ کار جرنل تھا۔ اس نے ایک بار حیدر علی
فوق کو شکست بھی دی تھی مگر جس وقت محمود بندر پر لڑائی ہو رہی تھی تو حیدر علی خاں نے اپنی
فوجوں کی کمان شہزادہ ٹیپو کے سپرد کر دی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شہزادہ کس درجہ
فنون جنگ میں ماہر ہو گیا تھا!

ابھی میسور کی دوسری جنگ ختم نہ ہوئی تھی کہ شہزادے کا عظیم باپ نواب حیدر علی خاں
اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

مہاراجا کی موت اچانک نہیں ہوئی تھی۔ پچھلے چھ سات سال سے وہ سرطان کے موزی
من میں مبتلا تھے۔ ہر سال ان کی پیٹھ پر سرطان کا زہر پلا چھوڑا نکلتا جس کا زہر لہڑائی کے

۱۸۰۸ء تک لگا رہا تھا اور نواب بہادر آرام کرنے کے بجائے پھر گھوڑے کی پشت پر نظر آتے۔
۱۸۰۸ء دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھتی رہی۔ ۱۸۰۲ء کے آخری دنوں میں وہ بے حد کمزور

۱۸۰۲ء کے آخری دنوں میں وہ بے حد کمزور
۱۸۰۲ء کے آخری دنوں میں وہ بے حد کمزور
۱۸۰۲ء کے آخری دنوں میں وہ بے حد کمزور

آخر بھان اور مخلصان سلطنت خداداد نے زبان کھولی :
شاہ - ہماری جانیں آپ پر تیار۔ اگر مناسب ہو تو شہزادے ٹیپو کو بلا لیجیے اور کاروبار
سلطنت ان کے حوالے کر کے محل صحت یا بی بی تک آرام فرمائیے۔

معاہدین ایسی درخواستیں کئی بار پیش کر چکے تھے اور وہ دھوکے نہیں لیکن اس بار

نواب بہادر جاں نثاروں کی بات ٹال نہ سکے اور انھوں نے شہزادے کو لکھا:

”نور چشم راحت جان پدر!“

در صورتی کہ تمہیں اس نواح کے مفیدوں کی تادیب سے
قرار واقعی اطمینان حاصل ہو تو چشم پدر کو اپنے دیدار راحت آثار
سے جلد روشن اور منور کرو اور اگر کچھ کمک یا فوج کی احتیاج ہو
نواس کا حال گزارش کرو۔“

ڈاکٹر درانی نے اپنی کتاب میں حیدر علی خاں کا خط بنام شہزادہ شیو پوری تفصیل سے درج
کیا ہے۔ اس کی نقل یہاں پیش کرنا ضروری ہے کیونکہ اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ
نواب بہادر نے اس خط کے ذریعے امر اور مصاحبین کے اصرار پر شہزادے کو تمام اختیارات
سونپ دیے تھے۔

خط اس طرح ہے:

”اگر تم اس علاقے کی تادیب سے مطمئن ہو چکے ہو تو چشم پدر
کو اپنے دیدار راحت آثار سے روشن اور منور کرو۔ اس سے
پہلے پورے معاملات کا جائزہ لے کر دیکھ لو کہ مزید فوج کی ضرورت
ہے کہ نہیں۔ اگر ضرورت ہو تو اپنی مدد کے لیے اور فوج بلواؤ۔
ہم تمہیں امور سلطنت کا اختیار بناتے ہیں اس لیے ایک پل کے
لیے بھی سرکاری کاموں میں تامل اور تغافل نہ برتو۔“

جب شہزادے کو حیدر علی خاں کا یہ خط ملا تو وہ بالا گھاٹ میں انگریزوں کے مقابلہ پر غم
ٹھونکے کھڑا تھا۔

انگریز لشکر کے سالار ہمبرسٹن اور کرنل روز ویلنگ تھے۔ دشمن بالا گھاٹ پر قابض تھا۔
۲۰ نومبر ۱۸۵۷ء کو شہزادے نے ہمبرسٹن پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا
اس طرح پسپا ہوتے ہوئے وہ دریائے پوٹانی کے کنارے پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کے ہمبرسٹن نے ایک جنگی چال چلی اور شہزادہ شیو کی فوجوں کو گھیرے
لیے لیا۔

اس وقت شہزادہ شیو کے ساتھ فرانسیسی سردار موسیولال بھی تھے ان دونوں نے کوشش

کے دشمن کا گھیرا توڑ دیا۔ پھر شہزادہ باپ سے ملنے کے لیے تیار ہوا۔
اسی دوران اسے باپ کا خط ملا اور ۱۲ دسمبر کو وہ اپنا لشکر لے کر میسور کی طرف
روانہ ہو گیا۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب حیدر علی لشکر نے اراکٹ کا قلعہ فتح کر لیا تو والاباہ محمد علی کے
نام امرا اور اراکین ریاست گرفتار کر کے حیدر علی کے حضور پیش کیے گئے۔
ان گرفتار ہونے والوں میں اچنا پڈت، ارشد بیگ خاں، چشتی یار خاں، سید حیدر خاں
بنو ناسر اور میر صادق علی وغیرہ شامل تھے۔ ان لوگوں نے حیدر علی سے معافی کی درخواست
کی اور سلطنت میسور کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔

حیدر علی نے ان امراہی کو نہیں معاف کیا بلکہ عام معافی کا اعلان کر دیا۔ والاباہ کے ان
امراہی میر صادق سب سے زیادہ چالاک، مکار، چرب زبان اور کبیہ پرور تھے۔ میر صادق
نظام اکبر کے ذریعہ امیر میر عالم کا بھائی تھا مگر یہ راجہ خروقت تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا
میر صادق نے حیدر علی پر ایسا رومن قاز ملا کہ وہ بھی فریب کھا گئے اور انہوں نے اس خفاقی کو
افسر محمولات بنا دیا۔

حیدر علی کے انتقال کی خبر کو پوشیدہ رکھا گیا مگر یہ خبر شہزادہ شیو کو پہلے سے مرکاٹم
پہنچ گئی۔ اور وہاں موجود اراکین سلطنت نے شہزادہ شیو کے چھوٹے بھائی کریم صاحب کو
نشین کر دیا۔

کچھ عرصے تک یہ قدم معطل تھا کیونکہ ایک خیال یہ بھی ہے کہ شہزادہ شیو کے بجائے
کریم صاحب کو تخت نشین کرانے میں اراکات کے تائب ہونے والے امرا جن میں پیش
پیش میر صادق تھا، کا یہ منصوبہ کار فرما تھا کہ ان کے خیال میں شہزادہ شیو پر قابو پانا مشکل تھا
بہت شہزادہ کریم صاحب ایک کمزور طبیعت کا جوان تھا جس پر آسانی سے قابو لایا جاسکتا تھا۔
میسور کے اندرونی حالات اتنے خوفناک نہیں تھے جتنا کہ شہزادہ شیو وہاں سے درمیٹھا
جنگوں میں محسوس کر رہا تھا تاہم کچھ خطرات تھے ضرور۔

مرکاٹم میں اس کے چھوٹے بھائی کریم صاحب کو تخت نشین کیا جا چکا تھا یہ ایک نیکو

نہیں تو خطرناک بات ضرور تھی۔

دوسرا خطہ جو زیادہ نمایاں معلوم ہوتا تھا، وہ راجہ میسور کی بغاوت کا ارکان تھا، جس کا بیج انگریز بونے چلے آ رہے تھے۔

میسور کا کاغذی راجہ کرشن راج دوم ۱۷۹۱ء میں آجمنائی ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ نواب مرحوم نے اس کے بیٹے نند راج کو گدی نشین کیا۔ وہ بھی ۱۷۹۶ء میں مر گیا تو اس کی جگہ چھوٹے بیٹے چامراج کو راجہ بنایا گیا مگر چھ سال بعد وہ بھی چل بسا۔

ان حالات میں نواب مرحوم اگرچہ تندرست و تندرست پٹن کو بڑی آسانی سے گدی نشین کر کے اس جگہ گئے مگر ہمیشہ کے لیے غم کر سکتے تھے لیکن ان کی جیت نے یہ گوارا نہ کیا اور انہوں نے اسی خاندان کے ایک بڑے کو خاصہ چراج کا نام دے کر راج گدی پر بٹھا دیا جو ایک طویل عرصے تک گدی نشین رہا۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ نواب بہادر نے میسور میں کاغذی راجاؤں کا سلسلہ برقرار رکھ کر اپنی آستین میں سانپ پال رکھے تھے کہ جب ایک مرتنا تو وہ فوراً دوسرے کو راجہ بنا دیتے اور یوں مفت میں راجہ بننے والے اور راج محل کی رانیاں ہمیشہ سلطنت خدا داد میسور کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں کوشاں رہتے۔ ان کی مسلسل یہ کوشش یہی کہ حیدر علی کو معزول کر کے میسور کے ہندو راجہ کو تخت نشین کیا جائے۔

نواب بہادر کے انتقال کے بعد اس طرح کی ایک زبردست سازش ہوئی تھی جسے "معابدہ رانا" کا نام دیا گیا۔ اس سازش کا مختصر حال اس طرح ہے:

نواب حیدر علی نے راجہ میسور سے ملکی اور حکومتی تمام اختیارات لے کر اسے معین ناکا راجہ بنا دیا تو جسے صرف مذہبی رسومات ادا کرنے اور بعض ہندو تہواروں پر نذرین وصول کرنے کے لیے دربار لگانے کی اجازت تھی۔

نواب مرحوم کی رواداری کی یہ انتہا تھی کہ جب کسی تہوار پر راجہ اپنا دربار سمجھاتا تو اس کے تمام اخراجات خزانہ حیدر علی سے ادا کیے جاتے تھے۔

راجہ کو اگرچہ اخراجات کے لیے ایک بھاری رقم وظیفے کے طور پر ادا کی جاتی تھی لیکن ایسے درباروں پر راجہ اس قدر رقم خرچ کر دیتا جو اس کے سالانہ وظیفے سے دس گنا سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔

آپ کے علم میں یہ بات ضرور ہوگی کہ ہندو مذہب میں آٹھ دن تہوار ہوا کرتے ہیں۔ ہندو ایک بڑا تہوار ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ راجہ سال میں کم از کم چار تہواروں پر دربار لگانے کو نواسٹ ضرور کرتا اور نواب بہادر کو اس کے اخراجات برداشت کرنا پڑتے تھے۔

اس سوال صرف کثیر رقم کے خرچ کا ہونا تو بھی اسے برداشت کیا جاسکتا تھا لیکن ایسے اہل میں سلطنت میسور کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے بڑے بڑے ہندو ہندوتہا پو جا پاٹ کے نام پر بلائے جاتے جو درپردہ راج محل میں خلیفہ اجلاس کرتے جن کو نواب بہادر کو معزول کرنے کے طریقے سوچے جاتے۔

سب سے زیادہ لطف کی بات یہ تھی کہ ان درباروں میں جن کے پس پردہ نواب بہادر کے خلاف سازشیں تیار ہوتی تھیں، ان میں اکثر نواب حیدر علی اپنے تمام اراکین سلطنت کے ممبران اور انیس نمائندگرتے اور ایک عام آدمی کی طرح راجہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے اور اسے نذر پیش کرتے تھے۔

لیکن

یہ سانپ اور سپرلیہ جنہیں نواب بہادر دودھ پلا پلا کے زندہ رکھے ہوئے تھے، نواب کو ہر دم ڈسنے کے لیے آمادہ رہتے۔

اسی طرح ایک تہوار پر راج محل کی رانیاں، مری رنگنا تو کے مندر کے بڑے بیجاری اور مار کے گڑھا میوا مندر کے پیشوا نے نواب بہادر کا تختہ الٹنے کی سازش تیار کی۔ اس سازش کا مندر رانی مل کی بڑی رانی کا گامشتہ ترمل راڈ تھا۔

ان سازشیوں کو معلوم تھا کہ اس سے پہلے بھی اس طرح کی کئی سازشیں ہو چکی ہیں جو سب میں موقع پر بے نقاب ہو گئی تھیں اور ان میں حصہ لینے والوں کو موت کا ذائقہ چکھنا پڑا تھا۔ اس لیے انہوں نے آپس میں طے کیا کہ اس مرتبہ وہ اپنی اس سازش میں حیدر علی کے سب سے بد دشمن یعنی انگریز کو بھی شریک کر دیں گے۔

چنانچہ طے یہ پایا کہ ترمل راڈ جیسے بدل کے مدراس جمائے گا اور وہاں انگریزوں کی حالت اور سازش کی تفصیلات طے کرے گا۔

ترمل راڈ کسی زمانے میں پونا میں رہ چکا تھا اور اس کے مرہمہ مرداروں سے بھی تعلقات تھے پس ترمل راڈ مسلمان کا جیسے بدل کر راج محل سے نکلے اور سیدھا مدراس پہنچا۔

ان دنوں میسور کی دوسری لڑائی ہو رہی تھی اور انگریز حیدری لشکر کے سامنے زچ ہو کر رہ گئے تھے۔

ترمل راؤ نے جب انگریز گورنر کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا تو وہ اچل پڑا اور اس نے اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا مگر اس منصوبہ میں کچھ ایسی خامیاں تھیں کہ انگریز یہ منصوبہ ناکام ہو جاتا تو اس میں کئی ہزار انگریز مارے جاتے۔

اس خطرے کے پیش نظر گورنر مدراس نے منصوبے کو منظور کر کے لیے کلکتہ (بنگلہ) بھیجنے کا فیصلہ کیا کیونکہ گورنر مدراس، بنگال کے لارڈ گورنر کے ماتحت تھا۔

کلکتہ جانے کے لیے بھی ترمل راؤ نے اپنی خدمات پیش کیں۔ ترمل راؤ دراصل یہ چاہتا تھا کہ جسے بھی ہو یہ سازش کامیاب ہو جائے اور راجہ رانی کے مدد سے کے مطابق وہ میسور کے پہلے وزیر اعظم کا عہدہ حاصل کرے۔

مدراس کے گورنر نے اپنے ایک کپتان کے ساتھ ترمل راؤ کو کلکتہ بھجوادیا۔ سازش واقعی کچھ ایسی خطرناک تھی کہ بنگال کا لارڈ گورنر بھی اس کی ذمہ داری لینے پر آمادہ نہ ہوا اور اس نے گورنر مدراس کو مشروط اجازت دی۔

اس نے یہ شرط عاید کی کہ جب تک میسور کے محاذ پر لڑنے والا جنرل اس منصوبے کو منظور نہ کرے اس وقت تک اس پر عمل درآمد نہ کیا جائے۔

اس وقت حیدر علی کے خلاف میسور کے محاذ پر سر آرکوٹ تمام فوجوں کا کمانڈر تھا۔ اس کی حیدر علی سے کئی جنگیں ہو چکی تھیں۔ ایک دفعہ اسے کامیابی بھی ہوئی تھی اور حیدر علی کو مہربا ہونا پڑا تھا، اس کے باوجود جب جنرل کوٹ کے یہ منصوبہ پیش کیا گیا تو اس نے اسے فوراً ہی منظور نہیں کیا بلکہ اس پر صرف غور کرنے کا وعدہ کر کے اپنے پاس رکھ دیا۔

رانی کے گماشتے ترمل راؤ کو اس منصوبے کی کامیابی کا اس قدر یقین تھا کہ کلکتہ جانے کے علاوہ وہ مدراس سے اس انگریز کپتان کے ساتھ جنرل آرکوٹ سے ملنے کے لیے میسور کے محاذ پر بھی گیا۔

پھر ایسا ہوا کہ جب وہ جنرل کوٹ سے مل کر مسلمانوں کے بھیس میں محاذ جنگ سے واپس آ رہا تھا تو اسے سرنگاپٹم کے ایک سوار نے شناخت کر لیا۔

"ترمل راؤ۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" سوار نے گھوڑے سے اتر کر اس کا کہنا کر پوچھا۔

ترمل راؤ ایک مسلمان کی زبان سے اپنا نام اس کے گھبرا گیا اور بڑھلاہٹ میں بولا:

"میں ترمل راؤ نہیں بلکہ تمہاری طرح ایک مسلمان ہوں۔"

سوار کا غصہ بڑھ گیا۔ اس نے کمر سے خنجر کھینچا اور ترمل راؤ کے سینہ پر رکھ دیا:

"اوکا فریجے۔ سچ بول، دے ورنہ یہ خنجر تیرے سینے کے پار کر دوں گا۔"

ترمل راؤ کا خون خشک ہو گیا:

"مجھے نہ مارو۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ وہ گھگھیا نے لگا۔

سوار نے خنجر پر زور دیا اور خنجر ترمل راؤ کے گرتے سے گزر کر سینے سے ٹکرایا:

"سچ بولنے کا یہ آخری موقع ہے" سوار فانت پیس کر بولا۔

"ہاں ہاں۔ میں ترمل راؤ ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے رانی مانانے لالچ دیا تھا میں بہک

گیا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔"

سوار کے لیے صرف اقبال جرم ہی کافی تھا:

"معافی یا موت کا حکم تو صرف نواب بہادر ہی دے سکتے ہیں۔"

ترمل راؤ کو گرفتار کر کے نواب بہادر کے پاس بھیج دیا گیا۔ نواب بہادر نے ترمل راؤ کو

قل اور راجہ کے قبضے میں جتنی غلات تھے، ان کے داروغوں کو معزول کر دیا۔ رانی مانا اور راجہ

نے معاف کوئی ثبوت نہ مل سکا اور ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔

اس سلسلے میں ہندو قوم کی احسان فراہم کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ حالانکہ حیدر علی نے

بندہ مذہب اور پیشواؤں کے علاوہ ان کی عبادت گاہوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا تھا۔

دائیں کو یہ پڑھ کر شاید تعجب ہو کہ حیدر علی نے میسور کے لنگا سیوا مندر کے درمیان قبہ کو

تعمیر کرایا تھا۔

اس کے علاوہ سرنگاپٹم کے سری رنگا مندر کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جسے حیدر علی

نے از سر نو تعمیر کرایا تھا۔

اس مندر کے متعلق سینک سوساٹی جنرل (اپریل ۱۹۳۹ء) اپنے صفحہ ۴۵۲ پر اس طرح

رقم طراز ہے:

"۴۴ء میں قدیم الدین خاں نامی ایک شخص کے مکان میں آگ

لگ گئی۔ یہ مکان مرہی رنگا مندر کے متصل واقع تھا۔ آگ اس قدر

شدید تھی کہ قدیم الدین خاں کا مکان اور سری رنگا تھ کا مندر دونوں ہی جل کر خاکستر ہو گئے۔

چنانچہ حیدر علی خاں نے چل قدیم الدین خاں کا مکان دوبارہ تعمیر کرا دیا وہاں اس نے اس مندر کو بھی دوبارہ تعمیر کیا۔

اور اس مندر کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ حیدر علی سے لے کر سلطان ٹیپو کی شہادت تک سلطنت خداداد ملبور کے خلاف مرہٹوں، نظام کوکن اور انگریزوں کے علاوہ ملیسور کے راجہ اور رانیوں نے جتنی سازشیں کیں۔ جتنے منصوبے بنائے۔ ان میں اس مندر کا کوئی نہ کوئی پنڈت یا پتھو افسر شامل رہا۔

”معاہدہ رانا“ کے بارے میں تاریخ لکھتی ہے :

”مدرس میں انگریزوں اور ہندوؤں کے درمیان جو معاہدہ (رانا) امہندوستان کے لیے تخت کی بازیابی کے لیے ہوا تھا، اس پر رانی کے گائے تیل راؤ اور کمپنی کے نمائندے جان سیلوان نے دستخط کیے تھے۔ یہ معاہدہ سرانٹوکٹ کے پاس بھی آیا تھا جس پر اس نے مناسب توجہ نہ دی۔ معاملہ وقتی طور پر دب گیا مگر چنگاری سلگتی رہی۔“

شہزادہ ٹیپو کو باپ کے انتقال کی خبر اور دسمبر کو مل گئی تھی اور وہ ۱۲ دسمبر کو چل چھڑا مگر وہ ارکاٹ کے قریب پہنچ کر مر گیا۔

وہ باپ کے انتقال کی خبر سے ریخ عالم میں مبتلا تھا اور جلد از خود خیمہ گاہ پہنچا چاہتا تھا مگر مصلحت اس کے قدم روک رہی تھی کیونکہ معاملہ اس کے بھائی کا تھا جو اس وقت تخت نشین ہو چکا تھا۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ حیدر علی کا انتقال ارکاٹ کے قریب قمری کے مقام پر ہوا تھا۔ پھر جب اس کی خبر سرنگا پٹم پہنچی تو وہاں اراکین سلطنت نے فوراً چھوٹے شہزادے کو مر صاحب کو تخت نشین کر دیا۔ یہ دونوں خبریں جب شہزادہ ٹیپو کو ملیں تو وہ مصلحتاً ارکاٹ کے قریب پہنچ کر

در اصل وہ مرحوم باپ کی خیمہ گاہ اور سرنگا پٹم کے دربار کا اپنے بارے میں ردِ عمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

مؤرخین نے اس سلسلے میں اس بات کا شبہ بھی ظاہر کیا ہے کہ شہزادہ ٹیپو کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ایسا نہ ہو وہ خیمہ گاہ پہنچے اور اس کا بھائی کریم، جو بادشاہ بن چکا تھا، سرنگا پٹم سے تباہی فوج لے کے اس کے مقابلہ پر آجائے۔

شہزادے کے خدشات ایک حد تک درست تھے۔ اس لیے کہ کریم صاحب کو تخت نشین کرنے میں میر صادق آگے آگے تھے یہ وہی حکمران تھا جسے حیدر علی نے افسر لیاٹ بنایا تو وہ مل کدبان نے فوراً اعتراض کیا تھا کہ :

”نواب بہادر۔ آپ سلطنت کے مالک و مختار ہیں۔ جس کو چاہیں بخش دیں اور نہ وہ باپیں ٹولی پر چڑھا دیں مگر میں یہ گستاخی کہ نے پر خود کو مجبور پاتا ہوں کہ آپ یہ ہم خواروں کو نظر انداز کر کے آپ نے والا جاہ کے سب سے زیادہ قریبی مسامحہ برساتی ہیں کو افسر مال بنایا ہے۔ قدیم وفادار خواہ زبان سے شکوہ نہ کریں مگر ان کے دلوں کو بھیس ضرور پہنچے گی۔“

نواب بہادر اپنے وفادار سردار کے اس بے باکانہ مگر ایک سچے اعتراض پر جو بے ضرر نہ تھے۔ انہوں نے دل میں سوچا جس ہو گا کہ واقعی انہوں نے پرانے وفاداروں کی حق تلفی کی ہے۔ بات تو راقبت ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً بات بنا دیا تھا کہ :

”میر علی کو بات نہیں۔ میں اپنے وفاداروں کو اس سے بہتر حد سے دوں گا۔ اس میں بہت سادہ کو افسر لیاٹ بنا چکا ہوں اسے بغیر کسی وجہ کے معزول کر دیا ہے۔ یہ سب سید بہانہ ہی تھا۔ اگر اس کی طرف سے ذرا بھی دیانتی ہوتی تو اسے نہ صرف معزول کیا جائے گا بلکہ ایسوا لے گی کہ اس کے مرتزکوں کو آجائیں گے۔“

مگر

اس کا وقت ہی نہ آ سکا اور نواب بہادر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب ان کی جانشینی کا مسئلہ اٹھ اٹھا۔

یہ سوچتے ہی وہ روانہ ہوئے۔
 "مردار! اگر ایسی غلطی تو مجھ پر نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ حالات دوسرا
 رخ اختیار کر لیں گے۔"

اس کا بہترین حل یہ ہے کہ آپ میرا سر قلم کر کے شہزادہ پیو کے حضور روانہ کر دیجیے۔
 اور ان کو مطلع کیجیے کہ وہ بد بخت انسان اب اس دنیا میں نہیں رہا جس نے ملک و ملت کے
 مفاد کی خاطر ایک غلط منصوبہ پیش کیا تھا۔
 اور اس کے ساتھ ہی اس حکمران کو انکھوں سے جھکا ہم آنسو بہنے لگے۔ میرزا خاں نے آگے
 بڑھ کر اسے تسلی دی:

"تم فکر نہ کرو! خبر دیا بات یہ غلطی تو ہم سب سے ہوئی ہے اور ہم سب مل کر اس کا تدارک
 کریں گے۔ تم نے تو جلد ہی سوچ کے یہ مشورہ دیا تھا۔ اب ہماری قسمت کہ اس کا اثر اٹھا ہوا۔"
 محمد علی کیدان پر میر صادق کے رونے دھونے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے میرزا خاں کو
 مخاطب کیا اور کہا:

"میرزا خاں بہتر ہے کہ ہم اسی سلسلے میں شہزادہ پیو سے گفتگو کر کے فوراً کسی نتیجے
 پر پہنچیں۔"

میرزا خاں نے تائید کی:

"میں آپ کے ساتھ ہوں مردار۔ چلیے شہزادے کے پاس چلتے ہیں۔ یہ مسئلہ فوراً حل
 ہونا چاہیے۔"

میر صادق نے ایک قدم آگے بڑھا کہ محمد علی کیدان کی چال پوکی کی:

"آپ نے بالکل صحیح فیصلہ کیا سردار۔ ہم سب کو فوراً شہزادہ بہادر کے پاس
 چلنا چاہیے۔"

"وہاں تم نہیں جاؤ گے میر صادق علی۔ کیدان نے ترش لہجے میں کہا۔

میر صادق کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا مگر اس نے خوشامد کا دوسرا پیر چلایا:

"دیکھیے نامہ سردار۔ بات پہلے میں نے شروع کی تھی۔ میں شہزادے سے معافی طلب نہیں
 کروں گا تو سارا الزام میرے سر آ جائے گا۔"

محمد علی کیدان کی آواز میں کچھ زیادہ تلخی کھل گئی اور لہجہ تند ہو گیا:

سب سرنگاٹم کے امرا کو معلوم ہوا کہ شہزادہ پیو ارکاٹ کے قریب ٹھہر گیا ہے اور وہ
 نواب مرہٹوں کی خیمہ گاہ تک جانے میں پس و پیش کر رہا ہے تو وہ بہت فکر مند ہوئے۔
 محمد علی کیدان نے اس وقت بھی سب سے پہلے زبان کھولی:

"کیوں میرزا خاں۔ ہم نے کریم صاحب کو تخت نشین کر کے غلطی تو نہیں کی؟"
 میرزا خاں سب سے زیادہ پریشان تھا کیونکہ میر صادق کے اس منصوبے کی اس نے
 سب سے پہلے تائید کی تھی کہ کریم صاحب کو وقتی طور پر تخت نشین کر دیا جائے تاکہ دشمنوں کو
 سازشیں کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

"مردار بھترم!"

میرزا خاں نے اپنی صفائی پیش کی:

"اس وقت میں نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ دشمنوں کی مخالفت سے بچنے کے لیے میں فوراً
 شہزادہ پیو کے مفاد کو تخت نشین کر دینا چاہیے اس لیے میں نے اذنیالیت میر صادق کے اس
 منصوبہ کی تائید کی تھی۔ بخدا میرے دل میں اس کے سوا اور کوئی ارادہ ہرگز نہ تھا۔"
 "میرزا خاں۔ اس کا یہ مطلب یہ ہے کہ میں آپ پر شبہ کر رہا ہوں۔ جو غلطی ہو نا تھی وہ تو
 ہو گئی۔" محمد علی کیدان نے کہا:

"مجھے بتایا گیا ہے کہ شہزادہ بہادر نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ جب تک مرنگاٹم کی
 فضا صاف نہیں ہو جاتی اس وقت تک نہ تو وہ ارکاٹ کی خیمہ گاہ میں داخل ہوں گے اور نہ ہی
 مرنگاٹم آئیں گے۔"

محمد علی کیدان بڑا احاف گو بلکہ منہ چھٹ مردار تھا۔ سچ بولنے کے معاملے میں وہ حیدر علی خاں
 کی بھی پروا نہ کرتا تھا۔

اس کے جاسوس نے اسے بتایا تھا کہ شہزادہ پیو کو مرنگاٹم کے امرا کی میتوں پر شبہ ہے
 اس لیے اس نے اپنے قدم روک لیے ہیں۔

اس گفتگو کے وقت وہاں دوسرے مرداروں کے ساتھ وزیر مال میر صادق بھی موجود تھا۔
 وہ محمد علی کیدان اور میرزا خاں کی گفتگو سے اس نتیجے پر پہنچا کہ انہیں کریم صاحب کی تخت نشینی
 سخت ناگوار گزری ہے اور ممکن ہے کہ وہ اسے معزول کر کے اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش
 کریں۔ اس صورت میں کریم صاحب کی تخت نشینی کی پوری ذمہ داری اس پر عاید ہو جائیگی۔

”معافی تو ہم سب کو مانگتا ہے۔“

پھر اس نے میر صادق کی طرف سے منہ پھیر کر میرزا خاں سے کہا:

”صرف آپ شہزادے کے پاس جائیں گے اور ہم سب کی طرف سے عرض کریں گے کہ شہزادے کے سرنگا پیٹ نہ آنے کی وجہ سے ہم تمام سردار متحوم، دردل شکستہ ہو رہے ہیں۔ ہم نے شہزادہ کو ہم صاحب کو تخت نشین کر کے جو اضطراری غلطی کی ہے ہم اس کی تحریری معافی مانگتے ہیں۔ خدا کے لیے کسی شنبہ کو دل میں جگہ نہ دیجیئے۔“

”ٹھیک ہے سردار مگر وہ تحریری معافی نامہ۔“

محمد علی کیدان نے میرزا خاں کو بات پوری نہ کہنے دی اور بولا:

”آپ تمام لوگ اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیجیے کہ ہم نے شہزادہ کو ہم صاحب کو تخت نشین کرنے کی غلطی کی ہے۔ اس کے لیے ہم دست بستہ معذرت خواہ ہیں۔ یہ تمام معافی نامے میرزا خاں اپنے ساتھ لے جائیں گے اور شہزادے کے حضور پیش کریں گے۔“

مجلس میں موجود تمام سرداروں نے اپنے معافی نامے لکھ کر میرزا خاں کے حوالے کر دیے۔ میرزا خاں نے ایک لمحہ کی دیر نہ کی اور معافی نامے سمیٹتے ہی وہ ارکات کے لیے سوار ہو گیا۔



شہزادہ کیسیو گزشتہ تہا کرات نہ سو سکا تھا۔ کبھی خیمہ کے اندر اور کبھی خیمہ کے باہر ٹل ٹل کر اس نے سویرا کیا تھا۔

یوں تو پچھلی سچی راتیں اس نے بے چینی سے کاٹی تھیں لیکن یہ رات اس کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن تھی۔ اس کو بار بار یہی خیال سناتا تھا کہ خدا معلوم وہ کون لوگ تھے جنہوں نے مجھے نظر انداز کر کے میسر کا تخت شہزادہ کو ہم کو پیش کر دیا۔

شہزادہ بہادر۔ میرزا خاں کے شریف لائے ہیں اور اذن قدم کے

ایک پہرے دار تہہ خیمہ میں داخل ہو کر شہزادے کے پاس پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ شہزادے کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے خود پر قابو رکھا:

”نہایت برا خان کہ آنے دیا چلے۔“

میرزا خاں نے داخل ہو کر شہزادے کو سلام پیش کیا پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ شہزادے نے انتہائی مہربانی سے میرزا خاں کو کچھ کہہ کر گامگاہ وہ خاموش رہا۔ تب شہزادہ کیسیو نے خود کو

میرزا خاں! ہمارا میرزا خاں کسے نام سے زیادہ مشہور تھا۔

اُسے سلطنت میسور کے چکے دکنے ستارے۔ آ اور میرے گلے سے لگ جا۔
میرزا خاں نے بھی کمال مسرت سے بازو داکر دیے اور شہزادے کو اپنے بازوؤں میں گھسیٹ
لیا۔ وہ اس وقت بہت خوش تھا اور اس خوشی کا اظہار اس کے ہتے ہوئے آنسوؤں سے بخوبی
دور ہوا تھا۔

میرزا خاں سے بخل گیر ہونے کے بعد شہزادے نے سرداروں کے معافی ناموں پر ایک
مرمری نظر ڈالی۔ دوسرے سرداروں کے علاوہ ان معافی ناموں میں افسر مالیات میر صادق علی کا
معافی نامہ بھی شامل تھا۔

شہزادے اور میرزا خاں نے اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں حیدر علی خاں کو مارضی طور پر دفن کیا
گیا تھا۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر شہزادے نے مسرت سے کہا:
”مہا میرزا خاں میرا دل اپنے امرا کی طرف سے صاف ہو گیا ہے۔ اب مجھے سرنگا پٹم جانے
میں کوئی تکلف نہیں۔“

”تو پھر کوچ کا حکم فرمائیے شہزادہ بہادر۔“

میرزا خاں نے مسرت کر کے کہا:

”سرنگا پٹم کا تخت و تاج اور بچہ بچہ آپ کا منتظر ہے۔“

شہزادے نے اسی وقت کوچ کا حکم دے دیا۔

میرزا خاں نے روانگی سے پہلے دو تیز رفتار سوار سرنگا پٹم اس اطلاع اور حکم کے ساتھ روانہ
کیے کہ دھڑ تاج و تخت اپنے تاج و تخت کی طرف آ رہا ہے۔ خاص دعا استقبال کے لیے
تیار رہیں۔

سرنگا پٹم میں شہزادے کی آمد کی خبر پہنچتے ہی عوام و خواص نے استقبال کی تیاریاں شروع
کر دیں۔ امرا اور وزراء نے اگلے گئے کہ وہ سرنگا پٹم کی سرحد پر شہزادے کو خوش آمدید
کہیں گے۔

شہزادہ ٹپو جلد از جلد سرنگا پٹم پہنچنا چاہتا تھا لیکن اس کی آمد کی خبر ہر طرف پھیل گئی تھی
اس لیے سرنگا پٹم جانے والے راستے پر عوام دور و بہ دور بازار بنا کر کھڑے ہوئے تھے۔

میرزا خاں خوش آمدید۔ کو کیسے آنا ہوا؟“

میرزا خاں نے جواب دیا:

”شہزادہ بہادر میں اور امرا نے جو اس وقت سرنگا پٹم میں جمع ہیں، ایک اضطراری
اور سیاسی غلطی کی ہے، اس کی معافی مانگنے حاضر ہوا ہوں۔“
شہزادے کے چہرے پر مسرت دوڑ گئی:

”اس غلطی کی کوئی وجہ کوئی جواز تو ضرور ہوگا۔ شہزادے نے اپنا غلطیت کے لیے
سوال کیا۔“

”شہزادہ عالی مقام۔“

میرزا خاں نے سبیل کے کہنا شروع کیا:

”سرنگا پٹم کے امرا کو یہ پریشانی لاحق ہے کہ نواب والا تبار کے انتقال پر ملال کی خبر
چاروں طرف پھیل چکی ہے۔ شہزادہ عالی مقام کو بھی مطلع کیا جا چکا تھا مگر آپ کی آمد میں تاخیر
نے سرداران فوج اور امرا کو بدحواس کر دیا کہ سلطنت کے بدخواہ کہیں یہ سمجھ گئے کہ میسور کے
تخت و تاج کے لیے اندرون خانہ اختلاف پیدا ہو گئے ہیں، سرنگا پٹم پر حملہ آور نہ ہو جائیں
پس امرا اور سرداروں نے یہ بہتر خیال کیا کہ شہزادہ کریم کو مصلحتاً وقتی طور پر تخت نشین کر
دیا جائے اور آپ کے سرنگا پٹم پہنچنے پر شہزادہ کریم تخت سے دست بردار ہو جائیں۔“

شہزادہ ٹپو کچھ دیر سوچتا رہا پھر ایک لمبی سانس لے کر بولا:

”دوسرے سرداروں نے کیا فیصلہ کیا ہے اس سلسلے میں؟“

”سب امرا وزیر اور سرداران افواج بیک زبان معافی کے طلبگار ہیں شہزادہ بہادر۔“

میرے پاس اس کا دستاویزی ثبوت بھی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے میرزا خاں نے بخل میں دبا ہوا ایک پلندہ شہزادے کی طرف بڑھا دیا اور

عطا ہی کہا:

”یہ وہ معافی نامے ہیں جو امرا، وزرا اور دیگر عمائدین سلطنت نے الگ الگ اپنے قلم“

تحریر کیے ہیں، آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔“

شہزادے نے پلندہ ایک طرف رکھ دیا پھر میرزا خاں کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ یہ

ہاتھ باندھے آگے بڑھا۔ شہزادے نے اپنے بازو پھیلادے:

شہزادے کو مجبوراً اپنی رفتار کم کرنا پڑی۔ اسے جگہ جگہ ہاتھ ہلا کے ان کے پرجوش نعروں کا جواب دینا پڑتا تھا۔

شہزادے کے لیے آنکھیں تو فرشِ راہ تھیں لیکن عوام نے اس پر پھولوں کی اس قدر بارش کی کہ راستے پر پھولوں کا ایک فرش بچھ گیا۔

مرزا کا پٹم کی سرحد پر تمام امرا اور ورور نے شہزادے کا پرجوش استقبال کیا۔ شہزادہ گھوڑے پر سوار تھا اس لیے استقبال کو آنے والے تمام لوگ شہزادے کے احترام میں پیادہ ہو گئے۔

استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے شہزادہ کریم تھا جس کی حیثیت اس وقت ایک میسور کے سلطان کی تھی۔

دقیقی سلطان یعنی شہزادہ کریم پیادہ، پرجوہ قدم اٹھاتا اپنی جگہ سے شہزادے کے مرکب تک پہنچا اور بڑے خلوص سے شہزادے کی رکاب کو بوسہ دیا۔

"میں شہزادہ عالی مقام کی مرزا کا پٹم آمد برتہ دل سے مبارکیا د پیش کرتا ہوں اور اپنی اس وقتی مصلطانی کے اعزاز کو جو مجھے مصلحتاً بخشا گیا تھا، سے خود کو سبکدوش کر کے شہزادہ بہادر کے سامنے مرتب تسلیم کرتا ہوں۔"

شہزادہ کریم کی آواز میں محبت اور خلوص کا ایسا درد بھر اٹھا کہ شہزادہ پٹم بے چین ہو گیا۔ وہ فوراً گھوڑے سے اترا اور بھائی کو سینے سے لگایا۔

لوگوں نے دیکھا کہ دونوں بھائی گلے گلے ہوئے تھے اور ان دونوں کی آنکھیں اشکبار ہو گئی تھیں۔

امرا اور وزرا نے شہزادہ پٹم سے درخواست کی کہ انہیں عظمتِ خداداد میسور (بعض تاریخوں میں مرکار خداداد میسور ہے) کے شاہانِ شان تاجپوشی اور جشن تاجپوشی کی اجازت دی جائے تاکہ سرزا کا پٹم میں ویسا ہی جشن منایا جاسکے جیسا کہ دہلی کے شہنشاہوں کی تاجپوشی کے مواقع پر اہتمام کیا جاتا ہے مگر شہزادہ پٹم نے اس کی اجازت نہ دی۔

شہزادے کا جلوس مرزا کا پٹم میں ڈوبتے سورج کے وقت پہنچا تھا اس لیے طے پایا کہ دم تاجپوشی دوسرے دن صبح کو ادا کی جائے۔

اس رات شہزادے نے مخصوص امرا کو کھانے کی دعوت دی۔ اس دعوت میں محمد علی کیدان

ہما میرزا خاں خصوصیت سے مدعو کیے گئے تھے۔

شہزادے نے کھانے کے دوران اچانک میرزا خاں سے سوال کیا:

"میرزا خاں۔ میں محسوس ہوا ہے کہ ہمارے استقبال کے لیے آنے والوں میں بعض امرا اور برشریک نہیں ہوئے کیا اس کی وضاحت ہو سکتی ہے؟"

میرزا خاں کے ہاتھ میں نوالہ تھا۔ اس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک کر رہ گیا۔ وہ جواب سوچ رہا تھا۔

"شہزادہ بہادر۔ اس کا جواب میں عرض کرتا ہوں۔"

شہزادے نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

"شہزادہ بہادر!"

محمد علی کیدان نے منجھل کے کہنا شروع کیا:

"ذرا صبر صاوق علی کے اطوار و عادت شروع ہی سے خراب ہیں۔ یہ شخص والا جاہ محمد علی کا ہوا تھا صاحب تھا اور اس کے لیے شراب و کباب کی محفلیں آراستہ کرتا تھا۔ مرزا کا پٹم میں آئے کے بعد اس کے اطوار درست ہونے کے بجائے اور بگڑ گئے۔"

شہزادے نے ہاتھ کے اشارے سے محمد علی کیدان کو روک دیا:

"بزرگ سردار۔ آپ ایک عظیم فوجی سالار ہیں اس لیے آپ کو میدانِ جنگ اور جنگی عملیات پر زیادہ زور دینا چاہیے۔ اگر کسی امیر کے اطوار بگڑے ہوئے ہیں تو اس کی

مدداری کو نوالہ شہزادہ اور قاضی شہر پر عاید ہوتی ہے۔ آپ اپنے سران ذمے داریوں کو کیوں ادا چاہتے ہیں؟"

محمد علی کیدان نے شہزادے کا احترام تو بقرار رکھا مگر جواب دیتے وقت اس کے لیے

بہت بڑی ہی ناہنجی پیدا ہو گئی۔

شہزادہ بہادر۔ میر صاوق پر شبہ ہے کہ اس نے شہزادہ کریم کو سلطان بنانے کا جو منصوبہ کیا تھا اس میں وہ مخلص نہیں بلکہ بددیانت تھا۔ اسی شبہ پر میں نے اسے اس کی جوبلی

بند کر دیا ہے۔

"بزرگ سردار۔ یہ آپ نے کیا کیا؟"

شہزادے کی آواز ایک دم تیز ہو گئی: "کیا آپ کے پاس میر صاوق کی بددیانتی کا کوئی

ثبوت ہے۔ اگر ہے تو پیش کیجیے۔

”شہزادہ بہادر۔ ثبوت بہت جلد ملنا ہو جائے گا۔ محمد علی کیدان نے شہزادے کی ناراضگی کی پروا نہ کرتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا:

”میر صادق پر یہ بھی شبہ ہے کہ اس نے آپ کی سرنگاہ میں اندر پر بھی آپ کو نقصان پہنچانے کا منصوبہ بنایا تھا مگر میں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ان کے گھر میں قید کر دیا ہے تاکہ وہ کوئی ہنگامہ نہ برپا کر سکیں۔

”یہ تو تم نے اور بھی ظلم کیا محرم مردار۔

شہزادے کو سخت غصہ آ گیا:

”آپ جانتے ہیں کہ بابا مرحوم نے ارکاٹ پر قبضہ کے بعد میر صادق کو میسور کا افسر مال مقرر کیا تھا۔ کیا اس کے خلاف غبن بابت دیانتی کا کوئی مقدمہ پیش ہوا؟“

”مقدمہ تو پیش نہیں ہوا لیکن۔“

محمد علی کیدان نے جواب دینے کی کوشش کی مگر شہزادے نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی:

”پھر میر صادق کو کیوں نظر بند کیا گیا؟“

شہزادے کے لیے میں شاید غصہ پیدا ہو گئی تھی۔

محمد علی کیدان نے کوئی جواب نہ دیا اس لیے کہ اس کے پاس کوئی تحریری ثبوت یا شہادت موجود نہ تھی۔

شہزادے نے میرزا خاں کو حکم دیا:

”میرزا خاں۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ میر صادق اور دوسرے تمام لوگ جو ہمارے خلاف بغاوت اور فتنہ و فساد پیدا کرنے کے شبہ میں گرفتار ہوئے ہیں انہیں فوراً رہا کیا جائے۔ ہم انہیں کل کی رسم تاج پوشی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ مرحوم بابا حضور نے امرا کو جن عہدوں پر مقرر کیا تھا وہ اسی طرح برقرار رہیں گے۔

دوسری بات یہ کہ آج سے کسی شخص کو عفوِ مشبہ کی بنا پر گرفتار نہیں کیا جائے گا جب تک ٹھوس ثبوت موجود نہ ہو۔“

تمام نظر بندوں کو رات ہی میں رہائی مل گئی اور دوسرے دن وہ رسم تاج پوشی میں شریک

تھے۔ رسم تاج پوشی کے لیے نہ دربارِ سلطانی کو کروڑوں سے سجاایا گیا اور نہ شہر میں آرائشی محرابیں لگائی گئیں۔ اس لیے کہ شہزادہ بیو ایک سادہ طبیعت انسان تھے اور انہیں تخت نشینی کے رسمی لوازمات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

رسم تاج پوشی بڑی سادگی سے ادا کی گئی۔

ایک شنبہ (پیر) ۲۰ محرم الحرام ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۳ء شہزادہ بیو نے تاج بٹائی

زیب سر کیا اور ”سلطان“ کا لقب اختیار کیا۔ واضح رہے کہ ”سلطان“ کا لفظ اس کے ناکا کا ایک حصہ بھی تھا۔

ارکانِ دولت کو لباسِ فاخرہ عطا ہوا۔ سلطان نے اپنے جانشینوں اور سرداروں کو پیش قیمت انعامات دیے۔ تمام قلعہ داروں، اموالداروں، ناظموں، گورنروں اور دیگر عمالِ دولت کو رقعے، خط اور فرمان اس موضوع کے روانہ کیے گئے کہ جو شخص مرحوم نواب بہادر کے حکم سے جس عہدے پر مقرر ہوا تھا وہ اس پر قائم رہے گا۔

سرکاری طور پر جن کا کوئی اہتمام نہ کیا گیا مگر عوام کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے طور پر خوشی منا اور جشن کر سکتے ہیں۔

رسم تاج پوشی کے اختتام پر سلطان نے دربار میں ایک دولہ انگیز تقریر کی جس کی خاص خاص باتیں درج ذیل تھیں:

۱۔ میں ایک معمولی انسان ہوں۔

۲۔ یہ زندگی ناقابلِ اعتبار ہے۔

۳۔ حکومت اور وجاہت مٹ جانے والی چیز ہے۔

۴۔ میں جب تک زندہ رہوں گا وطن اور وطن والوں کے لیے جہد و جہد کروں گا۔

۵۔ مجھے ظاہری شان و شوکت سے مرعوب کیا جا رہا ہے۔

۶۔ مجھے نہ مظاہرے ڈرا سکتے ہیں نہ دھمکیاں پیچھے ہٹا سکتی ہیں اور نہ قہر و جلال کے مناظر سے میرے ارادے متزلزل ہو سکتے ہیں۔

۷۔ اگر برقِ ستم مجھے ہلاک کر دے تو اس وقت بھی میری زبان پر یہ الفاظ ہوں گے:

اے زندہ رہنے والو!
آگے بڑھو۔ خدائے قدوس تمہاری کوشش میں برکت دے اور
تم اپنی منزل کو پہنچو۔

۸۔ آزادی وطن کے لیے ہزاروں انسان موت کے گھاٹ اتر سکتے ہیں لیکن جیت و ظفر
کے جذبات کبھی نہیں مٹ سکتے۔

ایک تاریخ کے مطابق سلطان شیو شہید نے اپنی پہلی تقریر میں مادر وطن کو غائب کر کے
یہ الفاظ ادا کیے تھے:

"اے میرے پیارے وطن!
میری محبت اور میرا دل تیرے لیے ہے۔ میری حیات اور میرا وجود
تیرے لیے ہے۔ میرا خون اور میری جان تیرے لیے ہے۔"

جشنِ ناجوشی کے اختتام سے پہلے امرا اور وزرا میں عہدوں کی تقسیم ہوئی۔ کچھ کے عہدے
تبدیل ہوئے اور کچھ کو ترقی دی گئی۔
میر صادق جو پہلے افریال تھا اسے ترقی دے کر سلطان شیو نے وزیرِ اعظم (دیوان) کا عہدہ
عطا کیا جو سلطنت کا سب سے اہم عہدہ تھا۔
میر صادق کے ساتھ پورنا کو وزیرِ مالیات بنا دیا گیا۔

سلطان شیو نے جنوبی ہند کی سب سے بڑی سلطنت یعنی "سلطنتِ خداداد میسور" کی باگ ڈور
ایک ایسے وقت میں سنبھالی تھی جب ہر طرف فرنگی کافروں کا دور دورہ تھا۔ عیسائی مشنریاں
جگہ جگہ کام کر رہی تھیں۔ ہندو راج کے منہ بولے بنانے والے اپنا میں اکٹھا ہو رہے تھے اور
دربارِ دہلی کی سطوت قلعہ دہلی میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ گلستانِ اسلام میں جھاڑ جھنکار اُگ
آئے تھے۔

ان حالات میں ایک ایسے سچے مسلمان کی ضرورت تھی جس کی دُور رس نظریں مستقبل کی

تحریر پڑھ سکے۔ بدعت اور کفر کے اٹھتے ہوئے فتنہ کا سر کچلنے کے لیے سرے کفن باندھ کے
میدانِ کارزار میں نکلے اور اپنی زندگی اسلام کے احیا اور بقا کے لیے وقف کر دے۔
ایسے پُر آشوب دور میں سلطان شیو جیسا صاحبِ یقین شخص اتنی اسلام پر آفتاب بن
کر ابھرا۔ اس کی آمد گلستانِ وطن میں بادِ بہاری لے کر آئی۔ اس نے اسلام کے دشمنوں کا منہ
پھیر کر رکھ دیا۔

مگر۔

اس کو کیا گنا جانے کہ کچھ اہل وطن نے اپنے مفاد کی خاطر قبائے وطن کو تار تار کرنے کی
قسم کھا رکھی تھی۔

سلطان قدم قدم پر آگے ہوئے اس خار و خشاک کو اکھاڑ تار مارا۔ وہ آگے بڑھتا رہا اور
غدارانِ ملت اس کا دامن کیسے پھینچتے رہے اور یہ سلسلہ ایک زمانے تک یوں ہی چلتا رہا۔

حیدر علی خاں کے انتقال کے وقت انگریزوں سے جنگ ختم نہ ہوئی تھی۔ جنرل اسٹوارٹ اور
جنرل لینک (لائنک) کے زیرِ کمان انگریزی فوج وائڈی واشس میں ڈیرے ڈالے پڑی
تھی۔ سلطان شیو ایک لشکر لے کر مرہا اور علور کے راستے آگے بڑھا اور وائڈی واشس
سے پانچ میل دور انگریزوں کے سامنے خیمہ زن ہوا۔
سلطان نے رات میں فوجوں کی ترتیب کا نقشہ تیار کیا۔ کچھ دنے مختلف مقامات پر رات
ہی میں تعینات کر دیے گئے مگر صبح کو جب نکل کھلا۔

انگریزی فوج جو بڑے طعناق سے سامنے جی ہوئی تھی، صبح ہوتے ہی اپنا بوریا بستر اپنیٹ
میدان سے روانہ ہو گئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ گورنر مدراس نے اس لشکر کو فوراً مدراس واپس آنے کا حکم
دیا تھا۔
سلطان بھی اپنے لشکر کو لے کر نزد توڑ کی طرف بڑھا اور دامنِ سپنج کے ڈیرے
ڈال دیے۔

نواب حیدر علی خاں مرحوم کے زمانے میں لوگوں کو کڑ بڑ کرنے یا بغاوت کی جرأت کم ہوتی

نئی مگر ان کے دنیائے اٹھتے ہی مفندہ پردازوں نے پھر سراٹھایا۔ ان کا خیال تھا جو ان سلطان میں حیدر علی جیسی خوبیاں نہ ہوں گی اور وہ اچھی طرح فوجوں کی کمان نہ کر سکے گا۔ چنانچہ بغاوتیں اور سازشیں جگہ جگہ ٹوٹ پڑیں۔

سلطان پٹوہ بھی یہیں خیمہ زن تھا کہ اسے بیک وقت ہار بغاوتوں اور سازشوں کی اطلاع ملی :

ایک سازش حیدرنگر میں ہوئی۔ حیدرنگر وہی جگہ ہے جسے مرحوم حیدر علی خاں نے ایک معمولی قصبہ سے ایک خوبصورت شہر میں تبدیل کر دیا تھا۔ انہوں نے یہاں بہت سی عمارتیں بنوائیں اور دفاتر قائم کر کے اسے دوسرا دارالسلطنت بنایا۔

حیدرنگر، جو نگر کے نام سے زیادہ مشہور تھا، کا گورنر یا زخاں تھا۔ اسی ہندو سچے کو حیدر علی خاں نے پال پوس کے جوان کیا تھا اور اپنا لے پا کر بنایا تھا مگر اس احسان فراموش نے ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی انگریزوں سے سازش کی اور کوڑیاں اور حیدرنگر کا سودا کر کے یہ دونوں شہر انگریزوں کے حوالے کر دیے۔

دوسری سازش کی اطلاع دارالسلطنت مرنگا پٹم سے موصول ہوئی۔ وہاں اپنے شائیلے تلعدار سے مل کر سازش کا ڈول ڈالہ اور دونوں میں یہ طے ہوا کہ علات شاہی پر قبضہ کر کے حرم سلطانی کو قید کر لیا جائے۔

نیسری خبر کڑ پٹ سے عبدالحلیم خاں کے بھائی کی بغاوت اور خود مختاری کے اعلان کی آئی۔ اس نے جھلی بندر میں انگریزوں سے معاہدہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔

چونچلی اور آخری جرن کاناہ میں بغاوت کی تھی۔ وہاں بابا بنو نے سرکشی پر مکر باندھی تھی۔ سلطان پٹوہ نے تمام معاملات پر ایک ساتھ توجہ دی۔ امدان کے لیے ایک ہی وقت میں احکامات صادر کیے۔

سلطان نے بدر الزمان ناٹھ، صلابت خاں بخشی، میر غلام علی اور میر معین الدین خاں کو انگریزوں سے بیٹھے کے لیے پائیں گھاٹ میں بھجوا اور خود حیدرنگر کی طرف چلا۔ چنگی گھاٹ پہنچ کے سلطان نے محمد علی کیدان کو اپنے شائیلے کی سرکوبی کے لیے مرنگا پٹم کی طرف بھیجا۔

خیال رہے کہ یہ وہی اپنے شائیلے سے جو پہلے والا جاہ محمد علی دلی ارکاٹ کے درباریوں میں

شامل تھا۔ والا جاہ کے زوال پر یہ میر صادق وغیرہ کے ساتھ مرحوم نواب حیدر علی خاں کی خدمت میں حاضر ہو گیا تھا۔

کڑ پٹہ کی طرف قمر الدین کو بھیجا گیا۔ وہاں عبدالحلیم خاں کے بھائی نے انگریزوں سے معاہدہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔

ان سب کی روانگی کے بعد خود سلطان وپونہ کی مدد گری اور سدا کے راستے چتلا رگ کے نواح میں پہنچ گیا۔

ان چاروں بغاوتوں اور سازشوں کے قتل و خون اور غارت گری کے دوران ایک دلچسپ اور پراسرار داستان نے بھی جنم لیا۔

یہ پراسرار داستان کیفیت میسور کے دارالسلطنت مرنگا پٹم میں پیدا ہوئی جو شروع دن ہی سے سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

نواب بہادر حیدر علی مرحوم کے عہد حکومت میں ہی یہاں کئی سازشیں جنم لے کر اپنی موت آپ مر چکی تھیں اور اب سلطان پٹوہ کے خلاف ہو ایک زبردست سازش کا آغاز ہوا تھا جس کی اطلاع سلطان کو مل چکی تھی اور اس سازش کو کچلنے کے لیے سردار محمد علی کیدان کو مرنگا پٹم جانے کا حکم دیا گیا تھا۔

دارالسلطنت، مرنگا پٹم میں ہونے والی ہر سازش میں راج محل کی رانیاں، خود راجہ رنکناٹھ اور دوسرے مندروں کے پتہ دہندہ بالواسطہ شریک ہوتے تھے۔ اس سازش میں بھی یہ سب لوگ شریک تھے مگر نام صرف شاہی علات کے قلعہ دار اپنے شائیلے کا سامنے آیا تھا۔

ممکن تھا کہ یہ سازش کامیاب ہو جاتی اور پھر یہ نہیں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلتا مگر وہ جو مشہور ہے کہ گولیوں کی سگناٹ اور گولیوں کی گھن گرج میں بھی عشق جنوں پیشہ کار فرمائیاں جاری رہتی ہیں، ایسی ہی کچھ صورت حال یہاں ہو پیش آئی۔

کہتے ہیں کہ نگوام کی ایک کینز قلعہ دار مرنگا پٹم کے محل میں تھی۔ یہ کینز حسن صورت اور حسن سیرت کی خوب نہیں رکھتی تھی۔

نگو کی ذات اور مذہب کا کوئی پتہ نہ تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ راج محل میں کیسے

زور پور لوندی کی طرح اپنے دوست احباب کو پیش کرنا شروع کر دیا۔
 نگو کو تو اب ساری دنیا سے نفرت ہو گئی اور وہ اپنی زندگی ختم کرنے کی فکر میں لگ گئی
 اسی دوران ایک شب نگو نے قلعہ دار اور اپنے شامیا کی گھٹنگو کے دو ایک کالے سنے تو
 اس کے رد گئے کھڑے ہو گئے۔

ایچے شامیا اور قلعہ دار شراب پینے میں ایسے دھت تھے کہ انہیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ ایک
 کینیز پر دے کے پیچھے کھڑی ان کی باتوں کو غور سے سن رہی ہے۔

بات یہ تھی کہ ایچے شامیا اور قلعہ دار نے یہ منصوبہ بنایا کہ شاہی حرم کی تمام خواتین کو
 گرفتار کر کے قید کر دیا جائے اور قلعہ میں سلطان ٹیپو کے جس قدر ہمدرد اور طرفدار ہیں، ان
 سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

یہ کام کرنے کے بعد سلطان ٹیپو کو اطلاع دی جائے کہ فاطمہ بیگم سخت بیمار ہیں۔ ظاہر ہے
 کہ سلطان والدہ کو دیکھنے کے لیے محاذ چھوڑ کر واپس آئے گا۔ پھر جیسے ہی سلطان قلعے میں داخل ہو
 قلعہ دار کے وفادار فوجی اس پر حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیں۔

یہ باتیں سن کے نگو اپنا دکھ درد بھول گئی اور فاطمہ بیگم اور سلطان ٹیپو کو بچانے کی فکر میں
 لگ گئی۔

چنانچہ اسی رات جب قلعہ دار اور ایچے شامیا شراب پی کے ایسے مدموش ہوئے کہ انہیں
 تین بدن کا ہوش نہ رہا تو نگو چپکے سے قلعہ دار کی حویلی سے نکلی اور سیدھا فاطمہ بیگم کے محل
 پر پہنچی۔

نگو کو قلعہ دار کی حویلی اور فاطمہ بیگم کے محل کی تمام کینیزیں اور غلام جانتے تھے اس لیے اس
 کی کوئی رک ٹوک نہ ہوئی۔ صرف اس وقت بات ذرا کچھ بگڑتی ہوئی معلوم ہوئی جب نگو نے
 فاطمہ بیگم کی کینیز خاص سے فاطمہ بیگم کو بیدار کرنے کو کہا۔

کینیز خاص فاطمہ بیگم کو جگاتے ہوئے ہچکچاہتی تھی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ جس جگہ آج وہ
 کام کر رہی ہے اس جگہ نگو بھی کام کرتی رہی ہے اور فاطمہ بیگم اس کا بہت خیال رکھتی تھیں مگر
 سوال ان کو جگانے کا تھا جبکہ اس وقت شب نصف سے زیادہ گزر رہی تھی۔

”دیکھو نگو۔ میں تمہارے مقام اور مرتبہ کو جاننا ہوں۔“ کینیز خاص نے معذرتانہ انداز میں کہا:
 ”مگر بغیر کسی خاص سبب کے میں مادر ملکہ کو کس طرح بیدار کر سکتی ہوں۔ تم بھی اگر میری جگہ

پہنچی۔ بہر حال اس بات کا تو ثبوت موجود ہے کہ نگو نے ایک سال کے قریب راج محل میں گزارا تھا
 اور اپنے صحن سیرت اور صحن صورت کے طفیل تمام رانیوں، راج ماتا اور راج محلوں کے ملازمین کے
 دل جیت لیے تھے۔

ہندو رانیوں میں اس قدر مقبول ہو جانے کے بعد بھی نگو کو دہاں پین نہ ملا اور راج ماتا
 اور ایک رانی کے اختلاف کی وجہ سے اسے راج محل سے نکلنا پڑا۔

راج ماتا اور رانی دونوں کو شبہ تھا کہ نگو دوسرے فریق کے لیے اس کی جاسوسی کرتی ہے
 اس طرح اسے مردود کر کے ایچے شامیا کے سپرد کیا گیا کہ اس فننے کو ہمیشہ کے لیے زمین میں
 دفن کر دیا جائے۔

ایچے شامیا نے نگو کے محل کو دیکھا تو حیران رہ گیا اور اس نے اس کینیز کو یہ کہہ کر فاطمہ بیگم
 (والدہ سلطان ٹیپو) کے حضور پیش کیا کہ یہ ایک بے سارا مسلمان لڑکے ہے اور آپ کے زیرِ مایہ
 رہ کر زندگی گزار رہا ہے۔

فاطمہ بیگم کو نگو کی صورت ایسی پسند آئی کہ انہوں نے اسے اپنی کینیزوں میں داخل کر لیا۔ یہ نگو
 کے عروج کا زمانہ تھا مگر کچھ دنوں بعد محل میں ایک سازش ہوئی اور اس سازش کا پورا الزام نگو
 کے مرتعوب دیا گیا۔

نگو والدہ سلطان کی خدمت میں نئی نئی آئی تھی اس لیے اپنی معافی پریشانی نہ کر سکی اور فاطمہ بیگم
 نے اسے قلعہ دار کے حوالے کیا کہ اس سازشی کینیز کو قتل کر دیا جائے۔

مگر —
 بد قسمت یا خوش قسمت نگو قتل ہونے سے بچ گئی کہ اس کی بھولی صورت نے بیمار بھی کام
 کیا اور قلعہ دار نے اسے اپنی داشتہ بنا کے رکھ لیا اور فاطمہ بیگم کو یقین دلادیا کہ نگو اپنے انجام
 کو پہنچ گئی۔

نگو کو فاطمہ بیگم سے بہت محبت تھی۔ فاطمہ بیگم بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھیں مگر جب فاطمہ بیگم
 نے نگو کا آہ و زاری کا ذرا خیال نہ کیا اور اسے سازشی سمجھتے ہوئے اسے قتل کرنے کے لیے قلعہ دار
 کے حوالے کر دیا تو نگو کو بہت صدمہ ہوا۔ اور اس نے سوچ لیا کہ ایسی زندگی سے تو موت ہی

موت — موت نے ہی اسے نہیں بچایا اور قلعہ دار نے اسے داشتہ ہی نہیں بنایا بلکہ اسے ایک

ہو نہیں تو یہ جرئت نہ کرتیں!

ننگو ہر صورت اسی وقت فاطمہ بیگم سے ملنا چاہتی تھی اس لیے اس نے انتہائی خوشامد انداز سے ایک بار پھر درخواست کی:

"میری نیک بہن! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں بلا سبب رات کے اس پسر مادرملکہ سے نہیں ملنا چاہتی بلکہ جیسا کہ میں نے تمہیں بنایا ہے کہ میرے پاس ایک شاہی راز ہے جو میں فوراً مادرملکہ تک پہنچانا چاہتی ہوں۔

کاش! میں تمہیں سب کچھ بتا سکتی۔ ہاں میں تمہیں یقینی دلائی ہوں کہ مادرملکہ اگر ناراض ہوئیں تو اس کی ساری ذمہ داری میں اپنے اوپر لے لوں گی۔"

"مگر ننگو! دیکھنا۔ میں... میں ایک معمولی کینز۔ کینز خاص نے کہنا چاہا مگر ننگو نے اسے بولنے نہ دیا:

"ایک بات کان کھول کر سن لو۔"

اس نے تلخی سے کہا:

"اگر میرا اس وقت مادرملکہ سے نہ مل سکی اور صبح کو انہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو میں بتائی کہ حالات میں صاف کہہ دوں گی کہ اس کی ذمہ دار تم ہو۔ تم نے مجھے مادرملکہ سے ملنے نہیں دیا تھا۔"

ننگو کا یہ حربہ کامیاب ہوا اور کینز فوراً مادرملکہ کے پاس چل گئی۔ اس کے جانے کے بعد ننگو کو ایک اور فکر سنا نے لگی۔ وہ یہ کہ قلعہ دار نے مادرملکہ کو بتا دیا تھا کہ اس نے ننگو کو قتل کر دیا ہے۔ اب جب کینز خاص یہ کہے گی کہ ننگو ان سے ملنا چاہتی ہے تو مادرملکہ کو کیسے یقین آئے گا۔

ننگو اسی شش و پنج میں مبتلا تھی کہ کینز خاص واپس آتی دکھائی دی۔ ننگو کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اس نے آتے ہی کہا:

"ننگو۔ عجیب بات ہے۔ مادرملکہ تو غنیمت مردہ سمجھتی ہیں۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ننگو نے خود مجھے پاسبان بھیجا ہے تو انہیں بڑی مشکل سے یقین آیا۔ مجھے بتاؤ تو یہ تمہارے مردہ ہونے کا کیا قصہ ہے؟"

"میری بہن!"

ننگو نے اسے جھنجھوڑ ڈالا:

"میں تمہیں سب بتا دوں گی۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ مادرملکہ نے مجھ سے ملنے کے بارے میں کیا کہا ہے؟"

"ارے ننگو۔ مادرملکہ تو تم سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں تمہارے زندہ ہونے کی بہت خوشی ہے۔"

کینز خاص نے ننگو کو بڑی مسرت سے بتایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے مادرملکہ کی خواب گاہ پر لے گئی۔

ننگو کو دروازے پر چھوڑ کر وہ ایک لمحہ کے لیے اندر گئی پھر واپس آ کر بولی:

"جاؤ ننگو۔ مادرملکہ تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

ننگو جھپاک سے اس خواب گاہ میں داخل ہوئی جہاں کبھی اس کا بے دھڑک جانا نہ تھا۔ سامنے بڑے پتھر کھٹ پر بیٹھی مادرملکہ آنکھیں پھاڑے اسے متا دیکھ رہی تھیں۔

"اری ننگو۔ تو زندہ ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ مجھے سب معلوم ہو گیا۔ دشمنوں نے تجھ پر جھوٹا الزام لگا یا تھا۔"

اور ننگو نے فرش پر بیٹھ کر مادرملکہ کے پیرو پکڑ لیے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو جاری ہو گئے۔

فاطمہ بیگم نے ننگو کے سر پر ہاتھ تھپ تھپ کیا کہ اسے تسلی دی:

"ننگو۔ اب بتا کہ تجھ پر کیا گزری اور تیری زندگی کس طرح ہوئی؟"

ننگو نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا:

"مادرملکہ۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ میں تو آپ کو یہ اطلاع دیے آئی ہوں کہ قلعہ دار اپنے شامیانے آپ کو گرفتار کرنے اور میرے منہ میں خاک، سلطان معظم کو قتل کرنے کی سازش کیا ہے۔"

مجھے یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ اس سازش میں اور کون کون لوگ شامل ہیں بہر حال آپ اپنا جو انتظام کر سکیں کریں۔"

فاطمہ بیگم بہت فکر مند ہوئیں۔ انہوں نے پوچھا:

”نگو کہ کم از کم یہ تو بتا کہ تجھے یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئیں اور ان کا ثبوت کیا ہے؟“
”مادر ملکہ“۔ ”نگو افسردگی سے بولی:

”میں کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتی مگر میں نے یہ باتیں اپنے کانوں سے سنی ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ قلعدار نے مجھے اپنی داستانہ بنا کر اپنی حویلی میں رکھ چھوڑا ہے۔ اعلانے اسی پر میں نہیں کیا بلکہ وہ مجھے اپنے دوستوں کی خدمت اور انہیں خوش کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ آج وہ دونوں حد سے زیادہ شراب پی گئے اور۔“

”دونوں سے تیری کیا مراد ہے نگو؟“۔ ”مادر ملکہ نے قطع کلام کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔“

”نگو نے سنبھل کے اور واضح الفاظ میں جواب دیا:

”مادر ملکہ۔ قلعدار کے بہت سے دوست ہیں جو اس کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں لیکن اپنے شامیاس کا گھر دوست ہے اور وہ اپنی راتیں قلعدار کے ساتھ اس کی حویلی میں ہی گزارتا ہے اس وقت بھی وہ اور قلعدار شراب میں مہوش پڑے ہیں اور میں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”اچھا۔ اب تو اطمینان سے میرے پاس رہ۔ میں ان کم بختوں کا ابھی انتقام کرتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے فاطمہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”نہ مادر ملکہ۔ ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔“

نگو فاطمہ جوڑ کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی:

”یہاں کے کسی آدمی پر اعتماد نہ کیجیے۔“

فاطمہ بیگم نے اسے پیار سے دیکھا اور بولیں:

”اری تو باؤلی تو نہیں ہو گئی۔ آخر میں اپنی حفاظت کا کوئی انتظام تو کروں گی نا!“

”آپ انتظام ضرور کیجیے مادر ملکہ۔“ نگو نے جواب دیا:

”مگر اس طرح نہیں۔ آپ کسی طرح اس سازش کا حال سلطان معظم کے کانوں تک پہنچا دیں

وہ آپ ہی سب انتظام کر لیں گے۔“

فاطمہ بیگم حکم مند لہجے میں بولیں:

”اور اگر سلطان کے آنے میں دیر لگی تو یہ بد بخت نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔ میں کیسے

سنبھالوں گی؟“

”آپ اطمینان رکھیے مادر ملکہ۔“

نگو نے انہیں تسلی دی:

”ابھی ان ظالموں کی سازش مکمل نہیں ہوئی ہے۔ وہ ابھی راج محل کی رانیوں سے بات چیت کر رہے ہیں۔ جتنی دیر میں ان کی بات چیت مکمل ہوگی، سلطان معظم کوئی نہ کوئی انتظام کر دیں گے۔“

”اچھا۔ میں ابھی کچھ کرتی ہوں۔“

فاطمہ بیگم نے اپنے محل کے داروغہ کو بلانے کے لیے ایک کیمز کو بھیج دیا۔

”اچھا مادر ملکہ۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔“

نگو اٹھ کے کھڑی ہو گئی:

”خدا آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے۔“

”یہ تو کیا کہہ رہی ہے بگم!“

فاطمہ بیگم نے اسے گھور کے دیکھا:

”اب میں تجھے ان ظالموں میں واپس نہیں جانے دوں گی۔“

”مادر ملکہ۔“ نگو نے اطمینان سے کہا:

”میرا جانا بہت ضروری ہے۔ اگر میں واپس نہ گئی تو بات کھل جانے کا خطرہ ہے۔ پھر

اور مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔“

نگو نے مادر ملکہ کو بمشکل سمجھایا اور بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔

نگو کی اس اطلاع پر فاطمہ بیگم نے خفیہ طور پر ایک قاصد سلطان معظم کے پاس روانہ کیا اور

قاصد سے اس سازش کا پتہ چلتے ہی سلطان نے محمد علی کیدان کو دار السلطنت سرنگاپٹم کے

امالات کی درستگی کے لیے بھیج دیا تھا۔

محمد علی کیدان، بنگلور کے راستے سے سرنگاپٹم کے قریب پہنچا اور اس نے اپنی مختصر فرج

یہ ساتھ کھڑی گڑ میں قیام کیا۔ یہاں اس نے مشورہ کیا کہ وہ کرگ ہو نا ہوا حیدر نگر جا رہا ہے

قلعدار نے اطمینان سے کہا:

”مردار محمد علی کیدان کو ہمارا سلام کہنا اور ہماری طرف سے عرض کرنا کہ دارالسلطنت مرزا کاظم آپ کا گھر ہے۔ آپ بے تکلف تشریف لا سکتے ہیں اور اپنے بال بچوں میں جتنے دن چاہیں گزار سکتے ہیں۔“
قاصد سلام عرض کر کے واپس ہو گیا۔

اجازت ملتے ہی محمد علی کیدان نے پچاس سوار اپنے ساتھ لیے اور باقی لشکر کو قلعہ کے ارد گرد چھب جانے کا حکم دیا۔ انہیں سجا دیا گیا کہ جب قلعہ کے اندر بگلی بجھنے کی آواز بلند ہو تو وہ سیڑھیاں لگا کر قلعہ پر چڑھ آئیں اور پہرہ داروں کو قتل کر کے قلعہ پر قبضہ کی کوشش کریں۔

قلعدار نے قلعہ کے صدر دروازے کے پہرے داروں کو حکم بھجو دیا تھا کہ محمد علی کیدان اور اس کے چند آدمیوں کو صدر دروازے کے اندر کے چھوٹے دروازے سے قلعہ میں داخل کر لیا جائے چنانچہ جب محمد علی کیدان اپنے ۵ آدمیوں کے ساتھ قلعہ کے دروازے پر پہنچا اور اپنے آنے کی اطلاع کرائی تو قلعہ کے پہرے داروں نے چھوٹا دروازہ کھول کے محمد علی کیدان اور اس کے ساتھیوں کو اندر داخل کر لیا۔

قلعدار مرزا کاظم میں داخل ہوتے ہی محمد علی کیدان اور اس کے ساتھیوں نے تلواریں سونت لیں اور پہرے داروں پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے بگل بگلانے شروع کر دیے۔ بگل کی آواز سننے ہی نصیب قلعہ کے قریب بھیجی ہوئی محمد علی کیدان کی فوج نصیب پر حملہ آور ہوئی اور سیڑھیاں لگا کر اوپر چڑھ گئی۔

نصیب کے پہرے دار گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

دوسری طرف محمد علی کیدان کے ساتھیوں نے پہرہ داروں کا صفایا کر کے قلعہ کا بڑا دروازہ کھول دیا اور باقی کا لشکر صدر دروازے سے قلعہ میں داخل ہو گیا۔

اس دو طرفہ کار سے گھبرا کر محافظوں نے ہتھیار ڈال دیے یا پھر قتل ہو گئے اور محمد علی کیدان نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

اس کے فوراً بعد محمد علی کیدان نے قلعہ دار اپنے شاہیا کی رہائش گاہوں کو گھیرے میں لے کر دونوں کو گرفتار کر لیا۔

جہاں کے حالات کچھ بگڑے ہوئے ہیں۔

کڑی لگنے، مرزا کاظم سے صرف چند میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے اس نے ایک قاصدے ذریعہ قلعہ دار مرزا کاظم کو ایک خط بھیجا جس میں اس نے درخواست کی کہ وہ کرگ کے راستے حیدرنگر جا رہے ہیں اس لیے اگر قلعہ دار اجازت دے تو وہ ایک رات اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گوارے۔

محمد علی کیدان کا خط لے کر جب قاصد قلعہ دار کے پاس پہنچا تو اتفاق سے اس وقت اپنے شاہیا اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔

قلعدار نے خط پڑھ کر قاصد کو انتظار کرنے کے لیے باہر بھیج دیا۔ پھر اس سلسلے میں اس نے اپنے شاہیا سے مشورہ کیا۔

قلعدار نے اپنا خیال ظاہر کیا:

”اپنے شاہیا۔ سردار محمد علی کیدان کا حیدرنگر پہنچنے کا مسبب یہ ہے کہ ہمارے منصوبے کا ابھی تک کسی کو دقتی پھر پتہ نہیں اور سلطان اور اس کے حواری اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔“

اپنے شاہیا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا:

”قلعدار ہمارے وہ منصوبہ ہی کیا جس کا راز کھل جائے۔ ہم نے اس قدر خفیہ طریقے سے کام شروع کیا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکتی۔“

”پھر تمہارا کیا خیال ہے؟“ قلعہ دار نے پوچھا:

”محمد علی کیدان کو ایک رات کے لیے قلعہ میں آنے کی اجازت دے دی جائے۔ کوئی حرج تو نہیں اس میں؟“

”لوجی۔ یہ بھی کوئی بوجھنے کی بات ہے۔“

اپنے شاہیا ہنسا:

”محمد علی کیدان کو ایک رات قلعہ میں لے کر آنے کی اجازت ضرور ملنی چاہیے۔ یہ تو ہمارے منصوبہ کے لیے اور بھی بہتر ہو گا۔ اگر اس وقت تک کسی کو ہماری نیتوں پر شبہ ہو گا تو محمد علی کیدان کے قتل کے لیے رات گزارنے سے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔“

پھر قلعہ دار نے قاصد کو بلا کر دریافت کیا:

”ہماری رات میں تمہارے بتایا ہوا جواب دہر دیا۔“

یہ تمام کام اس قدر تیزی اور سلیقہ سے ہوا کہ قلعہ کے باسیوں کو اس کی اطلاع بھی نہ ہو سکی۔ صبح جب وہ سو کے اٹھے تو یہ دیکھ کے حیران رہ گئے کہ قلعہ کے محافظوں کے بجائے قلعہ پر محمد علی کیدان کا لشکر قابض ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد قلعہ والوں کو قلعہ دار اور اپنے شامیا کی سازش اور ان کی گرفتاری کا حال معلوم ہو گیا۔

قلعہ دار کی گرفتاری کے وقت اس خطہ کو سازش کی جڑ نگو، قلعہ دار کی جوبلی میں موجود تھی۔ وہ فوراً وہاں سے نکل کے شاہی محل پہنچی اور فاطمہ بیگم کے حضور پیش ہوئی۔ انہوں نے اسے بہت سا انعام دیا اور پھر اپنی خالص کینزوں میں شامل کر لیا۔

ایک روایت کے مطابق مادر ملکہ (فاطمہ بیگم) نے نگو کا عقد معزنی دروازے کے سردار کے جواں عمر بیٹے سے کر دیا تھا مگر نگو نے شوہر سے یہ اجازت حاصل کر لی تھی کہ وہ تمام دن فاطمہ بیگم کی خدمت میں رہے گی اور رات اپنے شوہر کے گھر گزارا کرے گی۔

دوسری صبح قلعہ دار اور اپنے شامیا کا مقدمہ مادر ملکہ کے حضور پیش ہوا اور محمد علی کیدان نے فاطمہ بیگم کے حکم سے قلعہ دار اور اس کے کئی ساتھیوں کو توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا۔ اپنے شامیا کے لیے حکم ہوا کہ سلطان کی واپسی تک اسے پابہ زنجیر قید خانہ میں رکھا جائے۔ چنانچہ اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اسد خاں رسالدار کو قلعہ دار اور سید محمد خاں کو گورنر سرنگاپٹم مقرر کیا گیا۔

سرنگاپٹم سے فراغت حاصل کر کے محمد علی کیدان اپنے لشکر کے ساتھ منزلیں اڑتا ہوا سلطان یٹو کے حضور پہنچا اور اسے سرنگاپٹم میں گزرے ہوئے تمام حالات سے آگاہ کیا۔ سلطان اس کی کارگزاری سے بہت خوش ہوا اور اسے خلعت فاخرہ عطا کی۔

اس کے بعد سلطان، محمد علی کیدان کو ساتھ لے کر حیدر نگر کی طرف بڑھا جہاں نواب مرحوم کے بے پالک ایاز خاں نے اودھم مچا رکھا تھا۔

حیدر نگر پہنچنے سے پہلے یہ بتانا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ایٹ انڈیا کمپنی کے بڑے بڑے کارکن بلکہ کرنل جنرل تک ہمیں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں

کرتے رہتے تھے۔

۱۷۸۱ء میں جنرل میکگرنٹی بنگال سے مدراس کا گورنر ہو کے آیا۔ میکگرنٹی اور جنرل کوٹ میں ہمیشہ سے کھٹ پٹ چلی آ رہی تھی۔

جنرل میکگرنٹی، جنرل کوٹ سے اس قدر بغض رکھتا تھا کہ اس نے بنگال میں اپنے ایک دوست میکفر بین کو خط لکھا تو اس میں جنرل کوٹ کے بارے میں یہ جملے تحریر کیے:

”میرے خیال میں جنرل کوٹ کی حیثیت ایک عورت سے زیادہ نہیں۔ وہ جب بچوں جیسی حرکتیں کرتا ہے تو مجھے اس کے حال پر ہنسی آتی ہے۔“

اس وقت جنرل کوٹ کے پاس کرناٹک کے عاذا کی کانپٹی۔ جنرل میکگرنٹی نے مدراس کا گورنر ہونے ہی آؤ کوٹ کو بنگال واپس بھیجا دیا اور اس کی جگہ جنرل جیمز اسٹوارٹ کو کرناٹک اور پائیں گھاٹ کا محاذ سونپ دیا۔

انہوں نے نواب حیدر علی خاں کا انتقال ہو گیا اور انگریز فوجوں کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ جیمز اسٹوارٹ فوراً لشکر لے کر آگے بڑھا مگر اچھی وہ واندی داس ہی پہنچا تھا کہ گورنر میکگرنٹی نے اسے مدراس واپس بلا لیا اور اس کی جگہ جنرل میتھوز کو یہ محاذ دیا گیا۔

جنرل میتھوز کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ حیدر نگر کے زرخیز علاقہ پر جلد از جلد قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔

قارئین کرام! جانتے ہیں کہ مرحوم نواب حیدر علی خاں نے ۱۷۶۲ء میں بد فور پر قبضہ کر کے اس کا نام اپنے نام پر حیدر نگر رکھا تھا۔ مرحوم نواب اس علاقہ کی شادابی اور سرسبزی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسے اپنا دوسرا دارالسلطنت بنا لیا۔ انہوں نے یہاں ٹکسال قائم کی اور بہت سی صنعتیں لگا کر اسے ایک خوشحال شہر میں تبدیل کر دیا۔

حیدر نگر زرخیز زمینوں اور شاداب علاقے پر مشتمل تھا۔ اس کے بیشتر حصے میں قیمتی لکڑی کے جنگلات تھے۔ یہاں کے گورنر ایاز خاں نے نواب بہادر کی موت کے اعلان کے ساتھ ہی طم بغاوت بلند کر دیا تھا اور انگریزوں سے ساز باز شروع کر دی تھی۔ چنانچہ جب جنرل میتھوز ندہ پور کے علاقہ پر قبضہ کے بعد حیدر نگر کے قریب پہنچا تو احسان فراموش ایاز خاں، وہاں اس کے استقبال کو موجود تھا۔

جنوری ۱۸۸۴ء میں سلطان ٹیپو نے ایک خاص قاصد کے ذریعے حاکم حیدرنگر ایاز خاں کے نائب لطف علی بیگ کے نام ایک خط بھیجا جس میں درج تھا کہ ایاز خاں کی جگہ لطف علی بیگ کو حیدرنگر کا گورنر مقرر کیا جاتا ہے اور یہ کہ لطف علی کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ایاز خاں کا سر قلم کر کے حضورِ سلطان میں بھجوائے۔

قاصد سلطان کا خط لے کر حیدرنگر پہنچ تو گیا مگر وہ نہ تو ایاز خاں کو پہنچا تھا اور نہ ہی لطف علی بیگ کو۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی نے کسی شخص سے لطف علی بیگ کو پوچھا تو ایاز خاں کے آدمیوں کو اس پر شبہ ہو گیا اور وہ اسے پکڑ کر ایاز خاں کے پاس لے گئے۔

ایاز خاں نے قاصد سے اس کی جان بخشی کا وعدہ کیا اور اس سے سلطان کا خط حاصل کر لیا۔

ایاز خاں بالکل ان پڑھ تھا اس لیے وہ خط لے کر ایک برہمن کے پاس گیا۔ برہمن نے اسے خط پڑھ کر سنا دیا۔

ایاز خاں خط کا مضمون سن کر گھبرا گیا کہ اگر کسی اور کو اس خط کا علم ہو گیا تو ایک طرف لطف علی اور اس کے وفادار دستے اس (ایاز خاں) کے دشمن ہو جائیں گے اور دوسری طرف وہ انگریزی فوج جو معاہدہ کر رہا ہے وہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔

یہ سب سوچ کے اس نے فیصلہ کیا کہ اس خط کے مضمون کو راز میں رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان برہمن کو جہنم رسید کر دیا جائے۔

خط پڑھنے والا برہمن اب تک ایاز خاں کے سامنے انعام کی توقع میں کھڑا تھا کہ ایاز خاں نے اس کے سینے میں جھڑنا کر یہ راز جاننے والے اس پہلے اور آخری خرم راز کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا۔

ادھر سے فارغ ہو کر اس نے ایک انگریز قیدی کپتان ڈونالڈ کیسبل کو بلوایا اور اسے جنرل میتھون کے نام ایک خط لکھوایا جس میں حیدرنگر کا قلعہ انگریزوں کے حوالے کرنے کے لیے اس میں دوسری شرطیں رکھی گئیں۔

اسی شرط یہ تھی کہ قلعہ پر قبضہ کے بعد انگریز اسے (ایاز خاں کو) حسبِ سابق واپس لوٹنے پر تیار رکھیں گے۔ دوسری شرطیں یہ تھیں کہ انگریز ایاز خاں کی دولت چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے۔

میتھون کو خط لکھا کہ ایاز خاں نے کیپٹن کو آزاد کر دیا اور وہ خط لے کر جنرل میتھون کے پاس پہنچا۔

شرائط میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی چنانچہ جنرل نے دونوں شرائط تسلیم کر لیں۔ ایاز خاں نے قلعہ کے دروازے انگریز فوج پر کھول دیے اور میتھون بغیر ایک قطرہ خون بہائے حیدرنگر چلیے خوبصورت اور مالدار شہر پر قبضہ ہو گیا۔

سقوطِ حیدرنگر کے بعد ایاز خاں کے حکم سے اردگرد کے بہت سے قلعے انگریزوں کے حوالے ہو گئے صرف قلعہ انت پور نے ایاز خاں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور حکومتِ ندوہ کی وفاداری کا اعلان کر دیا۔

انگریزوں نے اس قلعہ پر شدید حملہ کیا۔ قلعہ کے اندر صرف چار سو فوجی موجود تھے مگر انہوں نے اس قدر سخت مدافعت کی کہ انگریزوں کے دانت کھٹے ہو گئے۔

سلطان ٹیپو کے یہ وفادار شام تک مقابلہ کرتے رہے۔ رات لڑتے لڑتے جب ان کی تعداد ۲۰۰ سے بھی کم رہ گئی تب انہوں نے ہتھیار ڈال دیے مگر انگریزوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ سلطان کے وفادار بڑے ہوش و جذبہ سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اس وفاداری کی یادداشت میں قلعہ کی آبادی کو شدید مصائب اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔

انگریزوں نے بڑھوں اور بچوں کو بے دریغ قتل کیا۔ عورتوں کی عصمت دری کی اور ان کی پستان کاٹ دیے۔ تمام خوبصورت لڑکیوں کو انگریز فوجی پکڑ کر لے گئے جن کا کوئی پند نہ چلا۔ یہ ہیں اس کمپنی اور دغا باز قوم کے سپاہ کار نامے جو تجارت کے پردے میں ہندوستان پر قابض ہوتی چلی جا رہی تھی اور خود ہمارے مفاد پرست، بھائی بند اس کی مدد کر رہے تھے۔

انگریز لشکر کی ان سپاہ کاریوں اور بد معاشریوں پر اس قدر شور مچا کہ پورا ہندوستان گونج اٹھا۔ لوگوں نے ایٹ انڈیا کمپنی کی شکایت انگلستان تک پہنچائی۔ وہاں سے جواب طلبی ہوئی۔ ۵۲ افراد پر مشتمل ایک کمیشن بھیجا اور اس نے ماہ تحقیقات کر کے جو رپورٹ پیش کی اس میں

صرف یہ درج تھا:

”صرف ایک عورت قتل ہوئی اور ایک کے ساتھ بیہیمانہ سلوک ہوا، جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہو گئی تھی۔ دو بچے لڑائی کے دوران مارے گئے تھے۔“

یہ رپورٹ سچ ہے۔ ایس۔ ٹوریانو نے تیار کی تھی۔

اس کے علاوہ شاہی نوپ۔ اند کے سرجن جان موڈی نے بیان دیا تھا کہ:
"قتل ہونے والی عورتوں اور بچوں کی تعداد صرف چھ تھی۔"

ان متضاد بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے قلعہ کے تمام، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں سے جو کچھ بھی نہ کیا وہ غنڈہ ہے۔ برطانوی حکمرانوں اور لشکر کی داستانیں اس قدر بھیاںک اور ہیما نہ ہیں کہ جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سلطان ٹپو کو انگریزوں کے ظلم و ستم کی تمام داستانیں ایک ایک کر کے پہنچ رہی تھیں۔ اس کے غضب کا پارہ پڑھتا جا رہا تھا۔ آخر وہ چند ہی روز بعد شیر کی طرح گر جاتا اور دھاڑتا ہوا قلعہ کے میدان میں پہنچ گیا۔ انگریز فوجیں بھی اس کے سامنے آکر صف آرا ہوئیں۔ اس وقت سلطان نے ایک جنگی چال چلی۔

وہ انگریزوں کو دھکا دے کر ان کے عقب میں پہنچ گیا اور ادھر سے حکم کرنا ہی چاہتا تھا کہ مخبری ہو گئی اور انگریزوں کو پتہ چل گیا کہ سلطان ٹپو کا لشکر پشت سے حملہ آور ہونے والا ہے۔ یہ خبر پانے ہی جنرل مینٹون فوراً اپنے لشکر کو لے کر قلعہ میں واپس چلا گیا اور قلعہ بند ہو گیا۔ سلطان ٹپو نے آگے بڑھ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور سلطانی نوپ خانے نے قلعہ پر آگ برسانا شروع کر دی۔

کہتے ہیں کہ قلعہ کے اندر فیصل کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا کنواں تھا۔ قلعہ کی واحد کنواں تھا جس سے پورے قلعہ والے پانی حاصل کرتے تھے۔ ادھر فیصل قلعہ پر رات دن گولہ باری کا سلسلہ جاری تھا۔

اس شدید گولہ باری کا یہ اثر ہوا کہ فیصل کا وہ حصہ جس کے نیچے بڑا کنواں تھا اٹوٹ کر کنویں پر گری اور کنواں بند ہو گیا۔
کنواں کیا بند ہوا کہ ہر طرف سے العطش العطش کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئیں اور لوگ پیل سے تڑپنے لگے۔

قلعہ سے باہر ایک تالاب تھا۔ انگریز فوجی پیاس سے بے دم ہو رہے تھے۔ ایک رات وہ

پیل کے ٹوٹے ہوئے حصے سے باہر نکلے اور پانی بھر بھر کے اندر لے جانے لگے۔ اندھیرے کی وجہ سے پہلی رات تو سلطانی لشکر کو کچھ پتہ نہ چل سکا مگر دوسری رات کو سلطان کا لشکر پہلے سے نکلتا تھا۔

قلعہ کے انگریز لشکر کی جب دوسری رات قلعہ سے نکل کے تالاب پر پہنچے اور انہوں نے بڑے سے ڈرموں، پیپوں اور برتنوں میں پانی بھرنا شروع کیا تو سلطان کے فوجی جو گھات لگائے بیٹھے، ان پر ٹوٹ پڑے۔

پانی بھرنے والے انگریزوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ تھی۔ انہوں نے مقابلہ کرنا چاہا مگر ہڈیوں سے زیادہ نہ ٹھہر سکے اور مر رہے پیر رکھ کر قلعہ کی طرف بھاگے۔ اس افراتفری میں انہوں نے اپنے سینکڑوں آدمیوں کو پیر دل تلے پل ڈالا۔ جو باقی بچے ان پر سلطانی لشکر گویا بار بار ہوا۔

نہ یہ ہوا کہ باہر آنے والوں کی کثیر تعداد ماری گئی اور بہت کم فوجی زندہ بچ کر جاسکے۔ پانی نہ ملنے کی وجہ سے قلعہ والوں کی حالت روز بروز ابتر ہو رہی تھی۔ ان کے پاس سوائے مار ڈالنے کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا۔ چنانچہ مینٹون نے نابٹ قلعہ دار محمد علی شجاع کے توسط سے

ایک گشتگرہ کے ذریعہ جنرل مینٹون نے خود اپنی طرف سے مندرجہ ذیل شرطیں لکھ کر سلطان کے پاس بھیجیں اور سلطان دینین دلا یا کہ اگر سلطان ان شرطوں کو تسلیم کر لیں تو قلعہ اور شہر ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔

شرائط:

۱۔ انگریز فوج جب قلعہ خالی کر کے نکلے تو شہر کے لوگ اور سلطان کے فوجی ان کے منہ پر نہ تو تھوکیں گے نہ گالی دیں گے اور نہ زخمی کریں گے۔

۲۔ انگریزی فوج صرف اپنا نجی سامان اپنے ساتھ لے جائے گی۔
بند و قید، توپیں اور دوسرا سامان حرب سلطانی لشکر کے قبضہ میں دے دیا جائے گا۔

۳۔ انگریزی فوج کے قبضہ میں سلطنت، خدا واد کا جو درہیم، مال اور سامان ہو گا وہ سب کا سب سلطان کو واپس کر دیا جائے گا۔ اگر کسی فوجی کے پاس سے کوئی رقم یا مال نکلے گا تو اسے سخت سزا

دی جائے گی۔

- ۴۔ انگریزی فوج کو حفاظت سمندر تک پہنچایا جائے گا۔
۵۔ سلطنتِ خدا داد کے چند ہماز انگریزی فوج کو واپس لے جانے کے لیے دیے جائیں گے اور سفر کے لیے انہیں اناج اور دوسرا ضروری سامان بھی دیا جائے گا۔ جس کی قیمت وہ اپنی منزل پر پہنچ کر بھجوا دیں گے۔

۶۔ جو لوگ خشکی کے ذریعے جانا چاہیں گے ان کی حفاظت کے لیے جیسی تکہ ایک حفاظتی دستہ دیا جائے گا۔

۷۔ سلطنتِ خدا داد کے دو بڑے افسر انگریزوں کے جہازوں پر سوار ہونے تک بطور برغمال انگریزوں کے پاس رہیں گے اور اسی طرح انگریزوں کے دو افسر سلطان کے پاس رہیں گے۔ جب سلطان افسر واپس آجائیں گے تو انگریز افسر واپس کر دیے جائیں گے۔

سلطان ٹیپو اور انگریزی فوج کے جنرل مینٹوز (جو حیدرنگر کے قلعہ میں محصور تھا) کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز فوج کی جانبیں پوری طرح سلطان کے ہم درگم پر تھیں اور ان کے چشم و ابرو کے ایک اشارے پر ان کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔

سلطان ٹیپو نے بھی اس دلت اسی شرافت اور رحمدلی کا ثبوت دیا جو اس کے والد مرحوم اب حیدر علی خاں نے صلحِ مدراس کے موقع پر دکھائی تھی۔ اس صلح نامہ میں بھی ایسی ہی آسان شرائط تھیں جن پر بعد میں مسلمانوں نے خود اعتراض کیا تھا کہ ظالم اور فریب کار انگریزوں کے ساتھ اسی قدر آسان شرائط پر نواب بہادر کو صلح نہیں کرنی چاہیے تھی۔

تاہم اس کو کیا کیا جائے کہ "چور چوری سے جانا ہے مگر میرا پھیرا سے نہیں جانا" کے مصداق انگریز قوم کے لیے دنیا کی تمام اقوام کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ انگریز دنیا کی سب سے زیادہ مکار، فریبی اور احسان فراموش قوم ہے۔ چنانچہ اس قدر آسان شرائط برصغیر کے باوجود اس قوم نے اپنی فطری مکاری اور فریب کاری کا دامن نہ چھوڑا اور خود اپنے جال میں پھنس گئی۔ اس معاہدہ کا نام "معاہدہ منگلور" رکھا گیا تھا۔

اس کی ایک شرط یہ تھی کہ انگریز فوج اپنے ساتھ سوائے اپنے ذاتی سامان کے قلعہ کے اندر سامان یا مال و دولت میں سے کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لے جائے گی اور اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسے

یہ شرائط صلح کو جنرل مینٹوز نے لکھ کر اپنے دستخطوں کے ساتھ سلطان کے پاس بھیجیں۔ سلطان انہیں تسلیم کرتے ہوئے ان پر دستخط کر دیے۔ یہ معاہدہ انگریزی اور فارسی زبان میں لکھا گیا۔ اسی طرح ۱۸ روز کی جان توڑ کوشش کے بعد قلعہ پر سلطان کا قبضہ ہو گیا۔ اسی فتح کے موقع پر کسی شاعر نے فی البدیہہ یہ تاریخ لکھی تھی:

حیدرنگر گرفتہ

۱۱۹۷ھ

فوجیوں کی جامہ تلاشی سے جو ہیرے جو اہرات برآمد ہوئے ان کا ایک اونچا ڈھینڈا
دش پر لگ گیا۔

سلطان کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے چیخ کر کہا:
"کس قدر مکار اور بے ایمان ہوئم لوگ، تم نے معاہدے پر عمل کرنے سے پہلے ہی اس
کی دھجیاں اڑا کے رکھ دیں۔"

تم لوگ اس ملک کے بامیوں کو اتنی سمجھتے ہو۔ تم نے ہماری زلی اور رحمتی سے ناجائز
فائدہ اٹھایا ہے۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی رعایت کی جائے۔ ہم اس معاہدہ کو
منسوخ کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔"

معاہدہ منسوخ کرنے کے بعد سلطان نے حکم دیا کہ:
"انگریزی فوج اور جنرل میتھوز کو سرنگا پٹم پہنچایا جائے اور ان سب کو قید میں رکھا جائے۔"
اس طرح انگریزی فوج جو معاہدہ کے مطابق بغیر ایک جان ضائع کیے بمبئی پہنچ سکتی تھی،
خود اپنی بے ایمانی اور مکاری کے ہاتھوں قید خانے میں پہنچ گئی۔

حیدرنگر کا باغی قلعہ دارا باز خاں پہلے ہی منگور بھاگ گیا تھا۔ اسے جب حیدرنگر پر سلطان
کے قبضہ اور انگریز فوج کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو وہ منگور سے بھاگ کے سورت پہنچا۔ پھر
جب اسے وہاں بھی خطرہ محسوس ہوا تو انگریزوں کے پاس بمبئی پہنچ گیا۔

جنرل میتھوز اس شکست اور گرفتاری سے اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ قید کے دوران
بیمار ہوا اور کچھ دنوں بعد مر گیا۔

انگریزوں نے میتھوز کی موت پر بہت شور مچایا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ سلطان نے
اسے زہر دے کر مار ڈالا ہے۔

یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ اگر سلطان کو میتھوز کو ختم کرنا ہی مقصود ہوتا تو اسے زہر کیوں
دیتا۔ وہ تو اسے معاہدہ کی بد بھری کی پاداش میں گولی سے اڑوا سکتا تھا۔

حیدرنگر کی تسخیر کے بعد سلطان پٹنوں لشکر لے کر منگور کی طرف بڑھا۔ راستہ میں جاسوسوں
نے اطلاع دی کہ کرنل گیمبل ایک بڑے لشکر کے ساتھ حیدرنگر جارہا ہے تاکہ وہاں انگریز فوج

سخت مزادی جلائے گی۔

اس کھلی ہوئی شرط کے باوجود انگریز فوجیوں نے مکاری، فریب کاری اور ہیرا پھیر
سے کام لیا۔

سلطان نے معاہدہ کے تحت انگریز فوج کی قلعہ سے روانگی سے پہلے اپنے ایک سردار
قلعہ میں بھیجا کہ وہ جاکر خزانہ پر قبضہ کر لے اور لوگوں سے دریافت کرے کہ انگریزوں
کسی معاملہ میں بددیانتی یا خورد مرد سے کام تو نہیں لیا۔

لوگوں سے تو کچھ معلوم نہ ہو سکا البتہ جب خزانہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بالکل خالی
پڑا ہے۔

اس اطلاع پر سلطان کو سخت غصہ آیا۔ اس نے میتھوز کو بلا کر سخت باز پرس کی۔
"جنرل میتھوز، کیا قصہ ہے کہ خزانہ بالکل خالی پڑا ہے جبکہ اس میں کروڑوں روپے
ہیرے جو اہرات موجود تھے؟"

میتھوز نے صاف انکار کر دیا:

"میں یا میرے کسی آدمی نے حیدرنگر کے خزانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

سلطان کا غصہ تیز ہو گیا۔

"تم نے ہاتھ نہیں لگایا تو کیا خزانہ فرشتے اٹھا کے لے گئے؟"

"مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔"

میتھوز اپنے انکار پر اڑ گیا۔

سلطان نے حکم دیا:

"انگریز فوج کے ہر سپاہی کے سامان اور لباس کی تلاشی لی جائے۔"

چنانچہ انگریز فوجیوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے جامہ تلاشی شروع ہوئی۔

اب ذرا اس قوم اور افراد قوم کی مکاری ملاحظہ ہو۔

جس سپاہی کی جامہ تلاشی لی گئی اس کے لباس کی اندر کی تہوں میں ہیرے جو اہرات پھرے ہوئے
نلے۔ لباس کے علاوہ فوجیوں نے ساتھ لے جانے والی روٹیوں کے اندر، پائپ اور حقوں کی تہ
اور پینڈوں کے اندر، یہاں تک کہ ساتھ لے جانے والے بکروں کی گردنوں میں سے جو ہیرے
جو اہرات برآمد ہوئے۔

کی مدد کرے۔

سلطان نے فوراً کرنل کیمبل پر حملہ کا حکم دے دیا۔ اس وقت سلطان کے پاس ایک لاکھ چالیس ہزار جاننازوں کا لشکر تھا۔

سلطانی لشکر میدان کے کنارے ایک تالاب پر مورچے لگائے اور توپ خانہ نصب کیے کیمبل کا منتظر تھا۔ کیمبل نے بھی سامنے آکر لشکر ترتیب دیا اور جنگ پر آمادہ ہوا۔ سلطان نے توپ خانہ کو اشارہ کیا۔ توپ خانہ نے اس قدر گولے برسائے کہ آسمان پر دھوئیں کے بادل چھا گئے۔

کیمبل نے بھی جوابی گولہ باری کی۔ دونوں لشکروں میں دوپہر تک جنگ ہوتی رہی۔ پھر انگریزوں کا گولہ بارود ختم ہو گیا اور کیمبل کو میدان چھوڑنا پڑا۔ اس کے تین ہزار سپاہی ہتھیار ڈال کر گرفتار ہوئے اور ایک ہزار فوجی انگریز بھی پکڑ لیے گئے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ سلطان منگلور کی طرف جارہا تھا کہ درمیان میں کرنل کیمبل سے دو دو ٹکڑے کرنا پڑے۔ ادھر سے فارغ ہو کر سلطان پھر منگلور کی طرف روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔

محاصرے کو تین ماہ گزرے تھے کہ بارش کا موسم شروع ہو گیا اور اس قدر برسات ہوئی کہ سارا علاقہ جل چکا ہو گیا۔

اس دوران سلطان کو خبر ملی کہ دشمن کو سمندر کے راستے رسد مل رہی ہے۔ چنانچہ سلطان نے چار پانچ جنگی کشتیاں سمندر میں اتار دیں۔ ان کشتیوں نے سمندر سے کچھنے والی رسد کو بالکل روک دیا۔

منگلور کے محاصرہ کے طول کھینچنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں معاہدہ دارمائی ہو گیا تھا جس کی سولہویں مئی کے مطابق ان دونوں قوموں میں جنگ بند ہو گئی تھی۔ یہ جنگ یورپ میں بند ہوئی تو دونوں فریقوں نے تجارت میں بھی اپنے اپنے فور پر جنگ بند کر دی۔

سلطان کے لشکر میں فرانسیسی فوج بھی تھی۔ اس معاہدہ کی اطلاع پا کر اس نے بھی رٹنا بند کر دیا کیونکہ اس کے مقابلہ پر انگریز تھے۔ فرانسیسیوں کی اس خاموشی نے بھی منگلور کے محاصرہ کو طول دیا۔

موسلا دھار بارشوں کے باوجود سلطان نے منگلور کے محاصرے میں کوئی نرمی نہیں برتی۔ اس نے فرانسیسی فوج کی خاموشی کو بھی نظر انداز کر دیا۔

جوں جوں محاصرہ طول پکڑ رہا تھا قلعہ کے محصورین کی بے بسی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مدراس کے گورنر لارڈ میکارتھی کی کوشش تھی کہ کسی بھی طرح سلطان سے صلح ہو جائے لیکن حکومت ونگل گورنر لارڈ ہسٹنگز جانتا تھا کہ سلطان سے اس کی شرائط پر صلح کی جائے۔ اس سلسلے میں اس نے حکومت سے براہ راست دو کمشنروں کو سلطان کی طرف روانہ کیا تھا جو بارشوں کی وجہ سے راستے میں پھنسے ہوئے تھے۔

سلطان نے منگلور کے محاصرے میں اور زیادہ شدت پیدا کر دی تھی۔ اس پر گھبرا کر منگلور کے محصورین نے ڈنڈیگل میں انگریز فوج کے کرنل فلنٹن کو مدد کے لیے سکھا۔ کرنل فلنٹن نے اطلاع ملتے ہی فوجوں کو تیار کیا اور ڈنڈیگل سے روانہ ہو گیا مگر بجائے منگلور جانے کے اس کا رخ سرنگاپٹم کی طرف تھا۔

کرنل فلنٹن کا خیال تھا کہ ڈنڈیگل سے منگلور جانا، جو وہاں سے ڈھائی سو میل دور تھا، اس سے یہ زیادہ بہتر اور مفید ہو گا کہ وہ سرنگاپٹم پر حملہ کر دے جو نسبتاً قریب تھا۔ اس حملہ کی خبر جب شیو سلطان کو پہنچی کہ تو وہ دارالسلطنت کو بچانے کے لیے منگلور کا محاصرہ ختم کر کے واپس ہو جائے گا۔

چنانچہ کرنل اپنے منصوبہ کے مطابق پالا گھاٹ پہنچا اور اس پر قبضہ کر کے آگے بڑھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ بنگال کے گورنر ہسٹنگز کے دونوں کمشنر سرنگاپٹم پہنچ چکے تھے اور وہاں کے گورنر معین الدین سید صاحب سے ان کی صلح کے سلسلے میں گفتگو شروع ہو چکی تھی اور بات آگے بڑھ رہی تھی۔

اسی دوران سید صاحب کو کرنل فلنٹن کے پالا گھاٹ پر قبضہ کرنے کی خبر ملی۔ سید صاحب نے اس اطلاع پر صلح کی گفتگو روک دی اور کرنل فلنٹن کو خط کے ذریعے پیغام بھیجا کہ وہ ڈنڈیگل واپس ہو جائے مگر مغرور فلنٹن نے اس خط کو پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور اسے لانے والے کو واپس دے دیا۔ اس کا لشکر اب کو بمبئی پر پہنچ چکا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ جلد ہی سرنگاپٹم پر قبضہ کر لے گا۔

کو بمبئی کے قبضہ کے دوران کرنل فلنٹن کو دونوں کمشنروں کا بھی ایک خط ملا جس میں تحریر تھا

دو نوں کشنڑ باؤس ہو کر سلطان سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گئے۔

اُدھر کرنل کیمبل اور اس کی انگریز سپاہ کا محاصرے میں بُرا حال ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کرنل کیمبل نے کسی ذریعے سے جنرل میکلوڈ کو بھی اپنی مدد کے لیے بلوایا تھا۔

کرنل میکلوڈ کئی جہازوں میں سامان اور فوجی بھر کر منگور کے قریب ساحل سمندر پر تو پہنچ گیا مگر اسے خشکی پر کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی تھی جہاں اتر کر وہ محصورین کی مدد کے لیے پہنچ سکے۔

ایک دن اس نے جہاز ساحل سے لگا کر سامان اور فوج اتارنے کی کوشش کی مگر اسے جلد ہی یہ احساس ہوا کہ اسے گہرے میں لیا جا رہا ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی اس نے فوراً سامان جہازوں پر لہ دیا اور سوار ہو کر گہرے سمندر میں پہنچ گیا۔ اور مشہور یہ کر دیا کہ ساحل پر پانی اور رسد کا معقول انتظام نہیں تھا۔

ایک ہفتہ سے زیادہ جہازوں کو سمندر میں گمانے پھرانے کے بعد کرنل میکلوڈ کنا نور کی طرف چلا گیا۔ وہاں کی رانی نے کرنل میکلوڈ کے جہاز کے غلہ اور کچھ فوجیوں کو قید کر رکھا تھا۔ کرنل میکلوڈ نے کنا نور پر آسانی سے قبضہ کر لیا اور اپنے ساتھیوں کو قید سے آزاد کر لیا۔ اس نے کنا نور سے حاصل ہونے والے مال غنیمت پر خود قبضہ کر لیا۔ جب عجبی کی حکومت نے اس سے مال غنیمت کا جواب مانگا تو اس نے جواب بھجوا دیا کہ:

”میں نے مال غنیمت کا نصف حصہ یعنی ۲۳۱۲۱ روپے اپنے لیے رکھ لیے اور باقی نصف حصہ سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جو ان کا واقعی حق تھا۔“

”قلعہ منگور کا محاصرہ بھی کچھ عجیب تھا۔ سلطان نے بازار کھلوا دیے تھے اور لوگوں کو سامان خریدنے کی عام اجازت تھی۔ اس کے باوجود قلعہ کی نصف محصورین پر مشتمل آبادی، جو بھوک پیاس اور بیماری سے بچ گئی تھی، اس نے تنگ آ کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور صلح پر ہم آہنگی باہر آ گئی۔ سلطان نے ان سب باہر آنے والوں کو قیدی بنالیا۔ ان قیدیوں میں کرنل کیمبل بھی شامل تھا۔“

کہ وہ آگے نہ بڑھے کیونکہ صلح کی گفتگو اپنے آخری مراحل میں ہے مگر کرنل فلرٹن نے اس حد کی بھی کوئی پرواہ نہ کی اور سرنگاپٹم کی تسخیر کے لیے فوجیں آگے بڑھائیں۔

انسانے راہ کرنل فلرٹن کی ملاقات، پادری فریڈرک شوارز سے ہوئی۔ شوارز کشنڑوں کا ایک پیغام لے کر سلطان کے پاس بارہا تھا۔ اس نے کرنل فلرٹن کو سامنا ہوتے ہی کہا:

”کرنل۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ سلطان سے صلح کی بات چیت چل رہی ہے اور کامیابی کی نوبت سے فائدہ اُمید ہے لیکن تم نے ایسے موقع پر پالاکھاٹ اور کوئٹہ کو نہ وبالاکر کے رکھ دیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ سلطان اس اطلاع کے بعد صلح نامے پر دستخط کرے گا؟ میرا خیال ہے کہ وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔“

پادری نے خود ہی سوال کیا اور خود ہی اس کا جواب دے دیا۔

اس پر کرنل نے مسکرا کر مگر بڑی رکھائی سے جواب دیا:

”فادر۔ میرا آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یعنی میں آپ کو کوئی جواب ہی نہیں دیتا؟“

پادری اپنا سامنا لے کر رہ گیا اور کرنل کی طرف سے رخ پھیر کر اسی وقت سلطان کی طرف روانہ ہو گیا۔

سرنگاپٹم میں وہاں کے گورنر معین الدین سید صاحب اور دو نوں کشنڑوں میں صلح کی گفتگو بارہا لگتی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کرنل فلرٹن کے برابر آگے بڑھنے کے اطلاعات بھی موصول ہو رہی تھیں۔

انہی روز، سید صاحب کو سلطان کا ایک مختصر مگر انتہائی اہم پیغام ملا۔ یہ پیغام روشن خال لے کر آیا۔ اس نے سید صاحب سے بیان کیا:

”سید صاحب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کرنل فلرٹن کی پیشقدمی روکنے کے لیے چار ہزار سواروں کا ایک دستہ روانہ کر دیا گیا ہے۔ یہ دستہ گریٹ ہلی گھاٹ کے قریب فلرٹن کو روکنے کے لیے پہنچ چکا ہے۔“

یہ پیغام سننے ہی سید صاحب نے دو نوں کشنڑوں سے مزید گفتگو کرنے سے انکار کر دیا اور

کر لی کہیں کو قلعہ کے ہمراہ کے پہلے ہی دن تپ دق ہو گیا تھا۔ چنانچہ سلطان نے اسی کی بیماری کے پیش نظر اسے اپنی فوج کے ہمراہ بھیجی جانے کی اجازت دے دی مگر بد قسمت کر لی کہیں ایک ماہ بعد ٹی بی کے مرض سے بھیجی میں انتقال کر گیا۔

دونوں کمشنروں کا وفد منگلور کے قریب پہنچا تو سلطان کی طرف سے دوا فردوں نے ان کا استقبال کیا۔ وفد نے سلطان کی خدمت میں جو تحفہ بھیجا اس میں ایک مریض طلائی خلعت، سرخ اور سبز زربفت کی ایک چادر، سرخ اور نیلے رنگ کی ایک اور چادر، ایک تلوار، ایک ہاتھی اور دو گھوڑے شامل تھے۔

وفد سے صلح کی گفتگو کا آغاز ہوا۔

سلطان کی طرف سے پورنیا اور کمرشٹن راؤ نے نیابت کی جو کٹر ہندو تھے۔ سلطان نے جو صلح نامہ مرتب کر کے بھیجا، اس کی شرائط حسب ذیل تھیں:

۱۔ مالابار کے ساحل پر انگریزی متبوضات واکرا کر دیے جائیں، جن کے بدلے میں اتنی ہی تعداد کے کرناٹک کے قلعے سلطان کو دیے جائیں۔

۲۔ جزائر نما کے اطراف میں تمام انگریزی متبوضات مع ان ۵۵ ہزار گھوڑوں کے جو کرناٹک فکرنٹ نے پالاکھڑ میں حاصل کیے، واکرا کر دیے جائیں۔

۳۔ غلام زادہ ایاز خاں کو سلطان کے حوالے کیا جائے۔

۴۔ کمشنر اس وقت تک کرناٹک کی طرف واپس نہ جائیں جب تک ہر معاملہ پورے طور پر طے نہ ہو جائے۔

انگریز ان شرطوں میں سے ایاز خاں کی واپسی اور گھوڑوں کی واکرا داری ملنے پر تیار نہ تھے۔ صلح کی بات چیت نہ ہونے لگی تو کمشنروں نے منگلور سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا مگر راز فاش ہو گیا۔

آخر ۱۱ مارچ ۱۷۹۲ء کو معاہدہ طے پایا۔

معاہدہ کی ۹ شرطیں تھیں۔ جن کی رو سے:

فریقین ایک دوسرے سے جنگ نہ کریں گے۔

اور نہ ایک دوسرے کے دشمنوں کی مدد کریں گے۔

فریقین کے علاقوں کو واکرا دار قیدیوں کو واپس کر دیا جائے گا۔

آبنورا و رسات گڑھ کے قلعے سلطان کے پاس رہیں گے۔

کنا نورا ورڈنڈیگل کے قلعے اس وقت تک انگریزوں کے پاس

رہیں گے جب تک دوسری شرائط پوری نہیں ہو جائیں۔

اس صلح نامے میں منکھرام ایاز خاں اور ۵۵ ہزار گھوڑوں کی واپسی کا کوئی ذکر نہ تھا۔

اس کے بعد ہی گورنر اس سیکارٹی اور گورنر جنرل ملارڈ سسٹنگز کو انگلستان واپس بلا لیا گیا

اور میکفرسن قائم مقام گورنر جنرل کا کام کرنے لگا۔

معاہدہ منگلور سلطان کی ایک زبردست فتح تھی۔ اس لیے جب سلطان منگلور سے سرنگاپٹم پہنچا تو وہاں نظاما دکن اور پونا کے مرہٹہ پیشوا کے نمائندے اسے نذرین پیش کرنے اور مبارکباد

دینے کو حاضر تھے۔

دونوں ممالک کے نمائندوں کو سلطان نے ضلعین اور جواہرات عطا کیے لیکن مرہٹہ سردار نے

ساتھ ہی اپنا خراج طلب کر لیا۔

سلطان اس بے موقع مطالبہ پر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے مرہٹہ پیشوا کے نمائندے کو

تلخ لہجہ میں جواب دیا:

’کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ نواب مرحوم حیدر علی خاں نے تمہارے اکسانے پر پاٹیں گھاٹ کی

سیکڑی تھی جس میں سلطنت کا سارا خزانہ اور ممالک محروسہ کے تین سالہ عسول کی رقم بھی خرچ

ہو گئی تھی اور تم نے منصوبے اور معاہدے کے باوجود اس جنگ میں نواب مرحوم کا کوئی ساتھ

نہیں دیا تھا۔

اس کے بعد حیدرنگر کے احسان فراموش صوبیدار نے بھی دھوکہ دیا اور سلطنت کی تمام

دولت لے کر بھاگ گیا۔ ہم نے دشمن سے حیدرنگر تو واپس لے لیا مگر اس کے خزانے کا ایک

پیسہ بھی واپس نہیں مل سکا۔

پھر جب ہم تخت نشین ہوئے تو نواب مرحوم کی وراثت میں چند توپوں، بندوقوں، تلواروں

اور ڈھالوں کے سوا ہمیں کچھ بھی نہ ملا۔

اس وقت ہمارا خزانہ بالکل خالی ہے البتہ سلطنت کے بندوبست کے بعد ہماری رقم کی

ادائیگی کا حکم دے دیا جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی سلطان نے محمد عثمان کو جو نواب مرحوم کا قدیم ملازم تھا، چند تحفے دے کر
بولنا کے سفیر کے ساتھ روانہ کیا تاکہ مرہٹے دوبارہ میسور پر نہ چڑھ دوں۔

محاصرہ اور فتح حیدرنگر کے بعد ایک دردناک واقعہ پیش آیا جس کے ذکر ہی سے رد گھٹے
کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ واقعہ نواب مرحوم حیدر علی خاں کے دست راست، اور سلطان پٹنہ کے عظیم سردار
محمد علی کیدان کی خودکشی ہے۔

یورپی مؤرخین نے اپنی خواہش کا اس میں بھی ثبوت دیا ہے اور اس کی ماری ذمہ داری
سلطان پٹنہ پر ڈال دی ہے حالانکہ سلطان نے جو بھی قدم اٹھایا وہ اصول مملکت کے اعتبار سے
بالکل درست تھا۔

واقعہ یوں ہے کہ نواب بہادر حیدر علی خاں کے انتقال کے بعد مملکتِ ندوادی میسور میں ہر مسو
شورشیں اور بغاوتیں پھوٹ پڑیں جن کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس میں ایک بغاوت حیدرنگر کے گورنر
ایاز خاں کی تھی۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ایاز خاں ایک ہندو بچہ تھا جسے حیدر علی نے پالا تھا اور جوان ہونے
پر اپنا لے پاک بیٹا بنایا تھا۔

ایاز خاں کے دل میں کیا تھا، اس کا تو کسی کو علم نہیں لیکن بظاہر وہ نواب مرحوم کا بڑا وفادار
اور تابعدار دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ نواب مرحوم نے اسے حیدرنگر کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔

حیدرنگر جس کا پہلا نام بد نور تھا، اسے نواب نے ترقی دے کر ایک بڑے شہر میں تبدیل
کر دیا تھا اور یہ سرنگاپٹم کے بعد سلطنتِ خداداد کا سب سے بڑا شہر بن گیا تھا۔

ایاز خاں کے دل میں جو کچھ تھا وہ نواب بہادر کی وفات کے ساتھ ہی سامنے آ گیا اور اس
احسان فراموش اور نیک حرام نے سلطان پٹنہ کے خلاف بغاوت کر کے حیدرنگر کو انگریزوں کے
حوالے کرنے کے لیے سودے بازی شروع کر دی۔

ایاز خاں اگرچہ گورنر تھا مگر حیدرنگر کا قلعہ دار قاسم علی خاں تھا۔ اس کا یہ فرض تھا کہ جب

ایاز خاں کے قدم ہلکے تھے تو اسے سمجھاتا یا پھر سلطان کو اس کی خبر کرتا لیکن وہ خود اس سازش میں
شریک ہو گیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ انگریزوں نے قاسم علی خاں کو قلعہ دار کے ساتھ ساتھ نائب گورنر
بنانے کا لالچ بھی دیا تھا۔

بہر حال کچھ بھی ہو، قاسم علی خاں بھی اس بغاوت میں شریک ہوا اور حیدرنگر کا قلعہ جنگ
کے بغیر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔

پھر جب حیدرنگر فتح ہوا تو ایاز خاں جان بچا کر مدراںس بھاگ گیا اور قاسم علی خاں نے محمد علی
کیدان سے پناہ طلب کر اور اس کی پناہ میں آ گیا۔

قاسم علی خاں کے محمد علی کیدان کی پناہ میں آ جانے کی خبر جب سلطان کو پہنچی تو اس وقت وہ
خاموش زباہ اسے منگولہ پہنچنے کی بجائے لیکن جب منگولہ بھی فتح ہو گیا اور انگریزوں نے ہتھیار
ڈال دیے تو سلطان نے قاسم علی خاں کو سب کے سامنے بلایا اور اس سے باز پرس کی۔

سلطان کو قلعہ دار قاسم علی خاں کی غداری پر سخت غصہ تھا۔ اس نے بڑے ضبط سے
قاسم علی خاں سے سوال کیا:

"یہ بنا کہ قلعہ حیدرنگر میں غذا کے ذخائر، سامان جنگ، منظم فوج اور مدافعت کے تمام
سامان موجود ہونے کے باوجود تو نے قلعہ بغیر جنگ کے انگریزوں کے حوالے کیوں کر دیا؟"

قاسم کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ اس نے لرزتے آواز میں کہا:

"سلطان معظم — سلطان معظم — ایاز خاں نے سب کچھ —"

"جو اس مت کر۔"

سلطان نے اسے ڈیڑھ دیا:

"تو اس کا نام کیوں لیتا ہے۔ اس غلام زادے نے اپنی کم ظرفی کی بنا پر کفرانِ نعمت اور
بغاوت کی راہ اختیار کی لیکن تو تو شریف زادہ تھا۔ تو نے اپنے ناموس پر کیوں بٹے لگا دیے اور
اتنے مضبوط قلعے کی پاس بانی کے فرائض سے کیوں منہ موڑا؟"

"سلطان معظم۔"

قاسم علی خاں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی:

"بلاشبہ قلعہ میں سامان جنگ، آلات حرب اور رسد کے تمام ذخائر موجود تھے لیکن ایاز خاں کے

تا کہ میں حکم سلطان کے تحت اسے دار پر چڑھاؤں مگر سردار کیدان نے میری درخواست کے جواب میں کہا کہ قائم علی خاں ان کی پناہ میں ہے اور بہتر ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے ورنہ اسے دار پر چڑھانے سے پہلے انہیں پھانسی دینا ہوگی۔

سلطان نے قتل اور جرد باری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قائم کی پھانسی اُس دن کے لیے منسوخ کر دی اور محمد علی کیدان کو ننہانی میں طلب کر لیا۔

”سردار محمد علی کیدان! آپ کو معلوم ہے کہ قائم علی خاں سلطنت کا مجرم ہے اور اسے پھانسی کا حکم دیا جا چکا ہے اس لیے قانون اور حکومت کا دقار برقرار رکھنے کے لیے اسے پھانسی دینا لازمی ہے۔“

سردار محمد علی کیدان نے سلطان کو کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں گمراہوں سے اٹھا اور بغیر سلام کے واپس آ گیا۔

سلطان کو اس کا یہ رویہ ہنسک آ میر اور ناگوار گزرا مگر اس نے پھر بھی قتل کا دامن نہ چھوڑا اور اس کی سابقہ کارگزاریوں اور وفاداریوں کی وجہ سے خاموش ہو رہا۔

دوسرے دن سپاہیوں نے قائم علی خاں کو سردار کیدان سے حاصل کر لیا اور اسے دار پر چڑھانے کے لیے قتل کی طرف لے چلے۔

ابھی وہ قتل میں پہنچے ہی نہ تھے کہ سردار کیدان ہاتھ پر سوار وہاں پہنچ گیا۔ اس نے قائم کو سپاہیوں سے چھین کر اپنے ساتھ ہاتھ پر بٹھا لیا۔

اس قانون شکن اور ناروا حرکت کے ساتھ ہی اس نے مجمع کی طرف دیکھا جو قائم کی پھانسی کا تماشا دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھا اور جیج کر کہا:

”جو شخص میرے ساتھ آنا چاہے بے خوف و خطر آجائے۔“

مقتل میں عوام کے علاوہ بڑی تعداد میں فوجی دستے موجود تھے۔ ان میں کچھ لشکری ایسے بھی تھے جو سردار کیدان کی کمان میں جنگ کر چکے تھے اور اس کی سپہ گری کے قائل تھے۔

چنانچہ اس کی آواز پر دو تین سو آدمی اس کے ساتھ ہو لیے۔

اب اس کا رخ سرنگا پٹم کی طرف تھا۔ اس کے ارادے کیا تھے؟ اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ مگر بظاہر یہ کھلی ہوئی بغاوت تھی۔

محمد علی کیدان کے اس اقدام کی خبر فوراً سلطان کو پہنچائی گئی۔

اشارے پر نائیکوں نے میرے حکم سے سرتابی کی اور بغیر میری اجازت کے دشمنوں سے ملازمت کر کے انہیں قلعہ میں داخل ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس لیے میں مجبور ہو گیا کہ میں قلعہ سے نکل کر حصوہ تک کیسے پہنچ سکتا تھا؟

یہ سب سراسر جھوٹ تھا اور قائم علی خاں کی مکاری تھی۔ اس نے ایاز خاں کی بغاوت کی نہ صرف حمایت کی تھی بلکہ سلطانی فوجوں کے خلاف جنگ میں بھرپور حصہ لیا تھا۔

سلطان نے اس کے عذر پر اس سے دہرا سوال کیا:

”اگر تیرا یہ کہنا درست ہے کہ تیرے ماتحتوں نے تیرا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا، تو تو نے اس کی خبر سلطان یا سلطانی لشکر کو کیوں نہیں بھجوائی؟ تیرے خود آنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو یہ خبر کسی بھی خبر کے ہاتھ پہنچ سکتا تھا۔ اس سے ثابت ہو تا ہے کہ تو نے غداری کی تھی اور اب تو جان بچانے کے بہانے تراش رہا ہے۔“

قائم کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا!

سلطان نے اس سلسلے میں اراکین سلطنت سے مشورہ طلب کیا اور سب نے یک زبان ہو کر اس غداری گردن مار دینے کا مشورہ دیا۔

چنانچہ سلطان نے اس کے لیے پھانسی کا حکم دے دیا۔

دوسرے دن بخشی زین العابدین کو حکم پہنچا کہ وہ عدار قائم علی خاں کو پھانسی پر چڑھا دے، شاہی حکم کے تحت زین العابدین خاں محمد علی کیدان کے پاس گیا اور کہا:

”سردار مجرم! مجھے حکم پہنچا ہے کہ میں قائم علی خاں کو پھانسی پر چڑھا دوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ قائم خاں کو میرے حوالے کر دیں تاکہ میں شاہی حکم کی تعمیل کر سکوں۔“

محمد علی کیدان نے سر اٹھا کر بخشی زین العابدین کو دیکھا اور لاپرواہی سے جواب دیا:

”بخشی! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ قائم میری پناہ میں ہے۔ بہتر ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے ورنہ اسے پھانسی پر چڑھانے سے پہلے مجھے پھانسی لگانا ہوگی۔“

بخشی، محمد علی کیدان کے مرتبہ سے واقف تھا اس لیے اس نے بحث نہ کی اور نہ ہی قائم کو زبردستی اس سے چھیننے کی کوشش کی بلکہ وہ وہاں سے خاموشی کے ساتھ اٹھا اور سیدہ حضور سلطان میں حاضر ہوا۔

”مالی باہ! میں نے سردار محمد علی کیدان سے کہہ دیا ہے کہ قائم علی خاں کو میرے حوالے کر دیکھ

موت کی مزا اور کچھ کے ناک بان کاٹنے کا حکم ہوا۔
 سزا پانے والوں نے اس کا مورد الزام محمد علی کیدان کو ٹھہرایا۔ وہ چیخ چیخ کے پکارنے لگے کہ:
 اے خانہ خراب ہم تیری وجہ سے برباد ہو گئے۔ تیری ہمدردی میں ہمارے ناک بان کاٹے گئے اور تجھے صرف نظر بندی کی سزا ملی۔ خدا تیرا بیڑہ غرق کرے۔
 محمد علی کیدان اپنے ساتھیوں کی آہ و زاری سے بہت پریشان، شرمندہ اور لاشمان تھا۔ اسے ایک مکان میں نظر بند کر دیا گیا۔

اور—
 اس نے پہلی ہی رات کو اماں کی کئی چاٹ کے اپنی زندگی ختم کر لی۔ اماں اس کی انگوٹھی میں لگنے کی جگہ جڑھا اٹھا۔
 ایک اور بیان میں کہا گیا ہے کہ محمد علی کیدان نے قید خانے میں اپنی زبان باہر کھینچ کے جان دیدی تھی۔

سلطان کو جب محمد علی کیدان کی خود کشی کی خبر ملی تو اُسے افسوس ہوا۔
 محمد علی کیدان بہت خوبیوں کا مالک تھا۔ وہ ایک بہترین شہسوار، شمشیر زن اور سالار فوج تھا۔ اس نے بڑے بڑے موتوں پر اپنی ذہانت سے دشمنوں کو شکست سے دوچار کیا تھا۔
 ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی فضا اور غریب پروری سب سے اہم خوبی تھی۔ اس دستر خوان پر دونوں وقت دس بیس فقرا ضرور موجود ہوتے تھے۔

محمد علی کیدان کی سخاوت اور دیادلی کا یہ حال تھا کہ اسے تنخواہ اور تنخواہ کے علاوہ جو کچھ انعام میں حاصل ہوتا وہ تمام اپنے سپاہیوں یا فقیروں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر شاہی خزانہ بھی کہیں اس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ بھی اس کی دریادلی اور سخاوت کی سینٹ چرچا جاتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک انسان، ایک بندہ بشر بھی تھا۔ اس میں خوبیوں کے ساتھ کچھ عیوب بھی تھے۔
 اس نے اپنے گھر پر کبھی توجہ نہیں دی۔ خود سری اور ضد کا یہ عالم تھا کہ ایک بار نواب مرحوم

شاہ اسرار محمد علی کیدان نے مقتل میں پہنچ کے قاسم کو زبردستی سپاہیوں سے چھین لیا ہے اور اب وہ اسے اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھائے سرنگا پیٹ کی طرف جا رہا ہے۔ اس نے درگلا کر دو تین سو سپاہیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور وہ اس کے جلو میں رواں دواں ہیں۔

سلطان کے چہرے پر گہری شکنیں ابھر آئیں اور اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ وہاں تقریباً سب ہی مردار موجود تھے۔
 سلطان نے غصے سے کانپتے ہوئے حکم دیا،

”غازی خاں! تم اور سید حمید ان کے پیچھے جاؤ اور جس طرح بھی ہوا انہیں واپس لے کے آؤ۔“

سلطان کا حکم پاتے ہی غازی خاں اور سید حمید دربار سے اٹھے اور چند دستے ساتھ لیکر تیزی سے محمد علی کیدان کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔
 سردار کیدان مشکل سے چار کوس پہنچا تھا کہ غازی خاں آندھی اور طوفان کی طرح اس کے سر پر پہنچ گیا۔

اس نے اپنا گھوڑا ہاتھی کے سامنے روکا اور بولا:
 ”سردار محمد علی کیدان! حکم سلطان ہے کہ میں آپ کو آپ کے ان حواریں سمیت ہر صورت میں واپس لے جاؤں۔ آپ واپس چلنے کو تیار ہیں یا نہیں حافظہ استعمال کروں؟“
 اس وقت محمد علی کیدان کا دماغ شاید ٹھکانے تھا۔ اس نے فیضان کو ہاتھی واپس موڑنے کا حکم دیا۔ غازی خاں کے دستوں نے ان لوگوں کے گرد گھیر ڈال دیا۔
 ہاتھی واپس ہوا تو باغی دستے بھی اس کے ساتھ ہی واپس چلنے لگے۔ غازی خاں ان سب کو حراست میں لیے ہوئے سلطان کے حضور پہنچا۔

سلطان کی نظر سب سے پہلے قاسم پر پڑی۔ اس نے فوراً حکم دیا:
 ”اس نڈاری گردن اڑا دی جائے۔“
 جلا دیکیں قریب ہی موجود تھا۔ اس نے سلطان کے حکم کی فوراً تعمیل کی اور عجب مہم اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔
 پھر سلطان نے محمد علی کیدان کو نظر بند کرنے کا حکم دیا اور باغی سپاہیوں میں سے کچھ کو

نے اسے اسی خود سری کی بنا پر معزول کر دیا تھا اور اب اسی نندا اور خود سری نے اس کی جان لے لی تھی۔

سناوت کی انتہا یہ تھی کہ مرنے کے بعد اس کے گھر سے ایک ٹوٹی اور چنڈ پڑنے کیڑوں کا علاوہ اور کچھ نہ نکلا۔ اور اس کی بیوہ کو مادر ملکہ نے اپنے سایہِ مافیت میں لے کر اس کے گمراہ اوقات کا بندہ و بست کیا۔



یہ عجیب بات تھی کہ سلطان شیو کو، سلطان بنے پندرہ ماہ ہو چکے تھے اور اُسے اب ہمہ دار السلطنت کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا۔ آخر فتح منگلور کے بعد سلطان نے منرنگاپٹم کا رخ کیا۔

راستے میں مختلف بناؤں کو فرو کرنے کے لیے بل اور کورگ کی طرف لشکر روانہ کیے اور کچھ سرکشوں کی گوشمالی کرتا ہوا سلطان عین موسم گرما میں منرنگاپٹم میں وارد ہوا۔ سلطان کے ورود پر عائدین سلطنت نے اس کا پُر جوش استقبال کیا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ سلطان دار السلطنت میں بحیثیت سلطان کے تحت سلطنت پر متمکن ہوا تھا۔ اس کی آمد پر شاہی عملات میں چراغاں کیا گیا۔ ہندو راج محلوں میں بھی دکھاوے کا اظہار خوشی کیا گیا۔ راج ماما لکشم اور رانی دیواجی مئی نے سلطان کو نذرین بھیجے۔

سلطان نے فوراً انتظام سلطنت پر توجہ دی۔ عامل سلطنت کو ذرا مین بھیجے گئے اور سلطنت نندا دے کو شوارے مرتب کیے گئے۔

ان گوشواروں کی رو سے مندرجہ ذیل صورتحال سامنے آئی:

- ۱۔ شاہی خزانے میں کل اسی کروڑ روپے کے ہیرے جواہرات موجود تھے۔
- ۲۔ جانوروں میں ۹۰۰ ہاتھی، ۶۰۰ اونٹ، ۶۰ ہزار گھوڑے، ۴ لاکھ گائیں، ۶۰ لاکھ بھیڑیں بکریاں اور دیگر ساز و سامان تھا۔

- ۲- سلطنت خداداد کی وسعت ۸۰ ہزار مربع میل تھی جس میں ساحل مالابار کے ایک ہزار جزیرے بھی شامل تھے۔
- ۴- سالانہ خراج ۲ کروڑ روپے تھا۔
- ۵- آبادی ۶۰ لاکھ افراد پر مشتمل تھی۔

سلطان نے سب سے زیادہ توجہ عسکری نظام پر دی اور اپنی اصلاحات اور اختراعات کو فتح الجاہدین کے نام سے مرتب کرایا۔ یہ کتاب میرزین العابدین شومتری کے نام سے مشہور ہے جس کا تعلق ایران کے علاقہ شومتر سے تھا۔ وہ حیدر آباد کن کے وزیر میر عالم کا چھوٹا بھائی تھا اور یٹو سلطان کی خدمت میں عرصہ سے چلا آ رہا تھا۔

سلطان نے اپنے فوجی نظام کو مندرجہ ذیل خطوط پر استوار کیا:

- ۱- فوج کا سپہ سالار سلطان خود ہوتا تھا۔
- ۲- اس کے ماتحت ۲۲ سالار ہوتے تھے جن میں سے گیارہ مرن مرزا کا پٹم میں رہتے تھے۔
- ۳- ہر سالار کے تحت بیس سے تیس ہک مردار ہوتے تھے۔
- ۴- سلطان کی کل فوج ۳ لاکھ ۲۰ ہزار تھی جو مختلف قلعوں اور سرحدی جگہوں میں موجود رہتی تھی۔
- ۵- فوج کے پاس ۹۰۰ ہاتھی، ۶ سوانٹ، ۲۰ ہزار گھوڑے، ۲۱ لاکھ بیل، ۳ لاکھ توڑے دار بندوقیں، ۳ لاکھ چھماق دار بندوقیں، ۲ لاکھ ۲۲ ہزار تلواریں اور ۹۲۹ توپیں مع گولہ بارود کے موجود تھیں۔
- ۶- سلطانی فوج ۵ ہزار ڈویژن پر مشتمل تھی۔
- ۷- ہر ڈویژن میں ۲۷ رجمنٹیں (قشون) ہوتی تھیں۔
- ۸- ہر رجمنٹ (قشون) میں چار سالے پیادوں کے اور ایک رسالہ سواروں کا ہوتا تھا۔
- ۹- ہر سالہ میں ۱۳۹۲ سپاہی ہوتے جن میں ۱۰۵۶ بندوقی اور ایک توپ خانہ ہوتا تھا۔

- ۱۰- ہر توپ خانے میں ۲۸ توپچی ہوتے تھے۔
- ۱۱- سو سپاہیوں کو "جوق" کا نام دیا گیا۔
- ۱۲- ایک جوق میں دو مرخیل (چوڑے سردار) دس جمدار اور دس دفدار ہوتے تھے۔
- ۱۳- سواروں کے دستے کو "عسکر" کہتے تھے جن میں ۳۰۰ سواروں کو ٹیپ کہا جاتا تھا۔
- ۱۴- رسالہ کا سردار رسالدار اور جوق کا سردار جوقدار کہلاتا تھا۔
- ۱۵- ہر سالے میں چار ٹیپیں ہوتی تھیں اور ٹیپ کا سردار ٹیپ دار کہلاتا تھا۔
- ۱۶- عسکر کے نقیب کو شرباشون (انگریزی دا جینین) کہا جاتا اور قشون اور رسالہ کے نقیب کو سیاقچی کہا گیا تھا۔

سلطان ایک خالص اسلامی فوج ترتیب دینا چاہتا تھا اس لیے فتح الجاہدین کے پہلے باب میں عقائد، نماز، تہذیب کو نوشی، غدار، انہک حرامی ترکہ، وراثت اور جہاد وغیرہ کے مسائل بیان کیے گئے تھے۔ آخری باب میں مرکاز امداد الفوج کے لیے فوجی ترانے، رد و فارسی اشتعار، مختلف جانوروں کے کشتے اور ان کے زہروں کا علاج درج کیا گیا ہے۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان نے منگلور سے مرزا کا پٹم روانگی کے دوران بعض ملاؤں پر فوج کشی کے لیے لشکر روانہ کیے تھے۔ ان میں ایک لشکر پنڈور اور دن ہلی کی طرف بھی گیا تھا۔

اس لشکر میں سید غفار، امام خاں اور سید عمر شامل تھے۔ دوسری مہم زکندہ کی مرکز کوئی کوروانہ کی گئی تھی۔ سلطان کے ان دونوں لشکروں نے ماطرخواہ کامیابی حاصل کی۔

سلطان کی تیسری مہم "کورگ" کے خلاف تھی۔ یہ بڑی اہم مہم تھی۔ یہاں کے لوگ ہمیشہ سے ہی بغاوتیں کرتے رہتے تھے۔ نواب حیدر علی خاں مرحوم کے زمانے میں بھی یہاں کئی بغاوتیں ہوئی تھیں۔ اب سلطان ٹیپو نے بہ نفس نفیس اس مہم پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور بارہ ہزار یادہ، دس ہزار سوار اور بائیس ضرب توپ لے کر نکلا۔

سلطان جب کوگ کی سرحد پر پہنچا تو اس نے سواروں کو پرہیز کیا، سدا پورا اور منظر آباد پر حملہ کا حکم دیا اور خود بیادہ فوج کے ساتھ اندرون ملک بڑھا۔ سلطان کا مقابلہ رن منڈل پر ہوا۔ سلطان لشکر فرانسسیسی سالار موسیہ لائی کے زیرِ کمان قلعہ پر حملہ آور ہوا اور ایک سخت مقابلہ کے بعد ملن ہلی اور خوشمال پور پر سلطان کا قبضہ ہو گیا۔

باغیوں نے میدان میں مقابلے کے بجائے گھنے جنگلوں میں پناہ لے لی اور وہاں سے سلطانی لشکر پر شب خون مارنے کا سلسلہ جاری کیا۔

سلطان ایسے حالات سے نواب مرحوم کی زندگی میں گزر چکا تھا۔ اس نے فوراً جنگل کاٹنے کا حکم دیدیا۔ پھر باغیوں کے مقابلہ کے لیے حسین علی خاں بختی ناٹھ، میر محمد امام خاں اور موسیولائی کو روانہ کیا۔

سلطان آٹھ ماہ تک کوگ میں مقیم رہا۔ اس عرصہ میں پورا کوگ از سر نو تسخیر ہوا۔ میر حسین خاں بختی نے یہاں بڑی ناموری پیدا کی اور اس کا نام "بنی نواب" پڑ گیا۔ بنی کے معنی آگ کے ہوتے ہیں یعنی "آگ کا نواب"۔

ایک انداز سے کے مطابق اس جنگ میں انتہی ہزار مرد اور عورتیں گرفتار ہوئے۔ ان میں ان کے دوسرا عموٹی ناٹھ اور دونوں کا اثر بھی شامل تھے۔

سلطان نے گرفتار ہونے والوں کے سامنے اسلام پیش کیا اور ان لوگوں نے قبول کر لیا چنانچہ سلطان نے ان نو مسلموں کی باقاعدہ ایک الگ فوج بنائی جس کا نام "جماعت احمدی" رکھا گیا۔ یہ فوج بالکل اُس طرح کی تھی جس طرح سلطان ترک نے "بنی چری" فوج بنائی تھی۔

کوگ کی زمین قیمتی لکڑی، بے شمار پھل، پھول اور لہجیوں سے بھری پڑی تھی۔ یہاں کی عورتیں بہت خوبصورت تھیں جنہیں دیویاں یا پریاں کہا جاتا تھا۔ ان کے جسم پر بہت مختصر لباس ہوتا تھا۔ یہاں کے مردوں میں قوت مردی کی کمی ہوتی تھی چنانچہ ایک عورت سے چار چار مرد شادی کرتے تھے اور ان کی اولاد مشترک کھلاتی تھی۔

جس زمانے میں سلطان وہاں ٹھہرا ہوا تھا تو اس کے سامنے ایک بہت دلچسپ مقدمہ

پیش ہوا۔

اس کے سامنے چار مردوں اور ایک عورت کو لایا گیا۔ وہ سب آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ سلطان نے جھگڑے کی نوعیت پوچھی تو اسے بتایا گیا کہ: "یہ چاروں اس عورت کے شوہر ہیں۔" سلطان اس پر چونکا اور اس نے وضاحت طلب کی۔

ایک ترجمان نے بتایا:

"عالی جاہ۔ اس علاقے کے مردوں میں قوت مردی کی اس قدر کمی ہے کہ چار چار مرد صرف ایک عورت سے شادی کرتے ہیں اور ان کی جو اولاد ہوتی ہے وہ چاروں باپوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔"

سلطان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس نے لشکر کے قاضی کو بلوایا اور ان سے دریافت کیا: "کیا ایک عورت سے بہ یک وقت چار مرد شادی کر سکتے ہیں؟"

قاضی نے جواب دیا:

"عالی جاہ۔ اسلام میں جس طرح ایک مرد کو بعض تعظیلات کے ساتھ یک وقت چار عورتوں سے شادی کی اجازت ہے۔ اسی طرح اس علاقے میں رواج ہے کہ ایک عورت چار بھائیوں کے ساتھ شادی کر سکتی ہے اور باری باری سے ایک ایک رات ہر مرد کے ساتھ گزار سکتی ہے۔ اس رواج کو یہاں محبوب نہیں سمجھا جاسکتا اس لیے کہ ایسا کرنا ان کی ضرورت ہے۔"

سلطان کے دریافت کرنے پر قاضی نے مزید وضاحت کی:

"یہاں کے مردوں میں قوت مردی کی بہت کمی ہے بلکہ اکثر مرد بالکل نامرد پیدا ہوتے ہیں اس لیے ایک عورت کو چار مردوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اسے چاروں مردوں کے ساتھ رہنے کی اجازت ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہاں کے لوگ عام طور پر ناجائز اولاد ہیں۔ ہم اس حرام کاری کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتے۔ یہ رسم آج سے متروک کی جاتی ہے۔"

سلطان کے اس اعلان کے بعد اصل جھگڑا پیش ہوا۔

ان چار مردوں میں اختلاف یہ تھا کہ ان کی مشترکہ بیوی کے چار بچے پیدا ہوئے تھے۔

اس لیے وہاں کے دستور کے مطابق ہر مرد ایک بچے کا باپ تھا لیکن چاروں میں سے ایک مرد کو دعویٰ تھا کہ اُن چاروں مردوں میں سے صرف وہی ایک مرد ہے اور چاروں بچوں پر صرف اس کا حق ہے۔

اس مسئلے میں جب عورت کا بیان کیا گیا تو اس نے اس بات کی تصدیق کی کہ ان چاروں میں سے واقعی صرف ایک مرد میں قوت مردی ہے باقی سب اس طاقت سے محروم ہیں۔

اس بیان کی روشنی میں قاضی نے فیصلہ دیا کہ چاروں بچے اس مرد کو دے دیے جائیں جو عورت کے بیان کے مطابق مرد تھا۔

مگر عورت نے قاضی کے اس فیصلے کی شدید مخالفت کی۔ قاضی نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے وجہ بتانے سے انکار کر دیا۔

اب یہ مقدمہ سلطان کے سامنے رکھا گیا۔

سلطان کو اگرچہ اس مقدمے سے نفرت سی ہو رہی تھی لیکن سلطان ہونے کی حیثیت سے اسے کچھ نہ کچھ فیصلہ تو کرنا ہی تھا۔

سلطان نے بھی عورت سے کئی سوال کیے۔ اس نے تمام سوالوں کے جواب دیے لیکن اپنی مخالفت کی وجہ بتانے سے انکار کرتی رہی۔

آخر سلطان نے ایک ایسا فیصلہ کیا کہ سب کی عقل دنگ رہ گئی۔

سلطان نے حکم دیا:

”چاروں بچوں کو پیش کیا جائے۔“

بچے پیش کیے گئے تو سلطان نے جلد کو بلوا کر حکم دیا:

”چاروں بچوں کو ان کی ماں کے سامنے قتل کر دیا جائے۔“

یہ حکم سنتے ہی عورت دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور دہائیاں دینے لگی۔ اس نے ہاتھ بھڑکے قاضی سے التجائی کہ وہ سلطان سے قتل کا حکم واپس لینے کے لیے کہے۔ میں اصل وجہ بتانے پر تیار ہوں۔

سلطان نے دراصل عورت کی زبان کھلوانے کے لیے ہی یہ حکم دیا تھا۔ سلطان کے حکم واپس لینے پر عورت نے قاضی کو بتایا کہ:

”جب مجھے معلوم ہوا کہ میرے چار میں سے تین شوہر ناکارہ ہیں اور صرف ایک شوہر میرے

پورے حقوقِ زوجیت ادا کرنے میں ناکام ہے تو مجھے مجبوراً تین اور مردوں سے تعلقات پیدا کرنے پڑے۔ اس لیے ایک بچہ میرے اس شوہر کو دیا جائے اور باقی تین اُس مردوں کو دیے جائیں جو خفیہ طور پر میرے پاس رہتے تھے۔“

قاضی نے یہ تفصیل سلطان کو بتائی تو اسے اس بات پر اور زیادہ گھن آئی۔ اس نے حکم صادر کیا:

”اس علاقے میں حرام کاری درحرام کاری کی جو رسم جاری ہے وہ فوراً غصہ خ کی جاتی ہے۔ یہاں کے تمام بچوں کی پرورش شاہی نگہداشت میں ہوگی۔“

چنانچہ تمام بچوں کو شاہی پرورش میں دے دیا گیا۔ اس سے ان لوگوں میں سے اسی فیصد سے زیادہ مسلمان ہو گئے اور اس حرام کاری سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔

سلطان کے فوجی نظام کا ذکر کیا جا چکا ہے لیکن قارئین کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ سلطان پشاور صغیر کا پہلا حکمران تھا جس نے ملک میں جمہوری نظام رائج کیا۔

اس نے تمام اختیارات و زرا کی کینٹ کو سونپ دیے اور خود آئینی مربراہ کی حیثیت اختیار کر لی مگر انھوں نے کہ ہندوستانیوں کو جمہوری طریقہ حکومت پسند نہ آیا اور لوگوں نے اسے سلطان کی کمزوری تصور کرتے ہوئے ملک و ملت سے غلامی شروع کر دی۔

سلطان نے جو کینٹ بنائی اس کا نام صدر الصدور رکھا۔

اس کینٹ (کابینہ) میں اٹھارہ وزیر ہوتے تھے۔ وہ سب ایک عمارت میں بیٹھتے تھے جسے اٹھارہ کچری کہا جاتا تھا۔

حکومت کے محکمے باب حکومت کہلاتے۔

ہر محکمہ کا ایک سیکرٹری ہوتا جو میر آصف کہلاتا۔

سلطان نے سب سے پہلے پاسپورٹ رائج کیا۔

سلطنت خداداد کے سات صوبے تھے۔ انہیں بڑھاکر نو، پھر سترہ کر دیا گیا۔

ہر صوبہ میں بیس سے تیس تنگ اضلاع ہوتے تھے۔

ہر ضلع کے دو حاکم ہوتے۔

سول کا حاکم آصف، فوج کا فوجدار ہوتا۔ ہر ضلع پر ایک عامل مقرر ہوتا جس کے ماتحت ۳ عمر، ایک سررشتہ دار، ہم تحصیلدار ہوتے تھے۔

ہر شہر اور ہر موضع میں عدل و انصاف کے لیے پنچایت مقرر تھی۔ رسل و رسا کے لیے حکمہ ڈاک قائم تھا۔ ملازمین کو نقد تنخواہ ملتی۔

ملازمین کے لیے پیشن کی سہولت موجود تھی۔

آب پاشی کے لیے دریاؤں پر بند باندھ کر تالاب بنائے گئے اور نہریں نکالی گئی تھیں۔ ٹکسال ذواب مرحوم کے زمانے میں قائم ہو چکے تھے۔ سلطان نے ان میں اضافہ کیا مگر جو سکہ ڈھالا جاتا اس پر سلطان کی تصویر بنانے کی ممانعت تھی۔

تجارت اور عوام کی سہولت کے لیے ہندوستان میں سب سے پہلے سلطان پیپونے بنکر قائم کیے۔ ہر جگہ سرکاری دکانیں تھیں جو امداد باہمی کے اصولوں پر چلتی تھیں (آج کل کے پوسٹی سٹور ان کی نقل ہیں)۔

چاندی کا سکہ سب سے پہلے سلطان نے جنوبی ہند میں ڈھلوا یا۔ دو روپے کے سکے کو "نقرئی حیدری" کا نام دیا گیا۔ سلطان روپیہ کو "امالی" کہا جاتا۔

نصف روپیہ "عابدی" یعنی حضرت زین العابدینؑ کے نام پر تھا۔

پاؤ روپیہ "باقری"، حضرت باقرؑ کے نام پر تھا۔ اسی طرح ۱/۲ روپیہ یعنی دوئی کو حضرت امام جعفر کے نام پر "جعفری" کہتے تھے۔ ایک آنے کو کاظمی اور ٹکے کو خضریٰ کہا جاتا تھا۔

سکہ کے ایک طرف ہجری سن اور ٹکسال کا نام فارسی میں لکھا جاتا۔ دوسری طرف سلطان کی صفات عدل اور سال مدت جلوس کندہ ہوتا۔ تاج کے چھوٹے سکوں کو بھی سلطان نے رواج دیا۔

غلاموں اور کینیزوں کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی گئی۔

انسانوں کی قربانی بند کی گئی۔

مندروں اور مسجدوں پر ٹیکس ختم کیا گیا۔

تمام مسافر خانے جن میں قیام اور طعام دونوں کا انتظام ہوتا، سرکاری خرچ پر چلتے تھے۔

مندروں میں لڑکیوں کو خدمت کے لیے دیا جاتا مگر وہ غمناشی اور عیاشی کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ سلطان نے مندروں میں لڑکیوں (داسیوں) کا داخلہ بند کر دیا۔

شراب، گانجے اور اخیوں کی دکانیں ختم کر دی گئیں۔

سلطان نے مردم شماری اور خانہ شماری جاری کی۔

ہندو مسافروں کا انتظام ہندو برہمن کرتے۔ وہاں مفت رہائش کے علاوہ مسافروں کی تواضع و دودھ، دہی اور مکھن سے کی جاتی۔

مندر کے بہاریوں اور برہمنوں پر ٹیکس پہلے ہی معاف تھا۔ سلطان نے قاضیوں اور اسلحہ فروش مسلمانوں کو بھی ٹیکس سے آزاد کر دیا۔

مندروں، مسجدوں اور درگاہوں کی جاگیر مقرر کی۔

مندروں کو سالانہ ۵۹۲۱۲۹ کنٹی رائے پگڑے (جنوبی ہند کا سکہ) کی رقم دی جاتی تھی جبکہ مسجدوں کو صرف ۲۰ ہزار پگڑے اور درگاہوں کو ۵۰۰ پگڑے ملتے تھے۔ ان کے علاوہ انعامات، پیشن اور اعزازات الگ تھے۔

سلطنت خدا داد میسر کے سلطان پیپو کی فوجی اور سول انتظامیہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے یہ فغول دردِ سری نہیں ہے بلکہ آپ اسے پڑھیے اور تعجب کیجیے کہ آج کا ہمارا فوجی اور سول تمام کا تمام نظام اب سے دو سو سال پہلے سلطان پیپونے رائج کیا تھا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان صرف ایک اعلیٰ درجے کا فوجی جرنیل ہی نہ تھا بلکہ ایک نہایت اعلیٰ دماغ کا مالک، بیدار مغز حکمران بھی تھا جسے مسلمانوں کے علاوہ اپنی ہندو رعایا نے مذاہت کا بھی پورا پورا خیال رہتا تھا۔

لیکن —

کسی قدر افسوس ناک بات ہے کہ اس نابغہ روزگار سلطان کو مفاد پرستوں اور غداروں نے ایک دن بھی چین نہ لینے دیا۔

ان مفاد پرستوں میں سب سے آگے ایٹ انڈیا کمپنی کے بددیانت انگریز ہیں جنہوں نے تجارت کا فریب دے کر ہندوستان پر قبضہ کیا اور جنوبی ہند میں سلطان کے خلاف حربوں، نظام دکن، میسور کے ہندوؤں اور قوم ناٹھ کے خود فریب مذہبی ٹھیکیداروں نے انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دے کر ہمیشہ کے لیے اپنے ناک پر بٹہ لگالیا۔

ان لوگوں کے علاوہ جنوبی ہند میں مسلمانوں کے ایک فرقے نے جو اہل ناٹھ کے نام سے مشہور تھا، اس نے بھی سلطان کو بچا دکھانے میں انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔

اہل ناٹھ کو سلطان کے خاندان سے مرحوم نواب بہادر کے زمانہ سے ہی عداوت اور دشمنی تھی لیکن نواب مرحوم نے اہل ناٹھ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور نہ سلطان ٹیپو نے ان کی مخالفت کا تصور کیا۔ چنانچہ سلطان کے زمانے میں بدرا زمان ناٹھ، میسور کے سرنگاپٹم کے بعد سب سے بڑے اور اہم صوبے حیدرنگو کا گورنر تھا۔

اہل ناٹھ کے بارے میں مشہور سیاح ابن بطوطہ نے لکھا ہے:

”جب مسلمان ہندوستان میں آئے اور انہیں مروج حاصل ہوا اور دارالسلطنت دہلی پر ان کا قبضہ ہو گیا تو ان کی سخاوت اور قدروانی کے چرچے حدود بھارت سے نکل کر ایران، عراق اور عرب تک پہنچے جس کے نتیجے میں ایرانی، عراقی اور عربی بھوک درجہ ہندوستان میں وارد ہونا شروع ہوئے۔“

آنے والوں میں عربوں کی تعداد زیادہ تھی اور ہندوستانی مسلمان عربوں کو اس لیے قابل احترام سمجھتے تھے کہ ان کا تعلق دیار حبیب یعنی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وطن سے تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلم بادشاہوں اور حکمرانوں نے شمالی و جنوبی ہند میں اسی احترام کے پیش نظر اپنی حکومتوں میں مذہبی عہدے ان لوگوں کو دینا شروع کر دیے۔ پھر ایک رسم سی ہو گئی کہ تمام مذہبی عہدے ان لوگوں کے لیے مخصوص ہو گئے۔

یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ یہ لوگ اپنی دینداری اور مذہبی علمیت میں دوسرے مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ نمایاں ہوتے تھے مگر انہیں (جو اب ناٹھ کے نام سے مشہور تھے) یہ زعم اور غلط فہمی ہو گئی کہ وہ اپنے نسب کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں سے افضل اور برتر ہیں۔

یہ ایک بڑا غلط خیال تھا اس لیے کہ جس نسب پر وہ ناز کرتے تھے اس نسب کے سردار، سرکارِ دہلیام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود رنگ و نسل کی تفریق کو مٹانے ہوئے صاف اور واضح الفاظ میں اعلان فرما دیا تھا کہ نہ گورے کو کالے پر اور نہ عربی کو عجمی پر کسی طرح کی فوقیت ہوگی، سوائے اس کے کہ وہ زیادہ متقی ہو۔“

فوقیت اور افضلیت کا یہ مانہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف تقویٰ کو قرار دیا تھا مگر اہل ناٹھ اپنے عرب ہونے پر اس قدر مغرور ہو گئے تھے کہ باقی تمام قوموں کو وہ اپنے سے حقیر سمجھتے اور انہیں اپنی بیٹی نہ دیتے تھے۔

چنانچہ نواب مرحوم کے زمانے میں بھی اہل ناٹھ اور نواب بہادر مرحوم کے خاندان میں یہ اختلاف پیدا ہوا تھا۔

نواب مرحوم نے امام صاحب بخش ناٹھ کی بیٹی کو اپنے بیٹے شہزادہ ٹیپو کے لیے منتخب کیا تھا لیکن خاندان ناٹھ نے اس رشتہ کو نہایت غیر مناسب اور بے جوڑ خیال کیا۔ ان کے نزدیک والی میسور حیدر علی خاں کی ذات، اہل ناٹھ سے کمتر تھی۔

امام صاحب بخش ناٹھ رشتہ دینے سے تو انکار نہ کر سکے مگر شادی کے بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ خود اور ان کے خاندان کے تمام لوگ اس رشتہ کے مخالف تھے۔

سلطان ٹیپو جو اسی وقت ایک متعلی المراج شہزادے تھے، شادی کے بعد انہیں بخش صاحب کی بیٹی کے غورہ اور خاندانی تبرکے کا سامنا کرنا پڑا۔

بعض روایتوں کے مطابق شہزادہ ٹیپو کو ان کی ناٹھ بیوی ہر وقت اپنی غفلت اور برتری کے طعنہ دیتی رہتی تھی اور اسے حقیر نظروں سے دیکھتی تھی لیکن شہزادے نے اس کے خلاف کوئی قدم

ہو گئیں۔

ایک روایت کے مطابق برہان الدین اور اس کے خاندان والے اس رشتہ کے شدید مخالف تھے۔ خود لڑکی اور اس کی والدہ کے بارے میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

لیکن — ایک دوسری مسند قدروایت میں صاف طور پر بیان کیا گیا ہے کہ برہان الدین اس کے لڑکوں اور خاندان کے دوسرے لوگوں نے باہمی مشورہ کر کے لڑکی کو شادی سے قبل ختم کر دینے کا فیصلہ کیا اور جب شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تو انہوں نے معصوم لڑکی کو ایک کنویں میں دھکا دے کر ختم کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ مشہور کر دیا کہ لڑکی نے کنویں میں کود کر خودکشی کر لی ہے۔

یہ واقعہ جس قدر دردناک ہے اتنا ہی عبرت انگیز بھی۔ اگر سلطان ٹیپو نے اپنی شاہی کے زور پر برہان الدین کی اہل ناطہ میں زبردستی شادی کی کوشش کی تھی (یہ ایک مفروضہ ہے) تو اہل ناطہ جو خود کو مذہب کا ٹھیکیدار کہتے تھے، انہوں نے بیٹی کو قتل کر کے کونسا نیک کام کیا؟



سلطان ٹیپو ایک آزاد حکمران تھا۔ وہ آزادی کی قدر و قیمت جانتا تھا۔ اس کا یہ قول تاریخ کے صفحات میں جگہ لے رہا ہے:

’شیر کی ایک دن کی زندگی‘

گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔

ایک آزاد مملکت کے آزاد حکمران ہونے کے باوجود اس وقت بھی اس نے مغل شہنشاہ دہلی، شاہ عالم نانی کی سیادت سے روگردانی نہیں کی تھی اور نہ اپنی مطلق العنانی کا اعلان کیا تھا۔ چنانچہ شاہ عالم نانی ہی کو ناجہدار مہند تھتھا تھا۔

سلطان ٹیپو ایک عظیم سیاستدان بھی تھا اور اس کی اس خوبی کی وجہ سے اس سیاستدان کو مدراس کانگریس میگزین رزلارڈ میک کارٹی، راستے سے ہٹانا چاہتا تھا کہ جو انگریزی فتوحات کے راستے کا سب سے بڑا روٹا تھا۔

نہ اٹھا یا بلکہ صبر اور رواداری کا مظاہرہ کرتے رہے۔

اس کے برخلاف شہزادے کی دوسری بیوی رقیہ بیگم جو انہی کے خاندان سے تھیں، ایک ہمدرد اور مونس و غمخوار بیوی ثابت ہوئیں۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ جب سلطان کو کورگ کی فتح کے بعد کچھ سکون حاصل ہوا اور اس کے سامنے اس کے برادر نسبتی (سالے) کی شادی کا مسئلہ پیش ہوا تو اس نے بھی برہان الدین کے لیے گورنر حیدرنگر بدر الزمان ناطہ کی بیٹی کو منتخب کیا۔

سلطان کو اہل ناطہ میں اپنی شادی کے خراب نتائج کا تلخ تجربہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے اس تجربہ کو پھر دہرانے کی کوشش کیوں کی؟ اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اس سلسلے میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ سلطان اپنے برادر نسبتی کی شادی اہل ناطہ میں کر کے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس کے دل میں اہل ناطہ کا احترام باقی ہے۔ اگرچہ اس کی ناطہ بیوی نے اسے کچھ سکھ نہ دیا لیکن یہ دلیل کچھ زیادہ وزنی نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے کہ فارسی کی ایک مثل بہت مشہور ہے کہ:

آزمودہ را آزمودن جہل است

(یعنی آزمائے ہوئے کو دوبارہ آزمانا جہالت ہے)

بعد کے جو واقعات پیش آئے انہوں نے اس عقولے کو پتہ کر دکھایا۔

سلطان نے والی حیدرنگر بدر الزمان ناطہ کو طلب کیا۔ بدر الزمان ناطہ جب دربار میں آئے تو سلطان نے ان کا پر جوش استقبال کیا اور انہیں تحفے تحائف پیش کیے۔ اس کے بعد سلطان نے انہیں تنہائی میں بلایا اور پیش کش کی:

’اے والی حیدرنگر بدر الزمان! ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے برادر نسبتی برہان الدین خان کو اپنی دامادی میں قبول کیجیے۔‘

بدر الزمان ناطہ نے ذرا توقف کیا تو سلطان نے کہا:

’کیا والی حیدرنگر کو اس رشتہ پر کوئی اعتراض ہے؟‘

والی حیدرنگر گھبرا گیا اور گہرے بڑا کر بولا:

’جی نہیں سلطان۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟‘

سلطان نے اسی وقت شادی کا اعلان کر دیا اور برہان الدین کی شادی کی تیاریاں شروع

صلح نامہ جنگور کی نقل انگلستان پہنچی تو انگریزوں نے اس کا سوگ منایا۔ اور یہ ٹھیک ہی تھا۔ یہ صلح نامہ انگریزوں کی صاف اور واضح شکست کا عطا بلکہ اظہار تھا چنانچہ لارڈ میکالٹا اور بنگال کے دیگر عدسے داروں کو ہٹا کر ان کی جگہ نئے افسران زیادہ اختیارات دے کر ہندوستان بھیجے گئے۔

ان نئے آنے والوں میں سب سے کمینہ فطرت اور مکار لارڈ کارنوالس تھا جو نیا گورنر جنرل بن کے ہندوستان آیا تھا۔

ایک حوالے کے مطابق جب کارنوالس انگلستان سے روانہ ہوا تھا تو اس نے دہلی کے حکام کو یقین دلایا تھا کہ وہ سلطان ٹیپو کو نیست و نابود کر دے گا۔ اس لیے کہ سلطان کا نام انگریزوں کے لیے ہوا بن گیا تھا۔ ہندوستان کے علاوہ انگلستان کے انگریز بچوں کو جب ڈراما مقصود ہوتا تو ان کی مائیں کہتیں،

”چپ ہو جا۔ ٹیپو آ رہا ہے۔“

پورا ہندوستان اور انگلستان سلطان کی دہشت سے لرز رہا تھا۔ دہشت کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو سلطان ٹیپو سے اس قدر نفرت تھی کہ وہ اپنے کتوں کا نام ”ٹیپو“ رکھتے تھے۔

قارئین کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آگے چل کر مسلمانوں نے انگریزوں سے اس نفرت انگیز سلوک، کا یہ بدلہ لیا کہ انہوں نے اپنے کتوں کا نام ”ٹامی“ رکھنا شروع کر دیا۔

ٹامی انگریزوں کی اس ناجائز (حرامی) اولاد کو کہتے ہیں جو ہسپتالوں میں پیدا ہوتی ہیں یا پھر پیدا ہونے پر ان حرامی بچوں کو مرطک کے کنارے ڈال دیا جاتا ہے اور انگلستان کی حکومت ان ناجائز بچوں کی پرورش کرتی ہے۔

ایسے ناجائز بچے ماں باپ کی شفقت سے محروم ہوتے تھے اور جب یہ جوان ہوتے تو انہیں انگریزی فوج میں بھرتی کر لیا جاتا۔

یہ ”ٹامی“ تمام اخلاقی اور مذہبی قدروں سے آزاد ہوتے اور دنیا کے ہر عیب میں حقائق و مشاق ہوتے تھے۔

برسبیل تذکرہ اس سلسلے میں ایک اور بات سننے چلیے:

خلافتِ غریب کے دو بھائی علی برادران کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ دونوں بھائی مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی گوہر تھے۔ یہ ہماری تحریک آزادی ہند کے مہربان بھائی کہلاتے

ہیں۔ محمد علی جوہر بڑی خوبیوں کے مالک تھے جن کی تفصیل تو یہاں بیان نہیں ہو سکتی، آپ صرف یہ بات یاد رکھیے کہ انگریزوں کو جس قدر مسلمانوں اور ہندوستانیوں سے نفرت تھی، اس سے کہیں زیادہ محمد علی کو انگریزوں سے نفرت تھی۔

ایک مرتبہ مولانا محمد علی جوہر انگریز حکومت سے گفت و شنید کرنے انگلستان تشریف لے گئے۔ جب وہ انگلستان کے ساحل پر جہاز سے اترنے لگے تو انہیں ایک اور بچی عمارت پر ایک سائٹ بورڈ نظر آیا جس پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا:

DOGS AND INDIANS ARE NOT ALLOWED.

(کتوں اور ہندوستانیوں کو آنے کی اجازت نہیں ہے)

انگریزوں کی نظر میں ہندوستانی اور کتے برابر تھے یعنی وہ ہندوستانیوں کو کتا کہہ کر ان کی تذلیل کرتے تھے۔

مولانا نے یہ بورڈ پڑھا تو خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

پھر جب مولانا انگلستان سے واپس آئے تو انہوں نے بمبئی کے ساحل پر ایک اور بچی عمارت پر اس عبارت کا ایک سائٹ بورڈ لگوا دیا:

DOGS AND BRITISHES ARE NOT ALLOWED.

(کتوں اور انگریزوں کو آنے کی اجازت نہیں ہے)

اس طرح مولانا محمد علی جوہر نے انگریزوں سے توہین کا انتقام لے لیا۔

جنوبی ہند میں انگریزوں نے سلطنتِ خداداد میسور کے خلاف جو جال بچھایا اس کی بنیاد انہوں نے دو باتوں پر رکھی:

اول یہ کہ سلطان ٹیپو کو ہمسایوں کے ساتھ جنگ میں مصروف رکھنا۔

دوم یہ کہ میسور کے طول و عرض میں یہ پروپیگنڈہ کرنا کہ انگریز اس بات کے خواہشمند ہیں کہ سلطنتِ میسور کو سلطان ٹیپو سے چھین کر اس کے اصل حاکموں (راجہ) کو واپس دلائیں۔

اس طرح وہ ایک طرف تو سلطان کو جنگوں میں الجھا کر اپنی طاقت بڑھا رہے تھے اور دوسری طرف الٹ کے پروپیگنڈے سے میسور کی ہندو آبادی میں سلطان کے خلاف ایک بے چینی سی

پیدا ہوا شروع ہو گئی تھی۔

سلطان انگریزوں کی حید ساز یوں اور چال بازیوں سے نادانف نہیں تھا۔ اُن کے خطرناک عزائم کے پیش نظر سلطان نے شہنشاہ دہلی کو متعذر خطوط لکھے جن میں اُس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ دشمن اسلام انگریزوں کے خلاف صف آرا ہے اس لیے شہنشاہ کو چاہیے کہ وہ دین اسلام کی بقا کے لیے اس کی مدد کرے۔

چنانچہ سلطان ٹیپو نے شہنشاہ ہند شاہ عالم ثانی کو ۲۳ جون ۱۷۸۵ء کو مندرجہ ذیل خط لکھا تھا:

”یہ خادم اسلام دین محمدی کی حمایت میں نصرائیوں کی مرکوبی میں معروف ہے جنہوں نے اس سرزنش کی تاب نہ لاکر ایک ذلیل صلح (صلح بنگلور ۱۷۸۴ء) کر لی ہے۔ یہ صلح نامہ اس قدر مشہور ہے کہ اس خط میں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

خدا کے فضل و کرم پر بھر دوسرے ہوئے اس خادم دین محمدی کی خواہش ہے کہ دشمنان دین سے جنگ کرے اور انہیں مٹا دے۔ لیکن شہنشاہ ہند خود اپنے معاملات میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ سوائے طفل تکیوں کے اور کچھ نہ کر سکا۔

ادھر سے نابوس ہو کر سلطان نے اپنے ہمسایہ ممالک ایران، عرب، افغانستان اور ترکی کے سربراہان کو اس علی جہاد میں تعاون کی دعوت دی اور ان سے اپنے تاجرانہ تعلقات استوار کیے۔ سلطان ٹیپو کی فرانسیزیوں سے دوستی اور مرہٹہ بیسٹوا سے معاہدے وغیرہ بھی انگریزوں کے خلاف نئے حلیفوں کی تلاش تھی لیکن فرانسیزیوں نے معاہدہ وارسائی کے بعد اپنے تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا تھا حالانکہ سلطان نے اس سلسلے میں ایک سفارت بھی فرانس بھیجی تھی۔

انہی ایام میں سلطان نے انگریزوں کے خلاف ایک اعلان جہاد بھی شائع کرایا تھا جس کا مضمون اس طرح تھا:

”خاتم پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وقت مسلمانوں کو جو احکام دیے گئے تھے انہیں مسلمانوں نے بھلا دیا ہے جس کی وجہ سے زوال آ گیا۔ اس وقت ہم خدا کے فضل و کرم سے ان احکام کو اپنے

دستخط اور مکر سے دوبارہ جاری کرتے ہیں تاکہ مسلمان آگاہی اور ہدایت حاصل کریں۔

آپ سے امید ہے کہ آپ ان احکام کو بہتر سے بہتر طریقوں سے عام مسلمانوں تک پہنچائیں گے کیونکہ ان احکام جہاد کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان سے ہر مسلمان آگاہ ہو۔

آپ کو چاہیے کہ ان احکام کے بے حساب نقلیں کر کے تمام مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔

یہ ہماری دلی خواہش اور پکا ارادہ ہے کہ ان ناقابل اعتبار اور سرکش لوگوں سے جنہوں نے مسلمانوں سے اپنی گردن موڑ کر بغاوت کا علم بند کیا ہے، اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک کہ وہ اسلام کی سیدھی راہ یا ”جزیہ دینا“ قبول نہ کر لیں۔ خصوصاً اس وقت تک جبکہ ہندوستان کے حاکموں کی کمزوریاں دیکھ کر اس قوم نے یہ بیہودہ خیال قائم کر لیا ہے کہ مسلمان بزدل، کمزور اور لائق نفرت ہو گئے ہیں انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جنگی تیاریاں کر کے مسلمانوں کے علاقوں پر چڑھ دوڑے ہیں اور اپنے ظلم و زبردستی کا ہاتھ مسلمانوں کے مال اور آبرو پر دراز کر دیا ہے۔

اس لیے ہم خدا کی طاقت اور تائید پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مذہب کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور ان احکام خداوندی پر مبر جھکتے ہوئے ہم نے معتمد ارادہ کر لیا ہے کہ ہم ان سے جہاد کریں۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ نزدیک اور دور کے ہر طبقہ کے مسلمانوں کو اصلی احکام اسلام سے آگاہ کریں اور ان کے کانوں سے غفلت کی روٹی نکالیں اور خصوصاً ان لوگوں کو توجہ دلائیں جو قرآن مجید کو پس پشت ڈال کر کافروں کی اطاعت کر رہے ہیں اور ان بدبختوں کی ملازمت میں داخل ہیں۔ اس لیے انی مسلمانوں کو جو کافروں کی حکومت میں رہتے ہیں یہ حکم خداوندی سنایا جائے کہ:

"اور اطاعت نہ کرو کافروں اور منافقوں کی۔ تحقیق اللہ جلنے والا

اور خمت والہ ہے۔"

ان مسلمانوں پر جس پر ان آیات کا اطلاق ہوتا ہے، فرض ہے کہ وہ ان کافروں کے علاقوں کو خالی کر کے اپنے فلاح بہر یقین اور ایمان رکھتے ہوئے ہمارے ہاں آکر آباد ہو جائیں جہاں خدا کے کرم سے ان کی حالت ان کی موجودہ حالت سے بہتر ہوگی اور ان کی آبرو اور مال نہ ان کی حفاظت میں رہیں گے اور ان لوگوں کے لیے جنہیں وہاں گزارے کے لیے ذرائع حاصل نہیں ہیں، یہاں انہیں گزارے کا بہترین ذریعہ حاصل کرنے میں مدد دی جائے گی۔

ہم نے اسی مقصد کے لیے اپنا پوری سلطنت خداداد میں احکام جاری کر دیے ہیں کہ:

جو لوگ سلطنت خداداد میں آکر پناہ لینا چاہیں، حضوری میں (سلطان کو) ان کی پوری معلومات ہماری جائیں تاکہ ان کے گزارے کا انتظام کیا جائے۔

جو شخص بھی ان الفاظ (اعلان) پر توجہ نہ کرے گا یا ان احکام خداوندی کے خلاف کرے گا تو اس بد بخت کے متعلق سمجھا جائے گا کہ اس میں غیرت ایمانی باقی نہیں ہے اور وہ ان برکات سے محروم ہو چکا ہے جو خدا نے اپنے نیک بندوں کے لیے رکھے ہیں اور ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا اور اس کا شمار کافروں میں ہو گا۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ شہنشاہ دہلی علی طور پر بے بس ہو گیا

ہے اس لیے اب خطبہ میں اس حکمران کا نام شامل کرنا چاہیے جو بالکل آزاد

اور خود مختار ہو اور جس کی زندگی کا مقصد دین اسلام کی خدمت کرنا ہو

اس لیے حکم دیا جاتا ہے کہ خطبہ جمعہ میں ہمارا نام بطور سلطان پڑھا جائے۔

سلطان شیو کو دا اعتماد تھی پہنچا تھا کہ اس کا نام خطبہ جمعہ میں پڑھا جائے کیونکہ نہ تو وہ

ہندوستان کی کسی طاقت کا ماتحت تھا اور نہ کسی بیرونی طاقت کے زیر اثر تھا۔

سلطان نے اس اعلان کے ساتھ ہی شومتری (ایرانی عالم و دانشور) کی مرتب کردہ

کتاب "مؤید المجاہدین" کے فنی قاضیوں اور اماموں میں تقسیم کرائے تاکہ وہ اس میں دیے گئے

منظوم خطبات کو اپنے دروس میں شامل کریں۔

چنانچہ آئندہ جمعے سے سلطنت خداداد کی ہزاروں مساجد میں خطبہ جمعہ میں سلطان کا نام پڑھا

کیا گیا اور یہ اعلان تھا ایک "خود مختار" سلطان ہونے کا۔

پھر جب سلطان ادھوئی کا قلعہ فتح کرنے کے بعد مرہٹوں سے نبرد آزما تھا تو ادھوئی کے

فوجدار قطب الدین خاں نے جمعہ کے خطبہ میں سلطان کا نام پڑھنے کی اجازت مانگی۔ سلطان نے

اسے بذریعہ خط جواب دیا،

ہم نے تجویز کیا ہے کہ ہمارا نام جمعہ کے خطبہ میں پڑھا جائے۔

خطبہ کے متعلق قانون یہ ہے کہ اس میں سب سے پہلے خداوند تعالیٰ

کی حمد و ثنا، اس کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت

ہو، اس کے بعد ایسے بادشاہ کا نام لیا جائے جس کی زندگی کا مقصد

اسلام کی خدمت اور اس کے نام کو بر بلند کرنا اور اس کی عظمت کے لیے

اپنی جان تک دے دینا ہو۔ ایسے سلطان کا نام خطبہ میں پڑھنے میں

کوئی مضائقہ نہیں۔

ان کم غفلوں کو کیا کہا جائے جو دہلی کے شاہ عالم ثانی کا خطبہ میں اب

تک نام پڑھتے ہیں جبکہ وہ مرہٹہ پیشوا سے پندرہ ہزار روپیہ پیش

حاصل کرتا ہے۔

وہ برائے نام شہنشاہ ہے اور اس کے اقتدار کی حیثیت صفر

سلطان جب کوہ گ کی بغاوت فرو کر کے مرنگا پٹم آیا تو ایک دن اس نے دارالسلطنت کے عوام اور تمام عامہ بن سلطنت کو مسجد لال باغ میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ اس مجمع میں سلطان نے اعلان کیا:

سے زیادہ نہیں۔

ایسی صورت میں جبکہ وہ دوسروں کا تابعدار ہے اور خود آزاد نہیں تو اسلامی عقائد کی رو سے یہ سخت گناہ ہے کہ اس کا نام خطبہ میں پڑھا جائے۔ لہذا آپ کی تجویز کے مطابق اطلاع دی جاتی ہے کہ آئندہ سے ہمارا نام خطبہ میں پڑھا جائے۔“

سلطان کو بطور سلطان سب سے پہلے مرہٹوں نے معاہدہ ۱۷۸۷ء میں تسلیم کیا۔ پونا کے پیشوا کے وزیر نانا فرنیس نے اسے ”پٹپور سلطان خان بہادر“ کے لقب سے یاد کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انگریزوں کو بھی اسے ”سلطان میسور“ تسلیم کرنا پڑا۔

سلطان نے محمد بیگ خاں بہادری اور کٹی ریاستوں کے امیروں کے نام خطوط مکھے اور عوام میں تقسیم کرنے کے لیے اعلانِ جہاد اور فتح المجاہدین کے پہلے تین ابواب کی نقلیں بھجوائیں۔

سلطان نے نظام دکن کو مرہٹوں سے دور رکھنے کے لیے محمد غیاث کو حیدرآباد میں مندرجہ ذیل خط دے کر بھیجا تھا:

”میں یعنی پٹپور سلطان مسلمانوں کی سلطنت کو تقویت دینا اور اپنی جان و مال کو سچے مذہب اسلام پر قربان کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی حالت میں تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ میرا ساتھ دیں نہ کہ بہت پرستو کا ساتھ دے کہ اسلامی ممالک کو تاخت و تاراج کریں جیسا کہ نواب نظام علی خان بہادر بار بار مرہٹوں کا ساتھ دیتے رہے اور دونوں کے لشکر مل کر میرے علاقوں کو تباہ و برباد کرتے رہے۔“

افسوس کہ میں نے نظام علی خاں کو کئی بار مختصاً پیغامات کے ذریعے سمجھایا لیکن وہ مرہٹوں کی لیغاری کو اپنے ملک سے دور رکھنے کے لیے ان کی دوستی کو غنیمت سمجھتے رہے حالانکہ مرہٹوں نے حیدرآباد کو بے انتہا نقصان پہنچایا۔ انہوں نے لا تعداد مسجدوں اور خانقاہوں کو ویران کیا۔

اس سب کا نقصان تو یہ تھا کہ وہ میری طاقت کو اپنی طاقت سمجھتے

اور جب دونوں طاقتیں مل جاتیں تو مرہٹوں کو اپنے علاقے سے باہر نکلنے کی ہمت بھی نہ ہوتی۔

اس کا سب سے بڑا سبب انگریزوں کی وہ چال ہے جس نے میں اور نظام کو ملنے نہیں دیا۔

اب میرے اور نظام علی خاں کے متحد ہونے کی صورت یہ ہے کہ میرے خاندان کی لڑکیاں نظام کے بیٹوں اور بیٹیوں سے اور نظام کے خاندان کی لڑکیاں میرے بیٹوں اور بیٹیوں سے بیاہی جائیں تاکہ طرفین میں یگانگت کے دروازے وا ہوں اور سب کو معلوم ہو جائے کہ ہم دو اسلامی ملکوں میں اتحاد اور اتفاق ہو گیا ہے۔“

اس خط کے ساتھ سلطان نے نظام دکن کے لیے قیمتی جواہرات اور تحائف اور اُسر کے لیے حلیے بھی بھیجیں۔

غیاث الدین نے دکن پہنچنے کے خط اور تمام چیزیں نظام کے سامنے پیش کیں۔ خلعتیں اُسر میں تقسیم ہوئیں۔ سوائے چند اُسر کے باقی سب نے یہ منصوبہ پسند کیا۔ نظام بھی اس منصوبہ پر راضی نظر آتا تھا۔

لیکن —

جب نظام دربار سے اٹھ کر حرم سرا میں پہنچا تو غداروں اور مفاد پرستوں نے اپنا کام دکھایا۔ پس وہ بیگمات اور کنیزیں جو غداروں کے کہنے سننے میں تھیں، انہوں نے اس منصوبے کی سخت مخالفت کی:

”منصوبہ تو اچھا ہے مگر سلطان اگر ہماری طرح اونچے حسب نسب کا مالک ہو تو پھر اس رائے کو پسند کیا جاسکتا تھا۔ ایک بیگم نے رائے دی۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“

دوسری نے تائید کی:

”کہاں دکن کی شہزادیاں اور کہاں نالک خاندان کے کم ذات شہزادے۔ محل میں ٹاٹ کا پیر نہ کیسے لگ سکتا ہے؟“

ایک اور خاتون نے زہر اُگلایا:

میں کہتی ہوں کہ ٹیپو کو دکن کے شاہی خاندان میں رشتہ کرنے کی جرات کیسے ہوئی؟
اعلیٰ حضرت نظام دکن کو چاہیے کہ وہ والی بیسور کی نذر میں اس کے سفیر کے منہ پر ماریں اور اسے دربار سے بے عزت کر کے نکال دیں۔

جب پورا حرم مخالفت پر آمادہ ہو جائے تو نظام کیا کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس منصوبہ کو ناقابل عمل قرار دے کر نیاٹ الدین کو واپس کر دیا۔

ادھر سے الیڈس ہو کر سلطان ٹیپو نے ترکی کی طرف دیکھا۔
ترکی کی سلطنت اسلامیہ اگرچہ علی طور پر بے بس تھی لیکن ترکی کا حکمران مسلمانوں کا خلیفہ سمجھا جاتا تھا اور اس سے سند سلطان حاصل کی جاتی تھی۔ پس سلطان ٹیپو نے ایک سفارت عثمانی خلیفہ کے دربار میں قسطنطنیہ روانہ کی۔

اس سفارت کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ قسطنطنیہ سے فرانس جائے اور حکومت فرانس سے ایک دیر پا معاہدہ کرنے کی کوشش کرے۔ پھر فرانس سے یہ سفارت انگلستان جائے اور وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم سے حکومت انگلستان کو آگاہ کرے۔

ترکی اور فرانس کو جو سفارت بھیجی گئی اسی کے مقاصد حسب ذیل تھے:
ترکی میں سفارت بھیجنے کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عثمانی خلیفہ سے ایک فوجی اور تجارتی معاہدہ کیا جائے۔

دوسرا مقصد یہ تھا کہ ترکی سے بصرہ کی بندرگاہ مانگی جائے جہاں سلطان کے لیے بحری بیڑہ اور بحری اڈہ قائم ہو۔ اس کے بدلے میں سلطان ٹیپو ترکی کو اپنی ایک بندرگاہ دینا چاہتا تھا۔

تیسرا مقصد یہ تھا کہ صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے سلطان کو کارگریروں کی ضرورت تھی۔ یہ کارگریر ترکی اور فرانس سے منگوائے جائیں۔ اگر ترکی میں صنعت و حرفت نہیں ہے تو بیسور سے وہاں کارگریر اور ماہرین بھیجے جائیں۔

چوتھا مقصد یہ تھا کہ ترکی اور فرانس سے سونا، لکڑی اور کوئلہ وغیرہ نکالنے کے لیے ماہرین منگوائے جائیں۔

پانچواں مقصد فرانس سے ایک پائیدار فوجی معاہدہ کرنا تھا کہ ہند میں

فرانسیسی فوج بوقت ضرورت سلطان ٹیپو کی مدد کرے جس کے صلہ میں سلطان فرانس کو تجارتی مراعات دینے پر تیار تھا۔
اس سفارت کا چھٹا اور آخری مقصد یہ تھا کہ انگلستان جاکر شاہ انگلستان کو ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم سے آگاہ کیا جائے۔

اس سفارت کے لیے مندرجہ ذیل افراد کا انتخاب ہوا:

میر غلام علی خاں لنگرہا

لطف علی بیگ

نور اللہ خاں

جعفر خاں اور

نجفی محمد حنیف!

سلطان نے اس سفارت کے ساتھ بے شمار قیمتی تحائف جن میں چار ہاتھی بھی شامل تھے روانہ کیے۔ یہ تمام لوگ سماجیوں کے ایک قافلے کے ساتھ بحری جہاز میں روانہ ہوئے۔
اس زمانہ کے بحری جہاز میں چار ہاتھیوں کا بھیجا جانا یقیناً محفل نظر ہے لیکن اس تاریخی بیان کو نظر انداز کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ آگے چل کر ان ہاتھیوں کا صاف الفاؤ میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ:

”خلیفہ شاہ فرانس اور شاہ انگلستان کو بھیجے جانے والے چاروں ہاتھی راستہ ہی میں دم توڑ گئے۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہاتھی سونے چاندی کے بنے ہوئے نہیں تھے بلکہ اصلی اور جاندار تھے۔ بہر حال اس کی حقیقت خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

اس سفارت کو جسے سلطان ٹیپو نے بڑی امیدوں سے بھیجا تھا اور جسے بحر قلم (بحر احمر) اور مصر ہوتے ہوئے سب سے پہلے قسطنطنیہ جاکر عثمانی خلیفہ کے حضور میں پیش ہونا تھا، وہ بحر قلم کے بجائے خلیج فارس کی بندرگاہ ”بصرہ“ پر پہنچی۔ پھر وہاں سے شطر العرب کے راستے بغداد پہنچی۔

کو ہندوستان سے نکال دوں کیونکہ تم لوگ مکار اور دھوکے باز ہو۔ اگر خلیفہ نے ہمارے منصوبوں کی تائید نہ کی تو بھی ہم انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کے رہیں گے۔

یہ اور اس طرح کی دوسری باتوں سے میرنگڑ نے اس مقدس راز کو افشا کر دیا جسے پہچانے کے لیے سلطان شیونے اسے قسطنطنیہ بھیجا تھا۔

انگریزوں نے یہ راز معلوم ہوتے ہی ترکی کے وزیر اعظم کو خبردار کر دیا کہ وہ خلیفہ کو پہلے ہی اس بات پر آمادہ کر لے کہ وہ سلطان شیون کی مدد اور تائید سے انکار کر دے۔ وزیر اعظم تو انگریزوں کے ہاتھوں میں کھیل ہی رہا تھا۔ پس اس نے اسی دن سے سلطان شیون کے خلاف خلیفہ کے کان بھرنا شروع کر دیے۔

پھر جب نوابہ کے طویل عرصے کے بعد میر غلام علی خاں ننگڑا کو خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا تو خلیفہ کا رویہ خشک اور سرد مہری کا تھا۔

سلطان شیون نے خلیفہ کو جو خط بھیجا تھا اسے وزیر اعظم ترکی نے خلیفہ کو پڑھ کر سنایا۔ اس میں کچھ اس طرح تحریر تھا:

”میں انگریزوں سے جہاد میں معروف ہوں اسی لیے آپ کی تائید چاہتا ہوں۔

میری خواہش ہے کہ بصرہ کی بندرگاہ، سلطنت خدا داد کو دے دی جائے تاکہ وہاں سے ہندوستان کے ساحلوں کی حفاظت ہو سکے۔ اس کے عوض سلطنت خدا داد کی کوئی بندرگاہ ترکی کو دے دی جائے گی۔ ہماری معادنت کے لیے خلیفہ جس قدر فوج بھیجیں گے اس کے اخراجات سلطنت خدا داد برداشت کرے گی۔

سلطنت خدا داد میں توہین اور بدوقیہ نہایت اعلیٰ معیار کی تیار ہوتی ہیں۔ اگر خلیفہ مناسب خیال فرمائیں تو توپ اور بندوق ساز ترکی بھیجے جاسکتے ہیں۔

آخر میں میری یہ گزارش ہے کہ چونکہ نجف اشرف میں پانی کی قلت ہے اس لیے دریائے فرات سے ایک نہر نکالنے کی اجازت دی جائے۔“

بغداد سے اس سفارت نے مزید ایک ہزار میل کا فاصلہ طے کیا۔ تب جا کے یہ سفارت بلقان قسطنطنیہ پہنچی۔

سفارت کا یہ راستہ جو طویل بھی تھا، بڑا دشوار گزار تھا۔ نیچے فارس میں اس کا جواز تب ہو گیا اور پچاس آدمی لقمہ اجل بن گئے۔ سلطان کی سفارت میں شامل بخشی محمد صلیب بصرہ کے قریب مرگیا اور تحفہ میں بھیجے جانے والے چاروں ہاتھی راستہ میں دم توڑ گئے۔

سفارت کو پانچ ماہ تک بصرہ میں رونا پڑا۔ اس تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ عثمانی خلیفہ کی طرف سے سفارت کو قسطنطنیہ آنے کی اجازت نہ ملی تھی۔ آخر میر غلام علی خاں ننگڑا قسطنطنیہ گیا لیکن پورے نواہ تک اسے خلیفہ کے حضور پیش ہونے کا موقع نہ ملا بلکہ اسے یہ موقع نہیں دیا گیا۔ اس کے فرائض کے خوف سے انگریز، خلیفہ ترکی کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور ترکی کا سفیر اور دیگر وزیر انگریزوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنے ہوئے تھے۔ ایسے وقت میں انہوں نے مناسب نہ سمجھا کہ ہندوستان سے آئی ہوئی سفارت کو باب عالی میں پیش کر دیں۔

سلطان شیون کی سفارت کا خلیفہ سے ملاقات نہ کرنے کے معاملہ میں دہلی موجود انگریز کاسب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ یہ انگریز بھی انگلستان سے سفارت پر آئے ہوئے تھے اور خلیفہ فرائض کے خلاف بھڑکا کر انگریزوں سے معاہدہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔

ان انگریزوں کو ہندوستان میں انگریزی سیاست کے بارے میں بھی پوری معلومات حاصل تھیں اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریزوں اور خلیفہ کے درمیان معاہدہ ہو جائے۔ پہلے ہندوستانی سفارت کو خلیفہ سے ملنے دیا جائے۔

اور آخر کار۔

انگریزوں کی چال بازی اور مکاری نے قسطنطنیہ میں بھی زبردست کام کیا۔ ترکی کے وزیر اعظم کے ذریعے میر غلام علی خاں ننگڑا کو انگریز سفیروں نے اپنے ہال میں بلایا۔ انگریزوں میں شراب جاڑ ہے اور سب ہی انگریز شراب کے عادی ہوتے ہیں۔ میرنگڑا بھی شراب کا عادی تھا اور اکثر انگریزوں کی محافل میں شریک ہوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے بہترین شراب بلکہ آخروہ راز معلوم کر لیا جس کے لیے وہ اتنے دن سے کوشاں تھے۔ میر غلام علی خاں ننگڑا نے شراب کے نشے میں اگل دیا:

”میں قسطنطنیہ اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ عثمانی خلیفہ کی تائید سے تم انگریزوں

۲۹ دسمبر ۱۷۸۹ء — یہ وہ دن تھا جب سلطان لشکر ڈاونکور کی مرحد سے آخری روز اپنا چورم لکھا۔

سفارت کے بعض ارکان نے سلطان سے شکایت کی کہ میر غلام علی خاں نے ترکی کو بھیجے جانے والے تحائف میں خود بڑھ دیا ہے۔

یہ الزام اتنی زبردست شہادتوں کے ساتھ لگایا گیا کہ سلطان نے فوراً میر غلام علی خاں کے گھر کی تلاشی کا حکم دے دیا۔

میرنگڑا کے گھر کی تلاشی کی گئی تو وہ تمام سامان برآمد ہو گیا جس کا الزام لگایا گیا تھا۔ سلطان نے اس چوری کے جرم میں میرنگڑا کو موت نظر بندی کی سزا دی۔ پھر کچھ دنوں بعد سلطان نے عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے اسے معاف کر دیا۔

میاں بک نوخیز غنیمت تھا مگر سلطان نے اسے وزیر بکر یہ بنا دیا اور وہ بد ذات بجائے احسان ماننے کے سلطان کا دشمن ہو گیا۔

سلطان نے میر صادق کو بھی اسی طرح معاف کر دیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ سلطان نے ان دونوں کو معاف کر کے دراصل آستین میں سانپ پال لیے تھے جنہوں نے آگے چل کر اسے ڈس کے پھوڑا۔



واضح رہے کہ ان دونوں بخت انوش سلطنت ترکی کے ماتحت تھا۔

چونکہ خلیفہ سلطان سلیم اپنے وزیر اعظم اور دوسرے وزرا کے کہنے سننے پر انگریزوں سے معاہدہ کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا اس لیے اس نے سلطان شیوہ کے کسی منصوبہ کی بھی تائید نہ کی بلکہ محض ایک رسمی سادستی کا خط دے کر سفارت کو رخا دیا۔

انگریزوں کو میر غلام علی خاں لنگڑا کے ذریعے سلطان شیوہ کے خیالات پہلے ہی معلوم چکے تھے۔ اب اس خط کے مندرجات بھی وزیر اعظم ترکی نے انگریز سفارت تک پہنچا دیے اور جو کچھ باقی تھا اس سے بھی انگریز پوری طرح واقف ہو گئے۔

پس —

انگریزوں نے رد عمل کے طور پر سلطان شیوہ کے خلاف ترکی کے علاوہ عرب اور ایران میں بم پرو پیگنڈہ شروع کر دیا۔ عرب اس وقت شریف مکہ کے زیر اثر تھا جو عرب میں اپنی آزاد مملکت قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ انگریزوں سے پہلے ہی ملا ہوا تھا۔ انگریزوں نے اسے سلطان شیوہ کے خلاف اور زیادہ بھڑکا دیا اور سلطان شیوہ کو ترکی کے علاوہ عربوں سے کسی قسم کا تعلق یا مدد حاصل نہ ہو سکی۔

انگریزوں نے صرف اسلامی ممالک ہی میں سلطان شیوہ کے خلاف اپنا پرو پیگنڈہ تیز نہیں کیا بلکہ پورے ہندوستان میں سلطنت خدا داد کے خلاف ایک زبردست تحریک کا آغاز ہو گیا اور یہ سب میر غلام علی خاں لنگڑا کی قبل از وقت (شراب پی کر) کہو اس کرنے اور خلیفہ کے دربار میں انگریزوں کے زبردست اثر و رسوخ کی وجہ سے ہوا۔

یہ ناکام سفارت جس کا سربراہ میر غلام علی خاں لنگڑا تھا اسکا منہ میر غلام علی خاں سے دریاغیہ نیل، پھوڑے سے قلم اور جہد پہنچی۔

میر غلام علی خاں کو فرانس اور انگلستان جانے کا حکم بھی دیا گیا تھا مگر وقت بہت گزر چکا تھا۔ پھر غلام علی خاں لنگڑا کی حالتوں کی وجہ سے سفارت پہلے ہی قدم پر ناکام ہو گئی اس لیے یہ لوگ واپس ہوئے۔

شریف مکہ نے بھی کوئی معقول جواب نہ دیا۔

اس طرح ۱۷۸۹ء میں جانے والی سفارت چار سال بعد ۲۹ دسمبر ۱۷۸۹ء میں ناکام

نامراد واپس آئی۔

مرہٹوں کی طرف سے ہوئی تھی جو سلطان ٹیپو کے عروج سے عدد درجہ خائف تھے۔ مندرجہ بالا کتاب کا مصنف رقم طراز ہے:

”جب پونا کے پیشوا کو معلوم ہوا کہ انگریزوں اور سلطان ٹیپو کے درمیان صلح ہو رہی ہے تو انہیں خیال ہوا کہ انگریزی کپتی معاہدہ صابی کو نسخہ کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ اس اطلاع پر مرہٹوں نے سلطان ٹیپو کے پاس بغرض مصالحت، اور خراج کی وصولیابی کے لیے ایچی رڈا سے جواب دہ سلطان ٹیپو نے کھلا بھیجا کہ ان کے والد نے مرنے چند ضرب اتویہ اور بند دتوں کے علاوہ ترکہ میں کوئی اور چیز نہیں چھوڑی جس کے ساتھ میں حاضر ہوں۔“

اس تحریر سے خائف اور بد دل ہو کر مرہٹوں نے یہ تجویز کی کہ نظام علی ناں کے ساتھ اتحاد کر کے ٹیپو سے وہ علاقے واپس لیے جائیں جن پر اس نے قبضہ کر لیا تھا۔“

چنانچہ معاہدہ ہوتے ہی مرہٹوں اور نظام حیدر آباد کی متحدہ فوجیں سلطان ٹیپو کی عسرم موجودگی میں سلطنت خداداد کی طرف بڑھیں۔

مرہٹہ لشکر کی آسمان مرہٹہ وزیر اعظم نانافرنویس کے ماتھے میں تھی۔ اس کے لشکر میں اسی ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادے مع توپ خانہ کے تھے اور نظام کے ساتھ چالیس ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادے مع توپ خانہ کے تھے۔

مرہٹوں اور نظام کا متحدہ لشکر جو مجموعی طور پر ایک لاکھ بیس ہزار سوار اور نوے ہزار پیادوں پر مشتمل تھا، آندھی اور طوفان کی طرح گر جتا۔ مرہٹہ سلطنت، خداداد کی سرحدوں کی طرف بڑھا۔ مرہٹہ پر سلطان کا قلعہ بادامی تھا جسے حملہ آور لشکر نے اپنے گہرے میں لے لیا۔

حملہ آوروں کا خیال تھا کہ قلعہ دار لشکر کی کثرت، دیکھ کر ہی قلعہ حوالے کر دے گا مگر اس پر اس عظیم لشکر کا قریٰ برابر اثر نہ ہوا۔

نانافرنویس نے جنگ سے بچنے کے لیے قلعہ دار کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ قلعہ حوالے کر دے تو قلعہ میں نہ لوٹ مار ہوگی اور نہ تباہی بربادی کی باتے گی بلکہ قلعہ دار کو بھی اس کے منصب پر بحال رکھا جائے گا۔



سلطان ٹیپو کوئی کاغذی سلطان نہ تھا بلکہ اس نے سلطان کا لقب اس وقت اختیار کیا جب اس نے دوست و دشمن اسب سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا تھا۔ انگریزوں تو اس سے اس قدر خائف ہو چکے تھے کہ ہندوستان سے انگلستان تک انگریز عورتیں اپنے بچوں کو ”ٹیپو“ کے نام سے ڈراتی تھیں۔

جنوبی ہند نے آج تک کوئی سلطان نہ دیکھا تھا سوائے سلطان ٹیپو کے۔ پھر جنوبی ہند کی دو اور طاقتیں مرہٹہ اور نظام اس کی عظمت اور سلطانی کو کس طرح قبول کرتیں۔ ان کے خیال میں تو ”میسور“ ایک چھوٹی سی باجگزار ریاست تھی جسے مرہٹے اور نظام ہمیشہ ڈرا یاد دکھایا کرتے تھے۔

آخر اس سلسلے میں پونا کے مرہٹہ پیشوا اور دکن کے نظام میں گفت و شنید شروع ہوئی جو کہ وہ دونوں سلطان کے مشترکہ دشمن تھے۔

ان دونوں کے درمیان معاہدے میں طے پایا کہ پونا اور دکن کے لشکر یکجا ہو کر سلطنت خداداد پر اپنا کرہیں اور اس وقت تک جنگ جاری رکھیں جب تک (خدا نخواستہ) سلطنت خداداد کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

یہ معاہدہ ”آیت گیر“ کے مقام پر ہوا تھا اور اسی نام سے مشہور ہے۔
”نظام علی خاں“ مطبوعہ حیدرآباد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاہدہ کی تحریک

بادامی کے قلعہ دار کے پاس سامان حرب کے علاوہ کھانے پینے کے سامان کی بھی وافر مقدار موجود تھی اس لیے اس نے قلعہ حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

نانافرنوئیس کا قاصد نام کام ہو کر واپس ہوا۔ جس وقت قاصد قلعہ سے نکلا تو قلعہ دار کے اشارے پر قلعہ کے ایک برج پر چڑھی ہوئی توپ سے حملہ آور لشکر کی طرف ایک گولہ داغایا گیا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ قلعہ دار حملہ آوروں کی تابعداری کے بجائے اُن سے جنگ پر آمادہ ہے۔

پس—

دونوں لشکروں نے ایک ساتھ قلعہ پر حملہ کر دیا اور دونوں کے توپ خانے قلعہ پر گولہ باری کرنے لگے۔

حملہ کرتے وقت نانا فرنوئیس کا خیال تھا کہ قلعہ دار دو چار دن سے زیادہ مدافعت نہ کر سکے گا مگر وہاں ہفتہ گزرا۔ پھر ایک مہینہ ہو گیا اور گولوں کا طوفان اور سنسناتے تیروں کی آواز حملہ آور لشکر کی بار بار گوشہ نشینوں کے باوجود قلعہ دار اور قلعہ کی سپاہ اس کے مقابلہ پر ڈٹی رہی۔

دو ماہ، چار ماہ، سال تک کہ آٹھ ماہ سے زیادہ بیت گئے اور قلعہ کا سر ہونا تو انکے ہاں حملہ آور لشکر قلعہ کی تفصیل کے قریب بھی نہ پہنچ سکا۔ مدافعت کا یہ انداز واقعی قابلِ فخر تھا۔

مرہٹہ لشکر اور نظام کے وہ سوار جو جبالے کھلاتے تھے، سب کے سب مارے گئے تمام دن وہ کوشش کرتے اور شام کو بھرتے، دیاں قلعہ کو دیکھتے اور اپنی بھرتے واپس آجاتے۔

پھر نانا فرنوئیس کہ مرہٹوں کا اصل دماغ تھا اس نے ایک ترکیب سوچی۔ یہ ترکیب اس نے انگریزوں کی جنگی چالوں سے سیکھی تھی۔ انگریز بھی جب کسی جگہ قبضہ کرنے میں ناکام ہو جاتے تو اسی تدبیر کا سہارا لیتے۔ یہ تدبیر ایک تیر ہدف قسم تھا۔

اور یہ نسخہ تھا— ”لاپچ“

انگریزوں کا یہ سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ انہوں نے بنگال اور جنوبی ہند میں جتنی بھی جنگیں جیتیں یا کامیابیاں حاصل کیں، فریب دہی، دھوکہ بازی کے علاوہ ”لاپچ“ کا اُن میں سب سے

زیادہ دخل دیا۔

نانا فرنوئیس نے جنگ روک دی اور دوستی کے پیامبر قلعہ دار کے پاس بھیجنے شروع کیے۔ اس نے بڑی چالاکی سے قلعہ دار کو قلعہ حوالے کرنے کے لیے اپنی شرطیں پیش کرنے کی تجویز بھیجی۔ اس نے واضح الفاظ میں قلعہ دار کو پیغام دیا کہ قلعہ دار قلعہ کے بدلے میں جو بھی شرط رکھے گا وہ پوری کی جائے گی۔

اس طرح دو لاکھ سے زیادہ لشکر نو ماہ تک ہزاروں سواروں اور سپاہیوں کو قربان کرنے کے باوجود جس قلعہ بادامی کا بال بھی بیکانہ ہو سکا وہی قلعہ بادامی قلعہ دار نے منہ مانگی قیمت پر مرہٹہ حملہ آوروں کے ہاتھ فروخت کر دیا اور سلطان جیند قلعہ سے اتار دیا گیا۔

غداروں کی کسی دور میں کمی نہیں رہی۔ وہ قلعہ دار جو پور سال تک پامردی سے دشمن کے سامنے ڈٹا رہا، وہ چاندی سونے کے جوتے سے مار کھا گیا۔

قلعہ بادامی پر حملہ آوروں کا قبضہ ہو گیا۔

اس کامیابی نے زبردست جشن منایا۔ سلطنت، خداداد کی مرحرہ پر یہ ان کی پہلی کامیابی تھی اور تہ قلعہ دار کی زبردست مدافعت سے تو حملہ آور اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ یہ قلعہ ناقابلِ تسخیر ہے۔ اس لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ کے آگے بڑھ جانا چاہیے مگر نانا فرنوئیس کی فراست اور سیاست کام آگئی اور اس نے پانڈی سونے کا جو تاج قلعہ دار کا سر بھکا دیا۔

اس پہلی زبردست کامیابی کے بعد متحدہ حملہ آوروں نے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے لشکر روانہ کیے۔

قلعہ بادامی کی تسخیر کی خبر ہر طرف پھیل گئی تھی اس لیے چھوٹے قلعہ داروں نے بغیر جنگ ویدل کے اپنے قلعہ دشمنوں کے حوالے کر دیے۔ اس طرح دریائے کرشنا اور دریائے تنگ بیدرا کے درمیان بیشتر قلعوں پر قبضہ ہو گیا۔ ان میں دھار وار، جالی دار، کجندرا، نو کندہ اور رنگندہ وغیرہ کے قلعے شامل تھے۔

جہاں تک چھوٹے زمینداروں (پالیکاروں) کا تعلق تھا تو وہ عام طور سے ہندو تھے اور مرہٹوں سے پہلے ہی سے ساز باز یہی ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنے علاقے خود ہی اتحادیوں کے حوالے کر دیے۔

تھا۔ کیونکہ ادھونی کا اصل حکمران تو یہی دیوان اسد علی تھا۔ شہزادہ تو محض نام کا مالک تھا۔
مگر۔

مہابت جنگ اس قدر بے وقوف نہ تھا جتنا اسد علی سمجھ رہا تھا۔

وہ دیوان اسد علی کی بات خوب سمجھ گیا تھا مگر وہ بھی یہ خطرہ مول لینے پر تیار نہ تھا۔ اس لیے اس نے فیصلے کے لیے وقت طلب کر لیا تھا۔

مہابت جنگ اس سلسلے میں دراصل اپنی بیگم سے مشورہ کرنا چاہتا تھا جو کہ نظام دکن کی بیٹی تھی اس کے لیے مشہور تھا کہ وہ اپنے شوہر سے کہیں زیادہ عقلمند اور سمجھدار تھی اور امور سلطنت اسی کے مشورہ سے چلتے تھے۔

مہابت جنگ نے دیوان کے بولنے سے پہلے ہی اپنا رخ موڑ لیا اور تیزی سے زنان خانہ کی طرف چل پڑا۔

حرم سرا میں سب ہی خاموش خاموش، چپ چاپ اور گہرائے گہرائے تھے۔ مہابت جنگ بیگم شہزادی دکن نے شوہر کو اندر آتے دیکھا تو لپک کر اس کے پاس پہنچی۔

"تم نے کیا فیصلہ کیا شہزادے؟"

وہ اُسے "تو" کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتی تھی۔

شہزادے نے اسے بتایا:

"دیوان اسد علی کی بھی یہی رائے ہے کہ سلطان کو قلعہ حوالے کر کے جانیں بچالی جائیں۔"

"تو آپ نے سلطان کو اس شرط سے آگاہ کر دیا؟" شہزادی دکن نے اس کی بات کاٹ کر وقت کی نزاکت کے پیش نظر وہ کم از کم گفتگو کرنا چاہ رہی تھی۔

شہزادے نے جواب دیا:

"ہاں۔ میں نے سلطان سے درخواست کی ہے کہ قلعہ پر اس وقت تک حملہ نہ کیا جائے جب

تک "صلح کی سفارت" اس سے گفتگو نہ کر لے۔"

شہزادی جس قدر عقلمند تھی، اسی قدر رنگ مزاج بھی تھی۔ اس نے سخت لہجے میں کہا:

"گو یا شہزادہ بہادر نے سلطان مسعود کو حکم دیا ہے کہ وہ قلعہ پر حملہ نہ کرے۔ کیا آپ کا

یہ ہے کہ سلطان اس قلعہ پر قبضہ کرنے نہیں بلکہ ادھونی میں نشانہ رکھیں آئیے۔ شہزادے

کبھی تو عقل کی بات کیا کر دے!"

"ناراض نہ ہو شہزادی!"

مہابت جنگ گہرا گیا:

"سلطان بے حد شریف انسان ہے۔ وہ ہماری بات مان لے گا اور حملہ میں تاخیر

کرے گا۔"

شہزادی نے اسے گھور کر دیکھا:

"سلطان کتنا ہی شریف سی لیکن وہ یہ بھی تو سوچ سکتا ہے کہ ہم تاخیری حربہ استعمال کر

کے اپنا دفاع مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ یا پھر ہمیں کہیں سے لگ آنے کی امید ہے اس لیے ہم ابھی جنگ کو ٹالنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں شہزادی۔ ایسا نہیں ہوگا۔"

مہابت جنگ نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی:

"ہم نے سلطان سے درخواست کی ہے۔ وہ سفارت کا انتظار کر رہے گئے۔"

شہزادی نے اچانک سوال کیا:

"سلطان کے پاس یہ درخواست لے کر کون گیا ہے؟"

شہزادے نے جواب دیا:

"میں نے دیوان سے کہہ دیا ہے کہ وہ کسی معقول آدمی کے ذریعے یہ درخواست فوراً

سلطان کے حضور پہنچا دے۔"

شہزادے کا لہجہ اتنا ہی نرم تھا جتنا کہ شہزادی کا انداز جارحانہ تھا۔ یہ سننے ہی شہزادی چڑ

گئی اور چیخ کے بولی:

"بہت خوب۔ بڑی عقلمندی کی ہے آپ نے۔ جو آدمی درخواست لے کر گیا ہے کیا آپ اس

کے ذریعے سلطان سے یہ درخواست نہیں کر سکتے تھے کہ ہم قلعہ کا قبضہ دینے کو تیار ہیں صرف

ہمیں قلعہ سے بحفاظت نکل جانے کی ضمانت یا اجازت دی جائے۔"

مہابت جنگ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس وقت اس نے دیوان اسد علی کی

گفتگو کا سہارا لیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو شہزادی۔ ایسا ہو سکتا تھا لیکن دیوان اسد علی کا مشورہ یہ ہے کہ

صلح کی گفتگو کے لیے ادھونی کی کوئی اہم شخصیت جائے اور یہ شخصیت یا میں ہوں یا پھر دیوان

اسد علی خاں ہے۔

”پھر دیکھیں ہو رہی ہے۔ آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“ شہزادی دکن بڑی بے بسی سے بولی
اب شہزادے نے پینسٹر ابدلہ:

”اسی مشورہ کے لیے تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”اد میرے خدا یا!“

شہزادی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا:

”جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ آپ یا دیوان میں سے ایک کو سلطان کے پاس جانا چاہیے تو آپ مجھ سے
کیا مشورہ کرنے آئے ہیں؟“

اب شہزادے نے ذرائع کے کہا:

”دیوان اپنی جان بچانے کے لیے کہتا ہے کہ اس کے بچاٹے مجھے سلطان کے پاس

جانا چاہیے۔“

”دیوان ٹھیک کہتا ہے۔“

شہزادی نے جواب دیا:

”ایک سلطان سے ایک حکمران ہی اچھی طرح گفتگو کر سکتا ہے۔“

شہزادہ گھبرا گیا:

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو شہزادی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ سلطان کے باپ حیدر علی خاں مرحوم
نے کھانڈے راؤ کو اپنا طوطا بنا کے لوہے کے پنجرے میں بند کر دیا تھا اور وہ اسی پنجرے میں
مر گیا تھا۔ میں یہ خطہ مول نہیں لے سکتا۔“

شہزادے!

شہزادی نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا:

”تم کھانڈے راؤ ہو اور نہ سلطان، حیدر علی خاں۔ اُس وقت کے حالات آج کے حالات
جیسے نہیں تھے۔ پھر ایک سلطان کسی حکمران کو قابو کر کے قید یا موت کی سزا نہیں دیا کرتا، بلکہ
اس کا دل جیتنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے اپنے ماتحت لانا چاہتا ہے۔ سلطان کو قلعہ چاہیے۔
ہم قلعہ چھوڑنے کو تیار ہیں۔ پھر جھگڑا کا ہے کا؟“

”تم کچھ بھی کہو۔ میں سلطان کے پاس نہیں جاؤں گا۔“ عہدت جنگ نے فیصلہ کن انداز

میں کہہ دیا۔

”اچھا تو پھر یوں کر دو۔“

شہزادی اٹھ کے کھڑی ہو گئی:

”تم عملی راہیں تشریف رکھو۔ میں نقاب ڈال کے سلطان سے سب کی جانوں کی بھیک
مانگنے جاتی ہوں۔“

”میں یہ بھی نہ ہونے دوں گا۔“

عہدت جنگ اکر گیا:

”اگر سلطان مجھے بر غمال بنا سکتا ہے تو وہ تمہیں بھی قید کر سکتا ہے۔“

شہزادی کی تیوریاں چڑھ گئیں:

”تو پھر جاؤ اور دیوان کے بچے کو کم دد کر دو تمہارا پیغام لے کر سلطان کے پاس چلے۔“

اگر دیوان ذرا بھی صیل دجھت کرے تو اسے فوراً قتل کرادو۔“

شہزادی کی یہ بات عہدت جنگ کے دل کو لگ گئی۔

اس نے سوچا کہ ادھونی کے اہم آدمیوں میں میرے بعد اسد علی خاں دیوان کا نام آتا ہے۔

پھر وہ مجھے ہی کیوں بھیجنا چاہتا ہے۔ اگر اسے اپنی گرفتاری با جان جانے کا خطرہ ہے تو یہ خطرہ

اس سے زیادہ مجھ سے۔ شہزادی نے ٹھیک کہا ہے۔ دیوان اپنے سر سے بلا ٹان چاہتا ہے۔

میں اسے ابھی دیکھتا ہوں۔ اگر اس نے جانے سے انکار کیا یا کوئی بہانہ تراشا تو میں اسے فوراً

قتل کرادوں گا۔

ایسے ہی خیالات میں ڈوبا ہوا عہدت جنگ زنا خانے سے باہر نکل گیا۔

دیوان اسد علی خاں نے عہدت جنگ کے حکم کے بموجب ایک آدمی کو سلطان کے لشکر کی

طرف روانہ کر دیا تھا اور معش ہو کے بیٹھ گیا تھا کہ اب اسے سلطان کے پاس نہیں جانا پڑے گا

لیکن جھگڑا اسی وقت عہدت جنگ زنا خانے سے برآمد ہوا۔

دیوان نے اس کی چال ہی سے جان لیا کہ معاملہ بگڑا ہوا ہے اور یقیناً کوئی مصیبت آنے

والی ہے۔

مہابت جنگ اس کے پاس پہنچتے ہی بولا:

”دیوان اسد علی۔ تم اب تک سلطان کے پاس نہیں گئے؟“

دیوان اس کے سوال سے پریشان ہو گیا۔ مہابت۔ ناں کا مزاج بھی برہم نظر آ رہا تھا۔ اس نے فوراً جواب دیا:

”شہزادہ بہادر نے ایک معتبر کو سلطان کے پاس بھیجنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اس کی تعمیل کر دی ہے۔ آپ نے مجھے جانے کا حکم نہیں دیا تھا ورنہ میں ضرور چلا گیا ہوتا۔“

شہزادے کا دماغ کچھ ٹنڈا پڑ گیا۔

”دیکھو دیوان اسد علی!“ اس نے کہا:

”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی آدمی کو سلطان کے حضور بھیجنا مناسب نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سلطان اسے اپنی شان کے خلاف سمجھے اس لیے تم فوراً سلطان کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ کہ اس کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس سے صلح کے خواہشمند ہیں۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ سلطان اس کا کیا جواب دیتا ہے!“

دیوان کے پاس اب سولے جانے کے اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ پھر بھی اس نے ایک آخری کوشش کی:

”شہزادہ بہادر کا حکم سراں نکھوں پر۔ مجھے جانے میں کوئی عذر نہیں۔ جس آدمی کو بھیجا گیا ہے اس کے واپس آتے ہی میں سلطان کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔“

”نہیں دیوان۔“

شہزادے نے اس کی بات کاٹ دی:

”ہم ذرا بھی تاخیر نہیں کر سکتے۔ ہم نے سلطان سے قلعہ پر حملہ نہ کرنے کی درخواست کی ہے اور وہ بھی ایک ہر کار سے کے ذریعے۔ سلطان کو اس پر غصہ بھی آ سکتا ہے۔ تم ابھی اور اسی وقت روانہ ہو جاؤ۔“

شہزادہ مہابت جنگ نے وہ کھڑکی بھی بند کر دی جسے دیوان اسد علی خاں نے کھولنے کی کوشش کی تھی۔

دیوان نے سمجھ لیا کہ جب اس کی موت آگئی گئی ہے تو پھر ڈرنا کیسا! چنانچہ اس نے گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ پھر اس پر سوار ہو کر بڑے طعرق سے سلطان کے لشکر میں پہنچا۔

سلطان کے لشکر یوں نے فوراً اندازہ کر لیا کہ یہ سوار کوئی اہم شخصیت ہے اس لیے ان کے ایک سردار نے نہایت مہذب طریقے سے اسے خوش آمدید کہا۔

”معزز سوار۔ اگرچہ ہم آپ کی شخصیت سے واقف نہیں ہیں لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ آپ صلح کی گفتگو کے لیے تشریف لائے ہیں؟“

دیوان اسد علی گھوڑے سے اترا اور بولا:

”میرا نام اسد علی خاں ہے اور میں علاقہ ادھونی کا وزیر اعظم اور شہزادہ مہابت جنگ کا نائب اور فرستادہ ہوں اور صلح کی گفتگو کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ سلطان کو اطلاع دیجیے کہ ادھونی کا دیوان قدیموی کے لیے حاضر ہے۔“

یہ سنتے ہی محافظ سردار فوراً اسد علی خاں کو سلطان کے خیمہ پر لے گیا۔ سلطان نے اطلاع پاتے ہی اسے اندر بلا لیا۔

اندر اُس وقت اسد علی خاں کا بھیجا ہوا آدمی بھی موجود تھا۔ دیوان نے سلطان کو شاہی کورنش پیش کیا۔ سلطان نے مسکرا کے اسے اپنے بالکل قریب سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

دیوان اسد علی کے بیٹھنے پر سلطان نے گفتگو میں پہل کی:

”دیوان اسد علی۔ اہل قلعہ اور شہزادہ مہابت جنگ کی زبانی درخواست ہم تک تہہ اسے آدمی نے پہنچا دی ہے۔ ہم نے لشکر کو حکم دے دیا ہے کہ تا حکم ثانی قلعہ ادھونی پر نہ حملہ کیا جائے اور نہ محاصرہ کیا جائے۔“

دیوان نے لوگوں سے سلطان کے اخلاق کی جو باتیں سنی تھیں، سلطان ان سے بھی زیادہ بااخلاق نکلا۔

دیوان نے سلطان کے جواب میں کہا:

”سلطان معظم۔ آپ کی نوازش اور کرم فرمائی کے لیے میں اہل قلعہ، شہزادہ مہابت جنگ کی طرف سے آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

شہزادہ بہادر کا التماس ہے کہ آپ کے مقابلہ کی نہ تو ہم میں ہمت ہے اور نہ یہ ہماری خواہش ہے۔ قلعہ کے دروازے کھلے ہیں۔ آپ کا لشکر جب چاہے قبضہ کر سکتا ہے۔

شہزادے نے مزید درخواست کی ہے کہ انہیں اور شاہی حرم کو قلعہ ادھونی سے بچانے کے لیے نکل جانے کی اجازت اور ضمانت دی جائے تو مزید نوازش اور کرم نوازی ہوگی۔“

مہابت جنگ نے سلطان کا خط پڑھا تو ایک عجیب الجھن میں پھنس گیا۔ ایک طرف سلطان کا اہانت کہ اس نے قلعہ پر حملہ نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ دوسری طرف نظام دکن سے اس کی دوسری نئے داری۔ نظام اس کا سسر بھی تھا اور چچا بھی۔ اس صورت میں اگر وہ اپنی فوج سلطان کے والے کرتا تو نہ حیدر آباد واپس جاسکتا تھا نہ اہل خاندان کو منہ دکھا سکتا تھا۔

مہابت جنگ کے باپ بسالت جنگ اور نظام دکن میں نہ صرف جینی بھائیوں کا رشتہ تھا بلکہ وہ ایک زمانے سے ایک دوسرے کے سیاسی اور فوجی حلیف بھی چلے آتے تھے۔

ایک طرف تو دونوں بھائیوں کی رشتے داری اور سیاسی تعلقات کا تقاضہ تھا کہ وہ سلطان کی اس پیش کش سے انکار کر دے مگر دوسری جانب اس وقت قلعہ ادھونی کو بچانے کا سوال تھا۔ قلعہ کی حفاظت کے علاوہ مہابت جنگ کو وہ وقت بھی یاد تھا جب سلطان کے والد نواب حیدر علی مرحوم نے مہابت جنگ کے باپ بسالت جنگ کی مدد کی تھی۔

یہ واقعہ ۱۷۶۱ء کا ہے۔

یہ وہی سال ہے جب مرہٹوں نے احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں ایسی شکست کھائی تھی کہ شمال ہند میں ان کے اقتدار کا چراغ ہیبت کے لیے گل ہو گیا تھا۔ اس وقت حیدر آباد دکن آپس کی سازشوں کا شکار تھا۔ تخت و تاج دکن کے تین بھائیوں مہابت جنگ، بسالت جنگ اور نظام علی خاں امیدوار تھے اور ان کے درمیان خانہ جنگی ہو رہی تھی۔

اس خانہ جنگی کے نتیجہ میں مہابت جنگ قید کر دیا گیا اور باقی دو بھائی بسالت جنگ اور نظام علی خاں ریاست کے حکمران ہوئے۔

ان دونوں بھائیوں میں ریاست کا بٹوارہ ہمارے دریاے کرشنہ کے جنوب کا بڑا حصہ بسالت جنگ کے حصے میں آیا جس کا مستقر بھی ادھونی بنایا گیا جس کے سامنے اس وقت سلطان ٹیپو اپنے لشکر سمیت خیمہ زن تھا۔

بسالت جنگ کو جب پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی شکست کا حال معلوم ہوا تو وہ صوبہ مراٹر کو مرہٹوں سے واپس لینے کے لیے نکلا اور قلعہ ہو سکڑ کا محاصرہ کر لیا۔

بسالت جنگ چونکہ قلعہ کشائی کے حربوں سے واقف نہ تھا اور ہو سکڑ کا محاصرہ طویل کھینچتا جا رہا تھا اس لیے اس نے نواب حیدر علی خاں مرحوم سے مدد کی درخواست کی۔

نواب مرحوم اس وقت سلطنت میسور کے حاکم تھے۔ چنانچہ بسالت جنگ اور نواب مرحوم کے

سلطان نے کمال عنایت سے کہا:

دیوان اسد علی خاں۔ ہم نہ تو قلعہ کو برا کرنا چاہتے ہیں اور نہ اس پر قبضہ کے خواہشمند ہیں۔ ہمارا اختلاف مہابت جنگ سے نہیں بلکہ نظام علی خاں سے ہے۔ شہزادے کو اطمینان دلادو کہ ادھونی پر حملہ نہیں ہوگا۔ ہاں ہمارا لشکر شہر میں ضرور داخل ہوگا۔ اچھا فٹرد ہم مہابت جنگ کو تحریری جواب بھیجتے ہیں۔

سلطان نے میرمنشی کو بلا کر مہابت جنگ کو خط لکھوایا جس کے مندرجات ذیل میں ملتے ہیں:

”مجھے تم سے کوئی عداوت نہیں مگر چونکہ نواب نظام علی خاں نے بلاوجہ ہم سے چھڑ چھڑ شروع کر دی ہے اور مرہٹوں سے اتحاد کر کے اس سلطنت خدا داد کی تباہی پر مکر باندھ لی ہے۔ میں اس کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔

نظام کو اسلامی اخوت کا کوئی لحاظ نہیں۔ اس نے دشمنان اسلام کے ساتھ مل کر سازشیں کی ہیں۔ اس دفعہ نظام کی وجہ سے مرہٹے مسلمانوں کے معبودوں، مدرسوں، مسجدوں اور گھروں کو بے حرمت کر رہے ہیں۔ ابھی وقت ہے کہ نظام ہم سے اتفاق کر لے اور دونوں مسلم سلطنتیں باہم متحد ہو کر پونا پر چڑھائی کریں۔ ہم مذہب و ملت کی لڑج رکھتے ہوئے اللہ کی رضا اور خلق خدا کی فلاح کے لیے جہاد پر مکر باندھیں جو ایک مسلمان کی سرخروئی کا باعث ہے۔

اگر تم ہمارے ہمراہ رہو تو صرف اتنا کافی ہوگا کہ تم اپنی بہترین فوج کو ہمارے ساتھ بھیجو۔ دیکھو کہ ہم صرف دین متین کی سرپرستی اور رب العالمین اور رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے لیے امن قائم کرنے کی خاطر ان کافروں کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ اگر کوئی ساتھ نہ دے تو بھی ہم یہ فریضہ از خود بکا و تنہا انجام دیں گے۔

دیوان اسد علی خاں، سلطان کا یہ خط لے کر قلعہ ادھونی واپس ہو گیا۔

درمیان ایک معاہدہ ہوا کہ اگر نواب حیدر علی خاں قلعہ ہوسکوٹ کو فتح کر دیں تو دیگر شراٹو کے علاوہ قلعہ کا تمام سامان اور آلات حرب بسالت جنگ کو ملیں گے اور قلعہ ہوسکوٹ اور اس کے مضافات نواب مرحوم کو دیے جائیں گے۔

حیدر علی خاں مرحوم نے اپنے ناقابل شکست لشکر کے ساتھ چند ہی دنوں میں قلعہ ہوسکوٹ کو فتح کر لیا اور معاہدے کے مطابق قلعہ کا تمام سامان بسالت جنگ کے حوالے کر دیا گیا اور قلعہ ہوسکوٹ اور اس کے مضافات سلطنت میسور کا حصہ بن گئے۔

اس سلسلے میں میسور میں ایک روایت بہت مشہور تھی۔ وہ یہ کہ بسالت جنگ نے قلعہ ہوسکوٹ کا سامان اور تمام آلات حرب حاصل کرنے کے بعد سب کے سب نواب حیدر علی مرحوم کے ہاتھ فروخت کر دیے تھے اس لیے نواب مرحوم بسالت جنگ کو ہمیشہ "تاجر" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

اس واقعہ کا ذکر اس لیے بھی کیا گیا ہے کہ بسالت جنگ اور نواب مرحوم کے درمیان بھی دوستانہ مراسم تھے اور اسی وجہ سے ہابت جنگ کو کسی نتیجے پر پہنچنے میں دقت ہو رہی تھی۔ ہابت جنگ نے اس سلسلے میں دیوان سے کم ہی گفتگو کی اور سلطان کا خط لے کر اپنی بیوی شہزادی دکن کے پاس پہنچا۔

شہزادی سلطان کا خط پڑھ کر بہت متاثر ہوئی اور اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا: "کاش ابا حضور اعلیٰ حضرت نظام دکن اور سلطان ٹیپو کے لشکر متحد ہو سکیں۔"

"میں تمہاری اس دعا میں پوری طرح شامل ہوں شہزادی۔"

ہابت جنگ نے بیوی کی تائید کی:

"لیکن یہ خیال خام ہے۔ اعلیٰ حضرت کسی ایسے اتحاد کے لیے کبھی رضامند نہیں ہو سکتے نہیں معلوم ہے کہ سلطان نے ایک خط کے ذریعے اعلیٰ حضرت سے اس بات کی خواہش کی تھی کہ دونوں سلطنتوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ایک خاندان کے رٹ کے لڑکیوں کی شادیاں دوسرے خاندان کے رٹ کو لڑکیوں سے کر دی جائیں مگر اس کا کیا انجام ہوا؟"

شہزادی نے ایک ٹھنڈی سانس لی:

"اعلیٰ حضرت ابا حضور نے اس منصوبہ کو پسند فرمایا تھا مگر پتہ نہیں کہ عسکر کی شاہی خواہش کی کسی نے بھڑکا دیا کہ انھوں نے سلطان کے خاندان کو "بیچ" کر اس منصوبہ کو رد کر دیا۔"

"خیر ان باتوں کو چھوڑ دو۔ تم یہ بتاؤ کہ سلطان کو اس کا کیا جواب دیا جائے۔"

ہابت جنگ نے بات کو مختصر کیا:

"سلطان نے جواب کے لیے صرف آج رات تک کا وقت دیا ہے۔ اس کے بعد وہ پہلے

نہ پر قبضہ کر ہی گئے۔ پھر وہ کوئی بھی قدم اٹھانے میں حق بجانب ہوں گے۔"

"مگر سلطان نے قلعہ پر حملہ نہ کرنے کا بھی تو وعدہ کیا ہے۔" شہزادی نے یہ کہہ کر ہابت کی آدھی پریشانی ختم کر دی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو شہزادی۔"

ہابت جنگ بڑی مسرت سے بولا:

"جب تک ہم سلطان کو جواب نہیں بھیجتے تو قلعہ پر حملہ نہیں کر سکتے۔"

وہ رات بالکل سکون سے گزری۔

جب صبح کو سلطان کو قلعہ سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو اس نے لشکر کو ادھونی شہر پر قبضہ کرنے کا حکم دے دیا۔

شہر اگرچہ سلطانی لشکر کے گھیرے میں تھا مگر اس کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اتنا وعدہ دکانیں کھلتی تھیں اور لوگ خرید و فروخت میں مصروف رہتے۔ سلطانی فوجی بھی خریداری کے لیے بازار میں آتے اور قیمت ادا کر کے سامان لے جاتے۔

اب جو چاہم نوج شہر میں داخل ہوئی تو وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ عوام خوفزدہ ہو کر قلعہ کی طرف جاگ اٹھے۔

ہابت جنگ کو اطلاع دی گئی کہ شہر پر سلطانی فوج نے قبضہ کر لیا ہے اور عوام ہزاروں کی تعداد میں قلعہ کے دروازوں پر پناہ حاصل کرنے کے لیے جمع ہو گئے ہیں۔

ہابت جنگ نے حکم دے دیا کہ قلعہ کے تمام دروازے کھول دیے جائیں اور اس وقت تک کھلے رکھے جائیں جب تک تمام لوگ قلعہ میں داخل نہیں ہو جاتے۔

اس موقع پر سلطان کے سردار رستم جنگ نے دست بستہ عرض کیا:

"عاجیہ قلعہ ادھونی کے تمام دروازے کھلے ہیں۔ ہم بغیر قلعہ پر حملہ کیے یا ہتھیار اٹھائے

قلعہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ حضورِ علیؑ سے اجازت کی درخواست ہے۔

سلطان نے رستم جنگ کو گھور کے دیکھا۔

وہ مزید کچھ کہنے کو تھا کہ موسیٰ لالی، جو سلطان کے ماتحت فرانسیسی دستوں کا سالار تھا

ادب سے بولا:

"سلطان۔ آپ نے قلعہ پر حملہ نہ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ رستم جنگ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم اس وقت بغیر حملہ کیے قلعہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ قلعہ کے اندر داخل ہونے کا یہ بڑا اچھا بہانہ ہے۔"

"موسیٰ لالی!"

سلطان نے سخت لہجہ میں کہا:

"تم ہمارے وعدے کو بھٹلانا چاہتے ہو۔ ہم قلعہ میں داخل ہو گئے تو کل ہی کہا جائے گا کہ سلطان نے قلعہ دار کو فریب دے کر قلعہ پر قبضہ کیا۔"

مہابت جنگ نے ہمارے وعدے کا اعتبار کرتے ہوئے بے خوف و خطر اپنے حوام کے لیے قلعے کے دروازے کھول دیے ہیں۔ ہم اس کے اعتماد کو مجروح نہیں کر سکتے۔ خبردار! ایک۔ پاسی بھی قلعہ میں داخل نہ ہو۔"

قلعہ دوپہر تک کھلا رہا

مگر۔

سلطان نے اپنے وعدے کے مطابق قلعہ پر قبضہ نہ کیا۔

مہابت جنگ نے نواب نظام الملک والی دکن کو اسی وقت خبر بھجوا دی تھی جب سلطان کا لشکر بنگلور سے ادھونی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ نظام نے داماد اور بیٹی کی حفاظت اور مدد کے لیے ایک لشکر ادھونی کی طرف روانہ کر دیا تھا۔

اس ملک کے آنے کی اطلاع جہ سلطان کو ملی تو اس نے حیدر حسین بخشی اور غازی خاں کو ایک لشکر کے ساتھ بھیجا کہ وہ ملک کو قلعہ تک نہ پہنچنے دیں۔

حیدر بخشی اور غازی خاں نے آگے بڑھ کر حیدر آباد سے آنے والی ملک کے راستے میں اپنے مورچے قائم کر لیے۔

حیدر آباد کی فوج کے سردار مشیر الملک اور سیف جنگ تھے۔ انہوں نے آتے ہی حیدر بخشی

اور غازی خاں کے مورچوں پر حملہ کر دیا۔

یہ حملہ اس قدر زوردار تھا کہ حیدر بخشی اور غازی خاں اس کی تاب نہ لا سکے اور سپاہیوں کو واپس ادھونی پہنچ گئے۔

ادھر مشیر الملک اور سیف جنگ کو معلوم ہو گیا کہ سلطان بیٹو قلعہ کا محاصرہ کیے پڑا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی رفتار رستہ کر دی اور جنگی حکمتِ علی پر غور و خوض کرنے لگے۔ انیس یہ بھی بتایا گیا کہ سلطان ایک رستہ بڑے لشکر کے ساتھ ادھونی آیا ہوا ہے۔

ادھر یہ لوگ سلطان کے بارے میں سوچ رہے تھے ادھر سلطان نے فیصلہ کیا کہ حیدر آباد سے آئی ہوئی ملک کو قلعہ تک صحیح سلامت نہ پہنچے رہا ہے۔ اسے حیدر بخشی اور غازی خاں کی شکست کا بدلہ بھی لینا تھا۔ چنانچہ سلطان لشکر لے کر اپنے مورچوں سے نکلا اور دم کے دم میں گئے والی ملک کے سر پر پہنچ گیا۔

سلطان نے مشیر الملک اور سیف جنگ کے مقابل آنے ہی توپ خانے کو گولہ باری کا حکم دے دیا۔

پھر تو سلطانی توپ خانے نے غنیم پر اس قدر شدید گولہ باری کی کہ حیدر آبادی لشکر درہم برہم ہو گیا اور یہ شکست خوردہ اور تتر بتر لشکر بھاگتا ہوا قلعہ ادھونی پہنچا اور وہاں پناہ حاصل کی۔

سلطان نے اپنے لشکر کو تعاقب سے روک دیا۔ وہ چاہتا تو حیدر آبادی ملک کو چاروں طرف سے گھیر کر پوری طرح ختم کر سکتا تھا لیکن اس کا ادھونی کا محاصرہ بھی عجیب طرح کا تھا اور یہ جنگ بھی عجیب ہی تھی۔

سلطان نے شکست خوردہ فوج کو خود قلعہ کی طرف بھاگنے اور دہاں جا کے پناہ حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا۔ دشمن کے میدان چھوڑ جانے کے بعد سلطان اپنے مورچوں کے اندر واپس آ گیا۔

مہابت جنگ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا یا اور جب سلطان مشیر الملک اور سیف جنگ کی فوجوں سے ہندوستان تھا تو مہابت جنگ مع شاہی حرم اور دیگر سرداران فوج اور امرا کی ٹہنڈ کے راہچرر روانہ ہو گیا۔

مہابت جنگ اور غازی خاں نے آتے ہی حیدر بخشی

کی بیٹی کو یہ خیال بنا کہ نظام پر دباؤ ڈال سکتا تھا۔
لیکن۔

سلطان نے ان دونوں میں سے ایک کو اپنی بیٹی کا
غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کا یہ رویہ انتہائی شریفانہ اور مدبرانہ تھا۔ اس کا
خیال تھا کہ نظام دکن میں ذرا سی بھی غیرت یا شرافت ہوگی تو وہ اس کے اس سلوک کے
بدلے میں سلطنت خداداد سے اگر معاہدہ نہ بھی کرے گا تو کم از کم اس کی مخالفت ہی سے
باز آجائے گا مگر نظام نے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اس کے داماد اور بیٹی کو سلطان نے قلعہ
ادھونی میں نظر بند کر رکھا ہے، بجائے سلطان سے نرم رویہ اختیار کرنے کے مشیر الملک اور
سیف جنگ کو لشکر دے کر قلعہ ادھونی بھیج دیا۔
اس کا یہ خیال کس قدر غلط اور ناقابل اندیشہ تھا۔ سلطان کی جگہ اگر کوئی دوسرا
حلیہ اور ہوتا تو پہلے ہی دن قلعہ ادھونی کی اینٹ سے اینٹ بکادیتا۔

دوسرے دن سلطان نے قلعہ ادھونی پر یورش کا حکم دے دیا۔ ادھونی کا قلعہ بہت مضبوط
تھا۔ محبت جنگ نے اسی لیے اسے اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ وہاں ایک بڑا لشکر بھی موجود تھا
اور اب توحید راہو کا شکست خوردہ لشکر بھی وہاں پہنچ چکا تھا لیکن وہ سلطان کے طوفانی حملے
کا ایک دن سے زیادہ مقابلہ نہ کر سکے اور ہتھیار ڈال دیے۔
اس قلعہ کی جنگ اور فتح کے سلسلہ میں ایک دوسرا مؤرخ اس طرح رقم طراز ہے:
"اٹھارہ دن کی سخت لڑائی اور محاصرہ کے بعد قلعہ ادھونی جو
نہایت مضبوط اور ناقابل تسخیر خیال کیا جاتا تھا، سلطان فیوجن
نے فتح کر لیا۔"

مؤرخین کا یہ اختلاف یقیناً محل نظر ہے۔ قلعہ ادھونی ضلع بلاری میں واقع ہے۔ یہ قلعہ
راجگان وجیانگر کا بنایا ہوا اور نہایت مضبوط و ناقابل تسخیر تھا۔ محبت جنگ قلعہ سے جاتے
وقت پورا خزانہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اس لیے بال غنیمت میں بسالت جنگ مرحوم کا لکھنؤ
اور اسلحہ خانہ سلطان کے ہاتھ آیا۔ سلطان نے پورا کتب خانہ سرنگاپٹم بھجوا دیا۔

سلطان نے قطب الدین خاں کو قلعہ ادھونی کا قلعدار اور دولت رائے کو ادھونی کا صوبیدار
کر کیا۔ قلعہ اور اطراف کی پہاڑیوں کے پائیں حصار (فصلیں) سب توڑ دیے گئے۔
ادھونی سے خارج ہو کر سلطان کپین گڑھ پہنچا۔

میاں کی رانی سلطنت خداداد سے سرکشی اختیار کر چکی تھی۔ اس معرکے میں وہ خود توفرار
دہلی اس کا بیٹا گرفتار ہوا۔ یہ "صاحب جامع اوراق" کے مطابق بعد میں مسلمان ہو گیا اور اس کا
اٹل مردان خاں رکھا گیا۔

اس وقت تک موسم برسات شروع ہو چکا تھا اور ندی نالے آٹھ نکلیں دکھارہے تھے۔
ہاڈوں میں طغیانی آگئی تھی۔

سلطان جلد سے جلد نظام اور مرہٹوں کو ان کی یلغار کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن بارش نے
اس کا راستہ روک لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دربار کو ضرور عبور کرے گا تو نہ اس پار اس کا
امرداد برہان الدین دشمنوں میں گھرا ہوا جنگ کر رہا تھا۔

سلطان اپنے چند سرداروں کو لے کر دریائے تنگ بھدر کے کنارے پہنچا۔ دربار میں طغیانی
لڑ ہوئی تھی اور دوسرا کنارہ مشکل سے نظر آتا تھا۔

سلطان نے سرداروں سے دریافت کیا:

"ہمارا ارادہ دربار پار کر کے برہان الدین کو مدد کو پہنچنے کا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

سلطان معظم: "ایک سردار نے منات سے جواب دیا:

"دربار میں طغیانی آئی ہوئی ہے۔ اوپر سے موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ ایسے میں دربار پار
رہنا مناسب نہیں ہوگا۔"

سلطان نے دوسرے سردار کی طرف دیکھا۔

اس نے بھی دست بستہ عرض کیا:

"عالی جاہ۔ دریائی طوفانی موجوں میں لشکر دربار پار نہیں کر سکتا۔ اگر فوج کو کشتیوں پر ٹھکانے
لا صورت میں بھیجا جائے تو اس پار موجود دشمن انہیں آسانی سے ختم کر سکتا ہے۔ چند روز انتظار
رہنے میں کوئی حرج نہیں۔"

سلطان نے تیسرے سردار کو دیکھا تو اس نے سب سے زیادہ بھیانک صورت پیش کی۔
وہ نے بڑے اطمینان سے کہا:

مالی جاہ۔ دریا پار سہری پنت پھڑکیا اور نظام کا لشکر جس میں ایک لاکھ سوار اور ہتھیارے ہیں، نیچے گاڑے پڑا ہے۔ اگر ہم نے کشتیوں میں دریا پار کرنے کی کوشش کی تو رگڑاؤ سے لگا اور ہمارے اُن گنت لشکری بے موت مارے جائیں گے۔

سلطان کو اپنے سرداروں کا کوئی مشورہ پسند نہ آیا۔ اس نے ذرا تلخ لہجے میں کہا: دریا اور پہاڑ لشکروں کے رستے نہیں رد کا کرتے۔ ہم اپنے ایک جاں نثار سردار (۱) کو دشمنوں کے نرغے میں زیادہ دن اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔

دوسرے دن سلطان دو پیادہ رجمنٹوں کے ساتھ کشتیوں پر سوار ہوا اور دریائے تگہ کی موجوں سے لڑتا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

اُدھر پہنچتے ہی سلطان نے ایک بلند جگہ پر اپنا علم نصب کر دیا۔ پھر تمام کشتیوں کو سوار لائے کو بھیج دیا۔ پھر تو لشکریوں کے دریا پار کرنے کا تنا بندھ گیا اور چار دن کے اندر لشکر دریا پار پہنچ گیا۔

اس موقع پر سلطان ٹیپو نے کہا:

"آئندہ جو لوگ دریا پار کرنا چاہیں انہیں بھی سب سے پہلے پیادہ

فوج کو دریا پار اتارنا چاہیے۔ اس کے بعد سوار فوج کو اور پھیر

دوسرے لوگوں کو بھیجنا چاہیے۔"

سلطان کے دریا پار کرنے کے سلسلے میں میسور میں ایک روایت بہت مشہور ہے روایت ہے کہ سلطان نے طغیانی کی وجہ سے دریائے تگہ بھر دیا پار کرنے کے لیے دو روز انتظار کیا مگر جب دریا طغیانی میں کوئی فرق نہ پڑا اور پانی کم ہونے کے آثار دکھا دیے تو سلطان نے توجہ کو حکم دیا:

"یہ دریا ہمارے دشمن کا ہر دل دستہ ہے جو ہمارا ستہ رد کر رہا ہے۔ اس لیے دریا اکیس گولے مارے جائیں!"

سلطان کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ توپ کے اکیس گولے دریا میں پھینکے گئے اور قدرتِ الہی کہ گولے پھٹتے ہی دریا کا پانی کم ہونے لگا اور دریا پایاب بن گیا۔

اس واقعے کا لشکر اور دوسرے دیکھنے والوں پر ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے اسے سلطانِ کرامت قرار دیا اور اس کی فتح و نصرت کے نعرے لگائے۔

سلطان دریا پار پہنچا تو سہری پنت (پنڈت) اور دشمن کے دوسرے سپہ سالار دریائے پارچا کے کنارے بیٹھے اور انہوں نے فوجی جنگل اور پہاڑ میں پناہ لی۔

دشمن نے تین چار روز خاموشی سے تیاری کے بعد سلطان پر حملہ کیا مگر یہ حملہ سپاہیوں کے لیے طرح تین چار حملے ہوئے جو سب کے سب سپاہیوں کو دیے گئے۔

اب سلطان نے شب خون کا منصوبہ بنایا اور ہمارا زخاں کو سوار دستے دے کر بھیجا۔ سلطان اودھی نصف راستہ تک ساتھ گیا تاکہ وہاں ٹھہر کر رہنمائی کر سکے مگر دشمن کو خبر ہو گئی اور اس نے گولہ باری شروع کر دی۔ جواب میں سلطان فوجی توپ خانہ نے بھی گولہ باری کی لیکن یہ شب خون ناکام ہو گیا۔

اگلے دن مرہٹے اپنا توپ خانہ لے کر سلطان کے مقابلے پر آئے اور تیس توپوں سے گولے برمانا شروع کیے۔ سلطان کے توپ خانہ نے بھی جوابی گولہ باری کی۔

اس وقت سلطان نے ایک طرف سے ہمایوں زخاں اور حسین علی خاں کے ماتحت غازی خاں، دلی محمد خاں کابلی، ابراہیم خاں اور کابل خاں سپہ سالار کو اپنے دستوں کے ساتھ اور دوسری طرف سے قادر خاں، امام خاں اور میر محمد کو آگے بڑھایا۔

دونوں بازوؤں سے یہ دستے اس طرح آگے بڑھے کہ مرہٹے فوج ان کے گھیرے میں آ گئی۔ میران پر ایسا دباؤ پڑا کہ مرہٹے سردار اپنے بال بچوں کو میدان میں پھوڑ کے جانیں بچانے کے لیے جاگ کھڑے ہوئے۔

سلطان اس معرکہ میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ بھگنے والے سرداروں کی خواتین امیر کے اس کے سامنے پیش کی گئیں۔

سلطان نے ان خواتین کے ساتھ نہایت عزت اور شفقت کا برتاؤ کیا اور انہیں زرد جو اہر دے کر یونہی بھجوا دیا تاکہ وہ دہاں جا کر صلح و شہنشاہی کا پیغام دیں۔

سلطان نے یہاں سے کوچ کر کے بالا پور کی ندی کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ مرہٹے بھی وہاں سے تین میل دور پر ایک جنگل کے نامے ٹھہرے ہوئے تھے۔ سلطان نے غازی خاں کی سپہ سالاری میں امام خاں، فاضل خاں اور میر محمد کو ایک لشکر کے ساتھ دشمن پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔

غازی خاں نے وہاں پہنچ کے ایک بڑی دلچسپ ترکیب آزادی۔

غازی خاں نے سپاہیوں کو کھیل اڈھا کر راتوں رات جنگل کے راستے سے مرہٹہ فوج کا عقب میں پسپا کیا۔ یہ مرہٹوں کی چھاپہ مار فوج تھی۔ اس نے سلفانی دستوں کو روکا اور ان کی اپنی ساخت کمرانے کو کہا۔

غازی خاں بڑی روانی سے مرہٹی زبان بولتا تھا۔ اس نے مرہٹہ سردار کو بتایا:

"ہمیں نظام کے راجپوت سے ملک کے طور پر بھجوا ہے۔"

مرہٹوں کو معلوم تھا کہ نظام کو کئی کچھ اور داماد قلعہ ادھونی چھوڑ کے راجپوت فرار ہو گئے۔ اس لیے انہیں غازی خاں کی بات کا اعتبار نہ کیا پڑا۔ وہ خوشی خوشی غازی خاں اور اس کے فوجی دستہ کو اپنے لشکر میں لے گئے۔

جب غازی خاں وغیرہ مرہٹہ لشکر کے درمیان میں پہنچے تو انہوں نے بند دہلیں سیدھی کیا اور نعرہ مار کر مرہٹوں پر گولیوں کی بارش کر دی۔

مرہٹے اس اچانک حادثے سے گھبرائے اور اپنے حواس کو بچھڑے۔ ان کی بھجھکی نہ آ رہی تھی۔ گویا ان کو نکل چلا رہا ہے اور کدھر سے آ رہی ہیں۔ ان پر ایک دم سلطان بٹیکو کی دھمکتا ہو گئی۔ وہ بھی سمجھے کہ سلطان کا لشکر اپنا ملک واپس آ رہا ہے اور مرہٹوں کو گولیوں سے بھونک رہا۔ اس بدحواسی کے عالم میں وہ جہاں تھے اور جس حال میں تھے اسی طرح گھوڑوں کی تنگی پڑا۔ سوار ہو کر بھاگ نکلے۔ ان کے ساتھ خواتین بھی تھیں مگر ان کی جانوں پر ہتی تھی۔ وہ ان کی طرف توجہ دے بغیر جس کا جدھر منہ اٹھا، ادھر بھاگ نکلے۔

غازی خاں اس ہم میں کامیاب و کامراں ہو کر سلطان کے پاس پہنچا۔ اس کے ہمراہ مرہٹہ سرداروں کی بیویاں، بیٹیاں اور بہنیں بھی تھیں۔ سلطان نے ان تمام خواتین کو پاکیزوں میں بٹھا کر اپنے کے لشکر میں بھجوا دیا۔

ان خواتین کے ساتھ سلطان نے خفیہ طور پر ہری پنت پھرت کیا اور دامادھو کو چار اٹھی اور تیز رفتار گھوڑے تحفہ کے طور پر بھجوا کر انہیں اپنا ممنون احسان کرنے کی کوشش کر دی۔

چونکہ غازی خاں اور اس کے دستوں نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا تھا اس لیے سلطان نے سب کو "فر" انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔

مرہٹہ خوجیں دریائے ننگ بھدرا کے میدان سے شکست کھا کر بھاگے تو سیدھی شا

تپنیں، جہاں نظام کی فوجیں ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

مرہٹوں نے حاکم شاہنور عبدالحمیم سے سازش کر کے قریب ہی ایک تالاب کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔

دوسری طرف سلفانی لشکر بھی شاہنور کی طرف بڑھا۔ عبدالحمیم خاں کو سلفانی لشکر کے آنے کی خبر ملی تو وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ مرہٹہ لشکر میں چلا گیا اور شہر میں اپنے بیٹے خیر الدین عرف "خیرا" کو چھوڑ گیا۔

اسی رات سلطان شاہنور کے سامنے آ کر خیمہ زن ہوا۔ اس نے میر صادق اور مہدی خاں کو شہر میں سامان رسد اکٹھا کرنے کو بھیجا۔ یہ دونوں اپنے دستوں کے ساتھ حکیم خاں کے محل پر پہنچے اور نقد و جنس، فرش فروش، ظروف و اسلحہ، طرزیہ جو کچھ ان کے ہاتھ لگا وہ سب اٹھا لائے اور اس سامان کی ایک فہرست بنا کر سلطان کو پیش کر دی۔

عبدالحمیم خاں کا بیٹا خیر الدین عرف خیرا خود ہی سلطان کے سامنے پیش ہو گیا۔

سلطان نے اس سے کہا:

"تمہارے باپ کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ وہ در بدر مارا مارا پھر رہا ہے۔ ہم نے احمقے مارا کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ عزیزداری کا لحاظ کر کے ہم سے مراعات دینا چاہتے ہیں مگر اسے ہتہ نہیں کیا ہو گیا ہے کہ ہمارا ساتھ دینے کے بدلے دشمنوں سے ساز باز کر کے ہماری مخالفت پر کمر باندھ رہا ہے۔ اس کا خیازہ وہ ضرور بھگتے گا۔"

سامان رسد حاصل کرنے کے بعد سلطان شمال میں جوبن گڑھ میں جا خیمہ زن ہوا۔ یہاں

اس نے لشکر کو چند روز آرام دیا۔ پھر لشکر کی تنظیم نو کی۔

سلطان نے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ اس طرح مرحہ لشکر میں سوار اور پیادوں کے علاوہ پندرہ توپیں تھیں۔ سلطان نے ہر لشکر پر ایک سالار مقرر کیا:

ایک حصہ لشکر پر میر الدین سید صاحب،

دوسرے پر برہان الدین،

تیسرے پر مامیڑا خاں اور حسین علی خاں میر بخش کو سالار مقرر کیا گیا۔ خود سلطان چوتھے اور بڑے لشکر کے ساتھ جوبن گڑھ میں ٹھہرا تا کہ دشمن کے قلب لشکر پر حملہ کر سکے۔

اس انتظام کے بعد ایک شب جب کہ مولادھار بارش ہو رہی تھی، سلطان نے تمام

لشکروں کو دشمن پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھایا۔
دشمن اس دھڑال دھار بارش میں کسی حملے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا مگر سلطان نے اس موقع سے فائدہ اٹھا یا اور لشکر کو جملہ کا حکم دے دیا۔
یہ خیال رہے کہ اس وقت تک دائرہ بیس کی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور لشکر کے مختلف حصوں تک پیغام رسانی کا کام ہندوئی کی گولیوں یا توپ کے گولوں سے لیا جاتا تھا۔ سلطان نے بھی اپنے اشارے مقرر کر رکھے تھے جن سے ہندو فوجیوں اور توپچیوں کے سردار آگاہ رہتے تھے۔
مرہٹہ لشکر، سلطان افواج سے کچھ زیادہ دور نہ تھا اس لیے سلطان نے طلایہ کو اپنے ساتھ ہی رکھا تھا۔

سب سے پہلے سلطان نے اپنا لشکر آگے بڑھایا۔ تھوڑی سی دیر بعد سلطان کا طلایہ دشمن کے طلایہ کے ساتھ پہنچ گیا۔
چونکہ رائے کا وقت تھا اور بارش کا طوفان اٹھا ہوا تھا۔ ایسے میں دشمن کا طلایہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ اس کے سامنے آنے والے سوار دھنسنے کش لشکر کے ہیں۔
پس۔

دشمن کے طلایہ کے سواروں میں سے ایک نے آواز دے کر پوچھا:
"تم لوگ کون ہو اور تمہارا تعلق کس لشکر سے ہے؟"
چونکہ سلطان اپنے طلایہ دستوں کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا اس لیے اس کے طلایہ کے سواروں نے اپنی زبانیں بند رکھیں۔
دشمن کو جب کوئی جواب نہ ملا تو اس کے سوار کچھ اور آگے بڑھ آئے اور انھوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

اس وقت تک سلطان اپنے طلایہ کے بالکل برابر پہنچ گیا تھا اور اس نے اندازہ لگایا تھا کہ دشمن کے طلایہ سواروں کی تعداد دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں۔ اس لیے اس نے فائدہ کھولنے کا حکم دے دیا۔

لے طلایہ ان فوجی دستوں کو کہا جاتا ہے جو لشکر کے آگے آگے چلتے ہیں اور دشمن کی خبر دیتے ہیں۔ انہیں گشتی دھنسنے کو کہتے ہیں۔

اس اچانک فائرنگ سے دشمن کے طلایہ کے بیشتر سوار مارے گئے۔ کچھ بڑا گڑبگڑا۔
مگر فائر ہوئے۔
سلطان نے ان بھاگنے والوں کا تعاقب کیا اور دشمن کے کیمپ کے بالکل قریب پہنچ گیا۔
اس وقت سلطان نے ایک توجہ کی گولہ داغنے کا حکم دیا۔
یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ سلطان کی توپ کی آواز سننے ہی پر لشکر بھی اپنے اپنے ہدف پر حملہ کر دیں۔

اس توپ کے جواب میں صرف ایک جانب سے توپ رانی گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ صرف ایک لشکر اپنے ہدف پر پہنچ سکا ہے۔ باقی لشکریوں کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔
سلطان کو اس وجہ سے پریشانی لائن ہوئی کہ خدا معلوم دوسرے لشکریوں پر کیا گزری مگر وہ مردوں کے جواب کا انتظار بھی نہ کر سکتا تھا اس لیے کہ اس کا لشکر دشمن کے کیمپ تک پہنچ چکا تھا۔
ایسے وقت میں اگر وہ کیمپ پر حملے میں تاخیر کرتا تو وقت نکل جاتا اور اسے فائدہ سے کھاتے نقصان پہنچ سکتا تھا۔
سلطان نے اللہ کا نام لے کر توپ نالے کو گولہ باری کا حکم دے دیا اور دشمن کے کیمپ میں داخل ہو گیا۔

اسی وقت سلطان نے باقی مرداروں کے لشکروں کی توپ کے الگ الگ فائر کی آواز سنی۔
یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ بھی اپنے اپنے ہدف پر پہنچ چکے ہیں۔
اب صبح کی سفیدی نمودار ہو گئی تھی۔

سلطان دشمن کے کیمپ میں صرف تین سو سپاہیوں اور اسے توپ کے ساتھ داخل ہوا تھا۔
مگر جلد ہی اس کا پورا لشکر اس کے پاس پہنچ گیا۔
اس اچانک اور بالکل غیر متوقع حملے سے دشمن نے گھبراہٹ کا شریعہ شروع کر دیا اور سامنے کی پہاڑیوں پر چڑھ گیا۔

صبح نو بجے کے قریب بھاگنے والے پہاڑیوں سے اترے اور ایک جگہ جمع ہو کر انہوں نے اپنی صف بندی کی۔ ان کا لشکر لا تعداد تھا چنانچہ وہ بڑی توپوں سے گولے برساتے۔ پتھروں اور کیمپوں کی طرح جھنجھٹاتے اور شور مچاتے آگے بڑھے۔
سلطان کے ساتھ اگرچہ بھاری توپ، خانہ قیامت اس نے اسے خاموش رکھا اور مٹی کی توپوں کے

دستہ کو حکم دیا کہ وہ گولے برساتیں اور ان توپوں کو نشانہ بنائیں جو نزدیک پہنچ رہے ہوں۔ سلطان کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کو اسی غلط فہمی میں رکھا جائے کہ اس کے پاس بھاری توپ، خانہ نہیں ہے اور صرف چند چھوٹی توپیں ہیں جنہیں وہ استعمال کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ دیر ہو کر آگے بڑھ آئے گا اور اس وقت اس پر بڑی توپوں کا فائر کھول کر نقصان پہنچایا جائے جو ناقابلِ یقین ہو گا۔

سلطان کی سوچ بالکل صحیح تھی۔

دشمن کو جب اپنی بڑی توپوں کا جواب نہ ملا تو اسے گمان ہوا کہ سلطان کے ساتھ بڑا توپخانہ نہیں ہے اور وہ صرف چند چھوٹی توپوں کے ساتھ حملہ آور ہوا ہے۔ اس خیال کے واضح ہوتے ہی دشمن نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہ منصوبہ سلطان نے حملہ سے پہلے بنایا تھا اور باقی لشکر دل کو اچھی طرح ذہن نشین کر دیا تھا۔ جب سلطان کے خیال کے مطابق دشمن پوری طرح اس کی بڑی توپوں کی زد میں آ گیا تو اس نے بھاری توپ خانے کو گولہ باری کا حکم دیا۔

اور اسے گولہ باری شروع ہوتے ہی سلطان کے مجوزہ منصوبے کی ہدایت کے مطابق اس کے باقی لشکروں نے بھی بڑی توپوں سے بیک وقت دشمن پر چاروں طرف سے فائر کھول دیا۔ اس وقت اس فائر گولہ باری ہوئی کہ دم کے دم میں ہزاروں مرٹے موت کے گھاٹ اُتہ گئے۔ لشکر بکوں کے علاوہ اس جنگ میں دشمن کے دو ہزار گھوڑے اور تین ہاتھی بھی مارے گئے چند ہی گھنٹوں بعد دشمن میدان سے نکل گیا۔

مرٹے میاں سے سپاہ ہو کر چھ کوس پیچھے ہٹ گئے۔ سلطان بھی لشکر کو لے کر اپنے کیمپ میں آیا اور دو روز تک سلطانی لشکر آرام کرتا رہا۔

پھر سلطان کو خبر ملی کہ دشمن نے شاہنور کے قریب در کے دائیں کنارے پر بڑا دیکھا ہے چنانچہ سلطان بھی اپنے لشکر کو لے کر وہاں پہنچا اور دشمن کے مقابل اپنی لشکر گاہ قائم کی۔ چونکہ عید میں صرف تین چار دن باقی تھے اس لیے سلطان نے جنگ سے گریز کیا اور لشکر کو عید تک آرام کرنے دیا۔

عید کے دوسرے دن سلطان جنگ کے لیے نکلا۔ اس دفعہ اس نے بان داروں کو سواروں کے آگے رکھا اور لشکر کے پیسرہ کو شاہنور کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔

سلطانی لشکر کی اس نقل و حرکت کو دیکھ کر مرٹوں نے اپنی اس فوج کو واپس بلایا جو خاص شاہنور میں کیمپ لگائے ہوئے تھی۔

سلطانی لشکر کو یہیں ایک دلچسپ خبر ملی۔

پہلے بتایا گیا ہے کہ سلطان کے لشکر کی آمد کی خبر سن کر والی شاہنور عبدالعظیم خاں اپنے بیٹے خیر الدین عرف خیر کو قلعہ میں چھوڑ کر معززانہ اور میگات کے مرٹہ کیمپ میں چلا گیا تھا۔ وہ مرٹوں اور نظام سے عازباز کر کے سلطان کا مخالف ہو گیا تھا اس لیے اسے خیال تھا کہ مرٹے نہ صرف اس کی جان و مال کی اچھی طرح حفاظت کریں گے بلکہ اسے عزت بھی دیں گے۔

اس کے ان مرٹہ دوستوں نے اس کے ساتھ بالکل اٹنا سلوک کیا۔ انہوں نے عبدالعظیم سے پر خزانہ تحفے لیا اور صرف پہننے کے چند کپڑوں اور چند سورتوں کے ساتھ اسے ایک دستہ کی حفاظت میں ریاست میراج کی طرف روانہ کر دیا۔

خود مرٹہ لشکر کبیل کی طرف فرار ہو گیا۔

سلطان نے بھی اپنا کیمپ شاہنور سے اٹھا کر بنکا پور میں لگالیا۔ شاہنور کی حفاظت کے لیے سلطان نے صرف ایک چھوٹا سا دستہ بھجوا دیا تھا۔

چونکہ بنکا پور میں سلطان کا قیام آدو ہفتہ سے بھی زیادہ رہا اس لیے کہ محرم کا عید نہ شروع ہو گیا تھا اور سلطان محرم کے پہلے عشرے میں جنگ سے پرہیز کرتا تھا۔

عشرہ محرم کے روز بعد سلطان کی خدمت میں سرداروں نے ایک ساتھ تین تین نذریں گزاریں۔ ایک نذر عید الفطر کی تھی جو جنگ کی وجہ سے پیش نہ کی جاسکی تھی۔

دوسری نذر فتح شاہنور کی تھی۔

اور تیسری نذر شہزادہ نظام الدین کی ولادت باسعادت کی تھی۔

سلطان نے بنکا پور کے قیام کے دوران ہی ایک خط مرٹہ سردار کو بھیج کر ان کے پاس صبحا جو دشمنوں میں سب سے زیادہ بہادر سمجھا جاتا تھا۔

خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا کہ

اگر نظام علی خاں یہاں ہوتا تو میں اسے غائب کرتا۔ اس کے نہ ہونے کی وجہ سے میں تمہیں محاطہ کر رہا ہوں۔

اس جنگ سے کیا حاصل جس میں ہزار ہا مخلوقِ خدا ماری جا چکی ہے
اس کے فیصلے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ کا اور میرا لشکر آمنے
سامنے کھڑا ہو۔ پھر سپاہی سے سپاہی اور مردار سے مردار جنگ
کرنے یا پھر دونوں لشکروں کے درمیان صرف میں اور آپ جنگ کریں
جو غالب رہے فتح اس کی سمجھی جائے۔

سلطان کے اس خط کا شکوہ ہیکر پر تو کوئی اثر نہ ہوا مگر جب اس خط کا مضمون عام ہوا اور لوگوں
کو سلطان کے خیالات سے آگاہی ہوئی تو بہت سے پندارے اور پالیگا درمہٹے لشکر کو چھوڑ کر سلطان
سے آئے۔

سلطان کو اسی دورانِ باسوسوں نے اطلاع دی کہ دشمن کپیل اور قلعہ بہادر بندے کے اس
طرف قیم ہے اور یہ قلعہ بہت مضبوط ہے۔

سلطان نے اس اطلاع سے باخبر ہوتے ہی اپنا پڑاؤ یہاں سے اٹھا کر قلعہ بہادر بندے کا
مُرخ کیا اور وہاں پہنچ کر اپنی ایک ڈویژن فوج کو قلعے کا محاصرہ کرنے کا حکم دیدیا۔ تاکہ قلعہ والوں کو
باہر سے کمک نہ مل سکے۔

سلطان نے قلعہ پر گولہ باری کا حکم دیا اور سلطانی توپ خانہ قلعہ پر آگ اگلنے لگا مگر قلعہ کی
فصیل دراصل پہاڑ کاٹ کر بنائی گئی تھی اس لیے گولہ باری کا اس پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔
اب سلطان نے دھرمی ترکیب سوچی اور کچھ سپاہیوں کو فصیلِ قلعہ کے قریب چھپ جانے کا
حکم دیا گیا۔

ان سپاہیوں سے کہا گیا کہ صبح اذان کے بعد جب حملہ کا اشارہ ہو تو وہ فصیل پر چڑھنے کی
کوشش کریں۔

سلطان کے حکم پر صبح کو عمل شروع ہوا۔
نمائے فخر کے بعد بان داغ کر حملہ کا اشارہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میدان میں نصب سلطانی
توپ خانہ نے قلعہ پر گولوں کی بارش شروع کر دی۔
یہ بڑی شدید گولہ باری تھی لیکن دشمن نے بھی گولوں کا جواب گولوں سے دیا اور جنگ میں
انتہائی شدت پیدا ہو گئی۔

اس وقت فصیل کے قریب چھپے ہوئے سپاہیوں نے کندیں پھینک کر قلعہ پر چڑھنے کو

کوشش شروع کر دی لیکن قلعہ پر گولہ باری کے باوجود فصیل پر موجود دشمنوں نے اوپر چڑھنے والوں پر
بڑے بڑے پتھر ٹھکانے شروع کر دیے۔ اس سے سلطانی لشکر کی کئی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔
اس کے علاوہ فصیل پر برہمچوں کی آڑ میں پرشیدہ سپاہی بندو قوں سے بھی ان اوپر چڑھنے والوں
پر گولیاں برسا رہے تھے۔

کہتے ہیں کہ سپہ سالار وہی ہے جو عین وقت پر سوچے اور اس پر فوراً عمل کرے۔
سلطان نے پھر ایک حکمتِ عملی آزمائی۔ اس نے دو توپچیوں کو حکم دیا کہ وہ قلعہ پر گولہ باری
کرنے کے بجائے صرف اس آدمی کو نشانہ بنائیں جو انہیں فصیل پر نظر آئے۔

چنانچہ ان توپچیوں نے تاک تاک کر نشانہ لگانے شروع کیے اور کچھ ہی دیر بعد ان کا ایک
گولہ قلعہ دار پر گرا جو ایک برج میں سے جا بک رہا تھا۔ گولہ لگنے ہی قلعہ دار کا ماتم ہو گیا اور فوج نے
ہتھیار ڈال دیے۔

سلطان نے عام معافی کا اعلان کر دیا اور قلعہ سے دشمن فوج کو نکال کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس
قبضے کے بعد دشمن ایک بار پھر اپنی پوری جمیعت کے ساتھ مقابلہ کو آیا مگر سلطانی توپ خانہ نے
ایسی گولہ باری کی کہ وہ گھبرا کر پسپا ہو گیا اور چار میل دور جا کے ٹھہرا۔
سلطان بھی لشکر لے کے بڑھا۔ مرہٹوں نے مقابلہ کیا مگر صرف چند گھنٹے اور پھر سامان چھوڑ
کر جنگ نکلے۔

اب تو مرہٹہ لشکر کی یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ شام کے وقت گھوڑوں اور گاڑیوں پر اپنا سامان
لا لیتے اور رات بھراس انتظار میں رہتے کہ کب اُن پر حملہ ہو اور وہ بھاگیں۔ آئندہ دو ہفتوں تک
وہ اسی طرح اپنا سامان لیے پیچھے ہی پیچھے پسپا ہوتے رہے۔

مرہٹوں پر سلطانی لشکر کا رعب بیٹھ گیا تھا۔ وہ اپنی جان تو چھڑانا چاہتے تھے لیکن عزت کے
ساتھ تاکہ انہیں شکست کا طعنہ نہ ملے۔
پہلے کہا جا چکا ہے کہ مرہٹوں کا سپہ سالار ٹکوجی ہکر تھا۔ اس نے اپنے دردمانی سلطان کے
حضور بھیجے۔ سلطان نے انہیں باریابی دی۔
قاصدوں نے عرض کیا:

گفتگو کریں۔

حسب الحکم دونوں مردار کچھ افسردہ کو لے کر ٹکوجی ہلکے پاس پہنچے۔ اس وقت مرہٹہ لشکر سلطان لشکر سے تقریباً دس میل دور پسپا ہو کر پہنچ چکا تھا۔

مرہٹہ سپہ سالار نے سلطان کے مرداروں کو خوش آمدید کہا اور گفتگو شروع ہوئی۔ گفتگو میں بہت سے مدد جز آئے۔ آخر میں فریقین کچھ باتوں پر متفق ہو گئے۔

مرہٹہ سپہ سالار نے مندرجہ ذیل مضنون کا خط لکھ کے برہان الدہ کو دیا کہ وہ اس کا تشریری جواب سلطان سے لکھوا کے بھجوائیں۔

مرہٹہ مردار کے خط کا مضنون یہ تھا:

”ہم نے جو کچھ غلطیاں کی ہیں وہ ہماری جانب سے ہوئی ہیں۔ ہمارا

آدابہ اگر فرزند ہے اس لیے سلطان کو پتا ہے کہ ہمارے آدابہ کی

مستحالی کے لیے کچھ رقم اور ایک دو راڈ دیے ہو۔

یہ کچھ بڑا مغالہ نہیں ہے اور اس قدر قلیل ہے کہ ایک فرزند

اپنے باپ سے کر سکتا ہے۔

چونکہ یہ بڑا نظام کی فتنہ انگیزی کے باعث ہوئی ہے اس لیے

ہم نہایت عجز کے ساتھ معاذ سے طلبہ کار اس

سلطان نے ہلکے کا خط پڑھ کر اسی وقت جواب بھجوا دیا۔ سلطان کا جواب مرہٹہ سپہ سالار پر مشتمل تھا:

”ہم صرف بارہ لاکھ روپیہ دے سکتے ہیں۔

مرہٹہ مردار تو کسی بھی طرح گلو خلاصی کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے یہ رقم لینا منظور کر

لیا۔ اس کے بعد صلح نامہ مرتب ہوا جس میں تین شرطیں تھیں:

۱۔ دریائے زہد کے اس پار کے حکمران نظام علی خان، پنڈت مادھو

راڈ پر دھان اور سرکار خداداد (سلطان یسوی) اس بات کا عہد کرتے

ہیں کہ یہ تینوں اپنے اپنے علاقوں پر رہی حکمرانی کریں گے اور بالکل

امن و اتحاد سے رہیں گے۔

۲۔ اگر کوئی چوتھی طاقت ان میں سے کسی ایک پر حملہ کرے تو تینوں متحد

”اے سلطان۔ ہمارے سپہ سالار ٹکوجی ہلکے نے ہمیں آپ کے حضور بھیجا ہے۔

سلطان نے انتظار کیا کہ قاصد کچھ آگے کیوں گے مگر وہ خاموش رہے۔ سلطان نے ذرا دیر بعد دریافت کیا:

”تمہیں ٹکوجی ہلکے نے ہمارے پاس بھیجا ہے۔ ہمیں یقین آ گیا کہ تمہیں اسی نے بھیجا ہے۔ مگر کیوں؟“

”اے سلطان۔ ہمیں سپہ سالار نے آپ کے حضور اس لیے بھیجا ہے کہ آپ اپنے چند آدمی ہمارے سپہ سالار کے پاس بھیجیں۔“

اتنا کہ مگر وہ لوگ پھر چپ ہو گئے۔

سلطان سمجھ گیا کہ یہ لوگ یا تو انتہائی بے وقوف ہیں یا پھر حد درجہ چالاک، ہوا ایک بات کو توڑ توڑ کے اور سوال کرنے پر تیار ہے ہیں۔ چنانچہ سلطان نے سخت لہجے میں کہا:

”ٹکوجی ہلکے کے قاصد۔ کان کھول کے سنو۔ قاصد یا ہر کارہ اپنے مالک یا بھیجنے والے کا نمائندہ ہوتا ہے اس لیے ہم تمہیں معاف کرنے میں مگر تمہاری اس بے ہودہ گوئی پر ہم تمہیں ذیل کے کے نکلوا سکتے ہیں۔ اپنے آئے کا مقصد واضح اور مختصر الفاظ میں بیان کر دو ورنہ واپس چلے جاؤ۔“

سلطان کی ڈانٹ پڑی تو قاصدوں کا دماغ ٹھکانے آ گیا۔ ان میں سے ایک بولا:

”اے میسر کے سلطان۔ میں تو ایک ہی جگہ میں آنے کا مقصد بیان کر دیتا لیکن میرا یہ ساتھی میرے ساتھ ہی بولنے لگتا ہے، اس لیے میں بات بھول جاتا ہوں۔ اب میں نے اسے سختی سے منع کر

دیا ہے کہ اب صرف میں بولوں گا اور یہ خاموش رہے گا۔

تو اسے سلطان! ہمارے سپہ سالار نے آپ کو پیغام بھیجا ہے کہ آپ اپنے اعتماد کے چند مردار بھیجے تاکہ وہ ہمارے مرداروں سے صلح کی شرائط طے کریں۔“

سلطان کی تاکید کے باوجود قاصد نے اتنی مختصر بات کو اس قدر طول دیا۔ سلطان نے فوراً جواب دیا:

”اپنے سپہ سالار ٹکوجی ہلکے سے ہماری طرف سے کہنا کہ ہمیں ان کا پیغام مل گیا۔ ہمارے مردار گفتگو کے لیے آج ہی ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔“

قاصدوں کے جانے کے بعد سلطان نے بدرالزاں خاں اور علی رضا خاں کو حکم دیا کہ وہ چند افسروں کو ساتھ لے کر ٹکوجی ہلکے کے پاس جائیں اور ایک باعزت صلح کے معاہدے کے لیے

مک نظر بند رکھا۔



سلطان مرزا کاظم دایس آیا تو اسے بتایا گیا کہ دیوان میر صادق نے دارالسلطنت میں اودھم مچا رکھا ہے۔ عوام اس سے سخت ڈالائے ہیں اور اس نے سرکاری خزانے میں سے لاکھوں کی رقم خورد و خرچہ کر ڈالی ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ سلطان کے پاس میر صادق کے خلاف ایسی شکایات پہنچیں جن کے ساتھ مکمل شہادتیں اور تحریری ثبوت موجود تھے۔

پس سلطان نے ان الزامات کی سختی سے تحقیقات شروع کیں۔ ثبوت اور شہادتیں اس قدر مکمل ہوئی تھیں کہ میر صادق کو فی بھی بہانہ نہ تراش سکا۔

سلطان جو میر صادق کو اب تک اپنا دانا دار اور ایک قابل اعتماد ساتھی سمجھتا تھا، اس کے دل میں میر صادق کی طرف سے ایسا میل آیا کہ اس نے میر صادق کو فوراً دیوان (وزیر اعظم) کے عہدے سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ مندی علی خاں ہنکری نائبہ کو دیوان بنا دیا۔

روایت ہے کہ جب منکرام میر صادق علی کے گھر کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے دس لاکھ روپے سلطان اور ایک لاکھ روپے محمد شاہی برآمد ہوئے۔ اسی سال سلطان نے مسجد علی کی تعمیر کو مکمل کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیر تین سال پہلے شروع ہوئی تھی۔

یہ وہی مسجد تھی جس کی تعمیر کا وعدہ سلطان نے بچپن میں اس فقیر سے کیا تھا جس نے یتیم خانہ کے بچوں کو تعلیم دینے کی نوبت دی تھی اور وعدہ لیا تھا کہ وہ سلطان پر فائز ہونے کے بعد اسی جگہ ایک مسجد تعمیر کرے گا۔

اس مسجد علی کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس جگہ یہ مسجد بن رہی تھی وہاں پہلے ایک چھوٹا سا ہندوؤں کا مندر تھا۔ جب سلطان کو تعمیر مسجد کا خیال آیا تو اس نے وہاں ایک تعمیر شدہ مندر دیکھی۔

سلطان اگر ذرا بھی متعصب ہوتا تو فوراً مسجد توڑ کے مسجد کی تعمیر کا حکم دے سکتا تھا مگر سلطان بڑا دانا اور حکمران تھا۔ اس نے زبردستی جگہ حاصل کرنے کے بجائے شہر کے تمام متادارے پتہ توڑ

ہو کر اس کا مقابلہ کریں گے، خواہ ان میں کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں وہ انہیں دور کر دیں گے۔

۳۔ شاہنور کی حکمرانی عبدالعظیم کے پاس ہی رہے گی اور ادھونی کا قلعہ حیات جنگ کو دیدیا جائے گا۔ زنگندہ، نوکندہ اور بالی کے قلعے بطور انعام پیشوائے پونا کو دیے جائیں گے۔

معادہ کے بعد سلطان نے رائے درگ اور سرینہلی کے پالیگاردوں کو (جو باغی ہو گئے تھے) تادیب اور تنبیہ کی اور انہیں گرفتار کر کے مرزا کاظم بھجوا دیا۔ پھر فتح و نصرت کے نفاذ سے بھوانی دارالسلطنت پہنچا۔

سلطان نے جتنی عام کا حکم دیا اور سرداروں کی دعوت کی سرداروں اور عہدے داروں میں تقسیم ہے۔ مساکین کو ایک ماہ تک مسلسل کھانا کھلوا یا گیا اور ہر ایک کو ایک ایک لباس عطا ہوا۔

سلطان نے مرہٹوں سے ۷۰۰۰ روپے معاہدہ کیا تھا اس سے یہ امید بندھی تھی کہ سلطنت خداداد کو کچھ دنوں کے لیے انگریزوں، نظام دکن اور مرہٹوں کی شورشوں سے نجات مل جائے گی مگر یہ امید پوری نہ ہوئی اور سلطان کے لیے یہ معاہدہ ایک امن فضول کی کوشش ثابت ہوا۔ اور تاراج نہیں اسے "امن فضول" ہی کا نام دیا گیا۔

شاہنور کے معرکے میں امیر قمر الدین، سلطان کے ہمراہ نہ تھا۔ اس کا قصیدوں ہوا تھا کہ اس معرکہ سے پہلے جب سلطان قلعہ ادھونی پر حملہ آور ہوا تو انہی دنوں مفتی ارکاٹ مرزا الدین محمد کا انتقال ہوا مگر یہ افواہ اڑی کہ "سلطان یتیم" کا انتقال ہو گیا۔ یہ افواہ اس قدر تیزی اور ایسے دھوکے سے پھیلی کہ سب کو اس کا یقین ہو گیا۔

امیر قمر الدین ان دنوں کسی اور جگہ تھا۔ اس نے یہ خبر سنی تو اپنے ساتھ کے فوجی دستوں کے لیے کوئٹہ، مرزا کاظم کی طرف روانہ ہوا تاکہ میسور کے تحت وناج پر قبضہ کر لے۔

میسور کو قمر الدین کی اس حرکت کی اطلاع ملی تو اس نے یہ بغاوت فرو کرنے کے لیے فوج روانہ کی۔ قمر الدین نے بہت اودھم مچایا مگر بالآخر گرفتار کر لیا گیا اور سلطان نے اسے درما

کو دربار میں بلوایا اور انہیں خود مخاطب کیا:

”اے ہندو دھرم کے پردہ مند اور بیشواڈ! فلاں مقام پر تمہارا ایک چھوڑا سا مندر ہے۔ عبادت گاہ خواہ کسی بھی مذہب کی ہو اسلامی نقطہ نظر سے وہ قابل احترام ہے چنانچہ ہم اپنے دین کے اس حکم کے پابند ہیں۔

اب تم لوگوں سے سلطان کی یہ درخواست ہے کہ اس حقیر نے اپنے بچپن میں ایک درویش سے وعدہ کیا تھا کہ جب میں سلطان بن جاؤں گا تو اس جگہ ایک مسجد تعمیر کروں گا۔ میں نے درویش سے یہ وعدہ اسی جگہ کھڑے ہو کر کیا تھا جہاں اس وقت تمہارا مندر ہے۔ ان حالات میں اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے لیے موجودہ مندر سے کہیں بڑا اور شاندار مندر تعمیر کرا کے دے سکتا ہوں۔ وہ جگہ تمہاری پسند اور تعمیر تمہارے تلے ہوئے نمونہ کے مطابق ہوگی۔ اس کے صلہ میں تم ہمیں اس مندر کی جگہ اپنی مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دیدو۔“

پھر سلطان نے چند لمحے رک کر کہا:

”میں تم پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ میرا ذاتی منصوبہ ہے اور مسجد کے لیے جگہ مانگنا میری درخواست ہے۔ یہ سلطانی حکم ہرگز نہیں ہے۔“

سلطان کے اس رویے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ کس قدر رواں دواڑ سلوک کرتا تھا۔

ہندوؤں نے سلطان کی درخواست خوشی خوشی منظور کر لی اور سلطان نے مسجد کی تعمیر شروع کر کے پہلے ہندوؤں کے مندر کی تعمیر شروع کرا دی۔ چنانچہ سلطان ٹیپو کی تعمیر کردہ مسجد اٹلی اور مندر بدلے میں تعمیر کیا گیا مندر مرنگا پٹم میں آج بھی موجود ہے۔

سلطان کے رواداری بھرے اس سلوک سے خود سلطان کو جس قدر نقصان پہنچا اس پر بیان پہلے ہی ہو چکا ہے اور ابھی مزید آگے بھی آئے گا۔

اگر سلطان میسور کی راج محل کی رانیوں اور وہاں کے مندروں کے پتہ توں کو پسلی ہے

منت مزاد سے دیتا تو پھر کسی اور کو سلطنت خداداد کے خلاف بغاوت کرنے کا موقع نہ ملتا اور نہ انہیں جرأت ہوتی۔ سلطان کے نرم رویہ ہی کے باعث راج محل کی رانیاں مسلسل فتنہ و فساد اور سازشوں کی مرتکب ہوتی رہیں۔

اس سال سلطان نے جامع الامور کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم کی۔

صوبوں کے انتظامات از سر نو ترتیب دیے گئے۔

نئے سکے ڈھالے گئے۔

فرانس اور قسطنطنیہ کو سفارتیں روانہ ہوئیں۔

اس سال سلطان نے ”تخت ہما“ تیار کرایا۔ یہ تخت شیر کی پشت پر رکھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس بات کا ذکر بارہا کیا جا چکا ہے کہ سلطان کو شیروں سے بہت دلچسپی تھی۔

ایک بار آغاز جوانی میں جب سلطان ابھی شہزادہ تھا تو نظام دکن کے خاندان میں اس کی شادی کی گفتگو شروع ہوئی۔ نظام دکن نے شہزادہ ٹیپو کا ایک فوٹو مل خط کے لیے منگوایا۔ اس خط میں نظام دکن نے اپنا ایک مصور مرنگا پٹم بھیجا تھا کہ وہ وہاں رہ کر شہزادہ ٹیپو کی تصویر تیار کرے۔

چنانچہ مصور کو شہزادے کے پاس تصویر بنانے کے لیے بھیجا گیا۔ شہزادہ مصور کو ان کٹھروں کے پاس لے گیا جن میں اس کے پالتو شیر بند تھے۔ حیدر آبادی مصور شیروں کے کٹھرے دیکھ کر گھبرا گیا۔

اس نے شہزادے سے دریافت کیا:

”شہزادہ بہادر۔ آپ کی تصویر کا ان شیروں سے کیا تعلق؟“

جواب میں شہزادے نے کہا:

”انسانی خوبصورتی کا سب سے اہم راز اس کی طاقت میں پوشیدہ ہے۔ میں ان شیروں سے لڑوں گا اور تم میری تصویر بناؤ گے تاکہ دیکھنے والے کو معلوم ہو سکے کہ مجھ میں کس قدر طاقت ہے کیونکہ طاقت ہی جوانی کا حصہ ہے۔“

سلطان کے اس جواب سے اس کی شیروں سے کمال دلچسپی کا پتہ لگتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس نے اپنے محل کے کمروں، دروازوں اور دیواروں پر شیر جیسارنگ کرا با تھا۔ اسے یہ رنگ اس قدر پسند تھا کہ اس نے اپنی فوج کے ایک حصے کی دریاں بھی اسی رنگ کی بنوائی تھیں۔

سلطان نے سرنگاٹم میں بیٹھ کے نظم و نسق کی جو نئی داغ بیل ڈالی اس سے جو سکھ پیدا ہوا تھا وہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ چند نامہ منگول اور انگریزوں کے سینے پر سانپ بنکا لوٹ رہا تھا۔ اگر انگریز عورتیں اپنے بچوں کو بچوں کے نام سے ڈراتی تھیں تو انگریز جنرل اپنا سابقہ شکستوں پر منہ چھپاتے پھرتے تھے۔

پھر اس نڈان کو مٹانے اور شکستوں کا بدلہ لینے کے لیے ۱۸۶۱ء میں لارڈ کارنوالس کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا گیا۔

یہ بڑا امکار اور فتنہ پرداز انسان تھا۔ اسے امریکہ میں شکست اٹھانا پڑی تھی اور امریکی مقبوضات انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ لارڈ کارنوالس کو اپنی شرمندگی دور کرنے کے لیے ہندوستان کا محاذ دیا گیا۔ اسے ہندوستان میں ہر حربہ استعمال کرنے کا حق بھی دے دیا گیا یعنی جہاں جنگ طاقت سے نہ جیتی جاسکتی ہو وہاں مکاری، احسان فراموشی اور دھوکہ بازی سے کام لیا جاسکتا ہے اور کارنوالس نے یہ تمام حربے ہندوستان اور خصوصاً جنوبی ہند یعنی سلطان کے خلاف استعمال کیے۔

ادھر سلطان نظم و نسق کے انتظام سے فارغ ہوا تھا کہ ارشد بیگ حاکم مالابار کا قاصد پہنچا ناٹروں نے ایک بار پھر بغاوت کا علم بلند کر دیا ہے اور ارشد بیگ اس بغاوت کو بغیر سلطان لشکر کے فرو نہیں کر سکتا۔

سلطان نے اطلاع پاتے ہی کوچ کا حکم دیا اور فوج اور توپ خانہ لے کر مالابار پہنچ گیا سلطان کے پہنچتے ہی ناٹروں کے دماغ ٹھکانے ہو گئے اور ان کی بغاوت ختم ہو گئی۔ سلطان کو وہیں اطلاع ملی کہ جین کے راجہ نے تڑچاپلی کے اطراف میں لوٹ مار مچا رکھی چنانچہ اس نے ادھر کا رخ کیا۔

سلطان نے ساحلی ندیوں کے پاس پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔ وہاں کوچین کی فوج پہلے سے موریہ بند تھی۔ رات کو سلطان نے دشمن پر شب خون مارنے کا حکم دیا۔

سرداروں نے عرض کیا:

”ندیاں گہری ہیں اور رستہ خراب ہے اس لیے کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں۔“

سلطان نے ان کا عذر قبول نہ کیا اور خود پاکی میں سوار ہو کے اس نے ایک مختصر لشکر کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر باقی لشکر بھی دشمن پر ٹوٹ پڑا اور اسے پسپا کر کے اُن کے

مورچوں پر قبضہ کر لیا۔

دشمن دہل سے بھاگ کے قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا۔

صبح کو دشمن نے دریا کے بند کھول دیے جس سے دریا چڑھ گیا اور سلطان کی واپسی کا رستہ بند ہو گیا۔

دشمن نے یہ دیکھ کر کہ سلطان کے پاس چار پانچ آدمیوں کے سوا اور کوئی لشکر نہیں، انہوں نے سلطان کو گھیرنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر سلطان کے جانا زدن نے واقعی جانا بازی دکھائی اور دشمن کے دھمکے کھٹے کر دیے۔

سلطان کے جوان کٹ کٹ کر گر رہے تھے مگر دشمن کو سلطان کے قریب نہ آنے دے رہے تھے۔ سلطان خود بھی پاکی سے اتر کر اپنے جانا زدن کے شانہ بشانہ جنگ کر رہا تھا۔ قمر الدین کی بہادری دیکھنے کے قابل تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح سلطان کو دریا پار کر دیا لیکن اس کوشش میں سوائے قمر الدین کے اور کوئی زندہ نہ بچا اور سب نے اپنی جانیں سلطان پر نثار کر دیں سلطان کی کٹار دستانہ اور پاکی دشمن کے ہاتھ لگی۔

اب سلطان کے غضب و غضب کی انتہا نہ رہی۔ اس نے دشمن پر عام حملہ کا حکم دے دیا۔ سلطان لشکر بھی اپنے چار سوا تھیں کا بدلہ لینے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اس نے جنگل سے کڑیاں کاٹیں۔ ان سے ندیوں پر پل کھڑے کیے اور دوسری طرف میدان میں پہنچا جہاں دشمن لشکر موجود تھا۔

سلطانی لشکر نے دشمن پر اس قدر بھرپور حملہ کیا کہ وہ اس کی تاب نہ لاسکا اور تھوڑی دیر میں پسپا ہو کر لمبوار کی طرف ہٹ گیا۔ سلطان قلعہ کے اندر داخل ہوا اور وہاں کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔

اب یہاں سے سلطنت خداداد میسور کا وہ باب شروع ہوتا ہے جس میں انگریزوں نے سلطان ٹیپو کے ساتھ معاہدہ منگولر کے باوجود اسے زبردستی اپنے ساتھ جنگ میں کھینچ لیا۔

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حکومت برطانیہ نے لارڈ کارنوالس کو ہندوستان بھیجا ہی اس وجہ سے تھا کہ وہ سلطنت میسور سے معاہدہ منگولر کی ذلت کا بدلہ لے اور سلطان کی طاقت کو اس قدر کمزور کر دے کہ وہ جنوبی ہند میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے کے قابل نہ رہے۔ چنانچہ انگریزوں نے سلطان کے کوچین پر حملہ کر کے ہانہ بنا کر سلطنت خداداد میسور کے

خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

اس جنگ کے حالات بیان کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس وقت جنوبی ہند میں جو طاقتیں متحرک تھیں ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تاکہ قارئین سلطنت میسور اور انگریزوں کے درمیان ہونے والی تیسری اور آخری جنگ کے پس منظر کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ سلطان کو اس جنگ کا ذمہ دار ہرگز نہیں ٹھہرایا جاسکتا اس لیے کہ سلطان اپنے مقبوضات میں بغاوت اور سازشوں کو فرو کرنے کے لیے نکلا تھا اور کوچین پر اس کا حملہ اسی سلسلے کی ایک بڑی تھی۔

کوچین پرتغیسہ کے بعد سلطان ملیواری کی طرف بڑھا۔ کیونکہ دشمن کوچین میں شکست کھا کر ملیواری کی طرف ہسپا ہو گیا تھا۔

کوچین کی دو چوکیاں

۱۔ کرنگ نور اور

۲۔ اجے کوٹ

ایسی تھیں جنہیں راجہ ٹرانکور نے ولندیزیوں سے بعض تین لاکھ روپے خرید لیا تھا۔ یہ سودا دونوں طرف سے ناجائز تھا اس لیے کہ یہ چوکیاں کوچین کے علاقے میں اور سلطان پیو کے ماتحت تھیں۔ ان چوکیوں کو نہ ولندیزی فروخت کر سکتے تھے اور نہ راجہ ٹرانکور انہیں جانتے بوجھتے ہوئے خریدنے کا مجاز اور حقدار تھا۔

گمردہ جو کہا گیا ہے کہ ”زبردست کا بھوتا سر پر“ تو یہی حال راجہ ٹرانکور نے کیا تھا اس کے اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس میں مدراس کے گورنر سر رچی بالڈن نے راجہ کو یقین دلایا تھا کہ انگریز ایک دوست کی حیثیت سے ٹرانکور کی مصیبت میں اس کی مدد کریں گے۔

لارڈ کارنوالس کو انگریزوں اور راجہ ٹرانکور کے مابین معاہدہ کا تو علم تھا لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ راجہ نے ناجائز طور پر سلطان کی دو چوکیاں ولندیزیوں سے خریدی ہیں۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ سلطان پیو کا ٹرانکور پر حملہ کا کوئی ارادہ نہیں اور یہ کہ سلطان کی یہ ہمیں اس کے داخلی معاملات سے تعلق رکھتی ہیں۔

لارڈ کارنوالس نے اپنی انہی خیالات کا اظہار اپنے ایک خط مؤرخہ ۵۔ دسمبر ۱۸۰۹ء میں کیا

جو اس نے ہنری ڈنڈاس کو لکھا تھا۔

اس خط کا معنوں اس طرح تھا :

”پیو کو مجبور سے بالاکھاٹ کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ پچھلے سال کی طرح اپنی عام مہمات پر ہے البتہ راجہ ٹرانکور اور ہمارے ریڈیٹ کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ اگرچہ پیو ٹرانکور کے علاقہ میں بڑھ رہا ہے لیکن انہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ پیو ہمارے ساتھ کیے گئے معاہدے کو توڑنے کی کوشش نہیں کرے گا اور اگر اس نے ایسا کیا تو اس سے زیادہ احمق اور کوئی نہ ہو گا۔

اس صورت حال کا ذمہ دار راجہ ٹرانکور کو ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس نے ہنری میجسٹی کی اجازت کے بغیر مذکورہ چوکیوں کے معاملات طے کیے ہیں۔“

ان تمام باتوں کے ادب و کارنوالس کو یقین تھا کہ جلد یا بدیر سلطان اور انگریزوں کا سامنا ہونا ہے اس لیے اس نے سلطان کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیے رکھا اور خود سیاسی اور فوجی تیاریوں میں مصروف رہا۔

سلطان جب کوچین کے قریب یعنی ٹرانکور کی سرحد پر پہنچا تو اس نے راجہ دھرم راؤ کے پاس اپنا ایک وکیل روانہ کیا تاکہ وہ اسے کوٹہ اور کرنگور کی چوکیوں کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ سلطان کا وکیل راجہ دھرم راؤ کے دربار میں پہنچا اور اس نے بڑے ادب سے سلطان کا مطالبہ پیش کیا :

”اے ٹرانکور کے راجہ۔ ہمارے سلطان چاہتے ہیں کہ آپ اسے کوٹہ اور کرنگور سے اپنی فوجیں نکال لیں۔“

سلطان کے وکیل نے اتنا کہہ کر راجہ کا منہ دیکھا۔ شاید وہ اس مطالبہ کا جواب چاہتا تھا۔ راجہ اس کا مطلب سمجھ گیا اور سپاٹ لہجے میں بولا :

"چپ کیوں ہو گئے اے سلطان کے قاصد۔ تمہاری مطالبہ ہے یا کچھ اور بھی کہنا ہے؟
 "دکیل نے جواب میں عرض کیا:
 "اے ٹراونکور کے راجہ۔ ہمارے سلطان کے کچھ اور بھی مطالبات ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ ایک ایک مسئلہ پر گفتگو ہوتی چلے تو زیادہ بہتر ہوگا۔"
 "نہیں سلطانی دکیل۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

راجہ بڑے کمرخت لہجے میں بولا:

"ہمیں دربار کے اور کام بھی پٹنا ہیں۔ تم اپنی تمام باتیں ختم کر لو تا کہ ہم ایک ہی بار تمام باتوں کا جواب دیدیں۔"

"ٹھیک ہے راجہ بہادر۔"

دکیل نے کہا اور بات آگے بڑھائی:

"ہمارے سلطان نے آپ سے مطالبہ کیا ہے کہ آج کوٹہ اور کرنگنور سے فوجیں نکال لی جائیں۔"

آپ کو چین کی سرحد سے دور ہٹ جائیں۔

اور۔۔۔ سلطنت خداداد میسور کے غداروں کو اپنی ریاست سے نکال دیں۔"

راجہ دھرم راڈ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ غصہ سے پھٹ پڑے گا اور ایسا ہی ہوا۔

سلطانی دکیل کے خاموش ہوتے ہی راجہ واقعی پھٹ پڑا:

"جاؤ اور اپنے سلطان سے کہہ دو کہ ہم نے کرنگنور اور آجے کوٹہ کی چوکیاں ولندیزیوں سے تین لاکھ روپے میں خریدی ہیں۔ اگر چوکیاں واپس لینا ہیں تو ہمیں پچیس تین لاکھ کی ادائیگی کی جائے۔"

سلطان کے دوسرے مطالبے کا جواب یہ ہے کہ کرنگنور اور آجے کوٹہ کی چوکیوں کے ہم ہاں ہیں اور یہ چوکیاں کو چین کے علاقے میں واقع ہیں اس لیے ہم کو چین سے دور نہیں جاسکتے۔

اور تیسرے مطالبے کا جواب یہ ہے کہ کو چین والے ہماری پناہ میں ہیں اور ہم جنہیں پناہ دیتے ہیں انہیں دشمن کے حوالے نہیں کیا کرتے۔"

ٹراونکور کے راجہ کا یہ تندہ و تلخ جواب جب سلطانی دکیل نے سلطان کے سامنے دہرایا تو سلطان

نے اسی وقت ٹراونکور پر حملے کا حکم دے دیا۔
 اس طرح سلطانی فوجیں ٹراونکور میں داخل ہوئیں اور اس کے تیسرے دن انگریز لشکر سلطنت خداداد کی سرحد پر پہنچ گیا۔

سلطان کو انگریزوں کے اس غیر متوقع اقدام کی خبر ملی تو اس نے اپنے لشکر کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور جنرل میڈوز کو ایک مختصر خط لکھا جس میں تحریر تھا:

"ہم حیران ہیں کہ معاہدہ منگورہ کے باوجود انگریز قوم ہم سے لڑنے پر کیوں آمادہ ہے۔ اگر دونوں حکومتوں میں کوئی رعیش کی وجہ سے یہاں ہو

گئی ہے تو باہمی مفاہمت سے معاملہ طے ہو سکتا ہے۔"

جنرل میڈوز نے سلطان کو ان الفاظ میں جواب دیا:

"ٹراونکور کی حکومت، مدراکس کی حلیف ہے اور اس کی سرحد پر جو

واقعات ہونے ہیں ان سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔"

جنرل میڈوز کے اس جواب سے سلطان کو یقین ہو گیا کہ انگریز اس سے جنگ کرنے پر آمادہ ہیں۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنی گھاٹ کا رخ کیا تاکہ انگریز فوج کو آگے بڑھنے سے روک دے۔
 کوئٹہ اور سستی منگل کے نواح میں سلطانی لشکر کا جنرل میڈوز کی افواج سے مقابلہ ہوا۔

اس ٹکراؤ میں سلطانی لشکر فتح یاب ہوا اور بہت سے مرد اور عورتیں گرفتار ہوئیں۔ ان عورتوں میں مشہورہ فاحشہ عورتیں تھیں جو خود کو مسلمان کہتی تھیں لیکن انگریزوں کے پہلو گم کرنے پر آمادہ تھیں۔

سلطان نے ایسی تمام نام نہاد مسلمان عورتوں کو قتل کر دیا۔

بنگال سے ایک فوج کرنل میکسول کی کمان میں جنوبی ہند پہنچی تھی اور اس نے آتے ہی تڑپا پور اور دانبھاری پر قبضہ کر لیا تھا۔

سلطان کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے سپہ سالار برہان الدین کو ایک فوج کے ساتھ مدافعت

کے لیے دانبھاری بھیجا۔ ان کے ساتھ سپہ سالار سید غفار بھی تھا۔

برہان الدین نے کندی پہنچ کے انگریز فوج پر حملہ کیا اور ڈیڑھ سو سوار اور دس سو پادری

کو گرفتار کر لیا۔

جنرل میڈوز جو شکست کھا کر سستی منگل کے قریب، پڑاؤ ڈالے پڑا تھا اسے برا

کے حملے کی خبر ملی تو وہ لشکر لے کر میکسویل کی مدد کو چلا۔ یہ دونوں فوجیں تپور گھاٹ پر آکر مل گئیں۔

اب انگریزوں کے دونوں لشکروں نے متبر ہو کر برہان الدین پر حملہ کر دیا۔ برہان الدین کا مقابلہ نہ کر سکا اور کافی نقصان اٹھا کر پسپا ہو گیا۔

اس کی اطلاع سلطان کو ملی تو وہ توب خانہ اور فید رسالے لے کر فوراً برہان الدین کی مدد کو پہنچا اور وہاں پہنچ کے ایسا سخت حملہ کیا کہ انگریزوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ تڑپا پلے کی طرح پسپا ہوئے۔

سلطان نے انہیں بھاگنے نہ دیا اور آگے بڑھ کر رستہ رک لیا۔ پھر ان لشکروں کو چاروں طرف سے گھیر کر اس قدر بھاری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ انگریز اس کا ہلکا مان گئے۔ انہیں بس شکست ہونے ہی کو تھی کہ رات ہو گئی اور جنگ منقوت کرنا پڑی۔

انگریزوں نے رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھایا اور اپنا مال و اسباب دیں بھوڑے راتوں رات فرار ہو گئے۔

سلطان کو صبح اطلاع ہوئی تو اس نے ان کا تعاقب شروع کیا اور جلد ہی ان کے سر پر پہنچ گیا۔ وہاں پھر جنگ شروع ہو گئی۔

اس جنگ میں اپانک برہان الدین کے سینے میں ایک گولی لگا اور وہ موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ ان کی لاش کو پالکی میں رکھ کے سلطان کے پاس روانہ کر دیا گیا۔

سلطنتِ خدا داد کے یہ سب سے زیادہ وفادار اور عظیم جرنل کی موت تھی جس نے بساطِ سیاست کو تقریباً لٹ کے رکھ دیا۔

برہان الدین کی لاش دیکھ کے سلطان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اس نے حکم دیا کہ انگریزوں کا تعاقب روک دیا جائے۔

ایک وفادار نے عرض کیا:

”مالی باہ - عظیم جرنیل برہان الدین کی وفات کا جس قدر غم کیا جائے وہ کم ہے لیکن میری درخواست ہے کہ انگریزوں کے تعاقب کو نہ روکا جائے۔ دشمن کی بھاگنے والی فوج قیامت کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اگر اس کا اسی طرح تعاقب جاری رکھا گیا تو ایک ہی انگریز لشکر کی جان بچا کے مدر اس نہ پہنچ سکے گا۔“

سلطان شاید برہان الدین کے شہید ہونے سے کچھ زیادہ ہی غمزدہ تھا۔ اس نے اس مشورہ کو رد تو نہیں کیا لیکن اس میں تاخیر ضرور ہو گئی۔

سلطان نے فرمایا:

”ہم پسپا ہونے والوں کا تعاقب ضرور جاری رکھیں گے لیکن پہلے ہمیں اس عظیم ہمتی کے غم کو بھول جانے کی کوشش کرنا پڑے گی۔“

سلطان نے چونکہ تعاقب کا کوئی واضح حکم نہیں دیا تھا اس لیے تعاقب رک گیا۔ اس طرح بدحواس جرنل میڈوز کو اپنے حواس درست کرنے اور اپنی جان بچا کر بھاگنے کی ایک بالکل غیر متوقع فرصت مل گئی اور وہ اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بچی بچی فوج کو لے کر مدراس واپس پہنچ گیا۔

اس دوران سلطان افواج نے چنچنی، سستی منگل اور کوہ پرموکل کو فتح کر لیا اور قیدیوں کو مرنگا بٹ بھجوا دیا۔

پورنگ نے اس جنگ کے بارے میں لکھا ہے:

”سلطان کے مقبوضات پر کامیاب حملہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ضلع بارہ محل اور درہ گلی ہی پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس جرنل میڈوز نے کرنل میکسویل کو کرشنا گری بھیجا جو ضلع کا صدر مقام تھا لیکن ابھی کرنل میکسویل کرشنا گری نہیں پہنچا تھا کہ سلطان نے بڑی سرعت سے آگے بڑھ کر میکسویل سے جنگ شروع کر دی۔“

اس عرصہ میں معلوم ہوا کہ جرنل میڈوز کے ماتحت ایک انگریز فوج آ رہی ہے۔ پیچو جو ماہر فن اور بہترین جرنل تھا، سمجھ گیا کہ وہ دو فوجوں کے درمیان پھنسے والا ہے اس لیے وہ اپنی فوج لے کر پیچھے ہٹا اور درہ تبار سے نکل کر ملک کو آنے والی فوج پر حملہ کر دیا۔

انگریزی فوج نقصان اٹھا کر واپس ہوئی۔

یہاں سے سلطان دریائے کلردن کو عبور کر کے ترناٹے اور پراکوٹ کی طرف بڑھا اور یہ مقامات اس کے قبضہ میں آ گئے۔ یہاں سے وہ پانڈیچری پہنچا اور فرانسسیسی جرنل سے درخواست کی کہ اسے چھ ہزار

فرانسیسی سپاہی مدد کے طور پر دیے جائیں۔ جنرل نے یہ درخواست فرانس
اپنے بادشاہ کے پاس حکم کے لیے روانہ کر دی لیکن شاہ فرانس لوی
شاہزادہ، انقلاب فرانس کے ڈر سے اس وقت اس درخواست پر
کوئی توجہ نہ دے سکا۔

شاہ فرانس کی اس خاموشی پر ایک فرانسیسی مؤرخ بعدِ حسرت لکھتا ہے :
"فرانس والوں نے اس زردی موقع کو ہاتھ سے کھو دیا۔ اس وقت
جب سلطان کل جنوبی ہند کے سیاہ و سفید کا مالک تھا اور انگریز اس
کے دم و دم پر تھے، اگر فرانس سلطان کی مدد کرتا تو ہندوستان کی
تاریخ بھی کچھ اور ہوتی۔"

یہ خبریں جب گورنر جنرل لارڈ کارنوالس کو ملکتی ہیں پہنچیں، تو وہ ان واقعات کو پہلے جنگ
قرار دے کر تیاری میں مصروف ہو گیا۔

سلطان نے جو کچھ کیا وہ اپنے ملک کی اندرونی بغاوتوں کو کچلنے کے لیے کیا تھا۔ انگریزوں
نے بلاوجہ باغیوں کی حمایت کی اور جب انہیں اور باغیوں کو شکست ہوئی تو لارڈ کارنوالس نے ہاتھ
جنگ کی بنیاد ڈالی اور ایسے منصوبے بنائے جن میں لگ گیا کہ جن سے سلطان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو
توڑا جلتا!



جنوبی ہند میں سلطنت خداداد کے قیام سے مسلمانانِ برصغیر کو
یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ شمالی ہند میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد اللہ نے مسلمانوں کو
جنوبی ہند میں ایک منبوط سلطنت عطا کی ہے جو مغلیہ سلطنت کا بدل ثابت ہوگی۔
لیکن۔

یہ سلطنت خداداد اور مسلمانانِ ہند کی بدقسمتی تھی کہ اس سلطنت کی روزِ اول ہی سے
مخالفت شروع ہو گئی تھی اور مہب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اس مخالفت میں مسلمان
حکمران اور ریاستیں پیش پیش تھیں۔

آئیے۔ اس کا آغاز سے اب تک کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں:

آج جانتے ہیں کہ والا جاہ محمد علی، انگریزوں کی مدد سے ارکاٹ کا نواب بنا تھا اس کی
خواہش تھی کہ وہ حیدر آباد کا بھی حکمران بن جائے۔ اس کے لیے ایک طرف اس نے انگریزوں
کو اپنے ساتھ ملایا اور دوسری طرف حیدر آباد کے چند عہداروں اور مفاد پرستوں کو اپنا
ہتھیار بنا کر سازش شروع کی۔

اسی زمانے میں جنوبی ہند میں یہ علی خاں اک دم ایک عظیم طاقت بن کے ابھرنے لگا
تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ والا جاہ محمد علی نے اپنی نظر بن حیدر آباد سے ہٹا کر حیدر علی خاں
پر لگا دیں۔

والاجاہ محمد علی اس وقت چونکا تھا جب حیدر آباد کے نواب بسالت جنگ نے حیدر علی کو صوبہ سرا کا صوبیدار مقرر کیا۔

نواب بسالت جنگ سے پہلے صوبہ سرا دراصل ارکاٹ میں شامل تھا بلکہ ختم کر دیا گیا تھا والاجاہ ارکاٹ کا حکمران ہونے کی وجہ سے صوبہ سرا پر بھی اپنا حق سمجھتا تھا اس لیے وہ صوبیدار سرا نواب بہادر حیدر علی کا شدید مخالف ہو گیا۔

نواب بسالت جنگ کو معزول کرنے کے بعد جب نظام الملک حیدر آباد دکن کا حکمران ہوا تو وہ بھی حیدر علی کا مخالف ہو گیا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ حیدر علی کو نظام الملک کے بھائی بسالت جنگ نے صوبیدار بنایا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نواب بہادر کی طاقت اس قدر تیزی سے بڑھ رہی تھی کہ اسے یہ خطرہ پیدا ہوا کہ مرا کی سلطنت خدا داد کہیں پورے ہندوستان کی مالک نہ ہو جائے اور اس کے یعنی نظام الملک کے شہنشاہ ہند بننے کے خواب چکنا چور نہ ہو جائیں۔

جنوبی ہند میں تیسری طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی جو ارکاٹ اور حیدر آباد میں اپنا اقتدار بڑھا رہی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے والاجاہ سے کوہمند کے علاقے حاصل کر لیے تھے اور ارکاٹ کے باقی علاقوں کی وہ ایجنٹ بن گئی تھی۔ گویا ارکاٹ پر والاجاہ محمد علی کے پردے میں انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی قابض ہو چکی تھی۔

کمپنی، حیدر علی خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے اس لیے خائف تھی کہ اس کی موجودگی میں ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جمانا مشکل تھے۔

جنوبی ہند میں جو تھی طاقت مرہٹوں کی تھی۔ انہیں جنوبی ہند میں ایک نئی اسلامی سلطنت کا قیام سخت ناگوار گزرتا تھا۔

پانچویں طاقت میسور کا خدیم ہندو خاندان تھا جو بڑا ہر کوئی مضبوط طاقت نہ تھی لیکن وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لینا اور حیدر علی کے اقتدار سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ یہ خاندان دراصل میسور کی رانیوں کے ذریعے سازشیں کرتا رہتا تھا۔

سلطان کے والد نواب بہادر حیدر علی خاں جب میسور کے سپہ سالار تھے تو کھانڈے راؤ اور راجہ نے مل کر انہیں قتل کرنے کی سازش کی مگر حیدر علی خاں نے انہیں میدان جنگ میں

شکست دے کر سرنگا پٹم پر قبضہ کر لیا اور راجہ میسور کو علی حکومت سے معزول کر کے اس کی پینشن تین لاکھ سالانہ مقرر کر دی۔

یہ دہی کھانڈے راؤ ہے جسے نواب بہادر نے لوہے کے ایک بڑے پتھر سے قید کر دیا تھا اور اسے "حیدر علی کا طوطا" کا نام دیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ حیدر علی نے راجہ کو معزول کر کے تمام اختیارات خود سنبھال لیے تھے اور سرنگا پٹم ہی کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔

پتہ نہیں حیدر علی کی اس میں کیا مصلحت ہوگی مگر سرنگا پٹم ہندو راجاؤں کی زمانہ قدیم سے راجدھانی چلی آ رہی تھی۔ یہاں کی رعایا اور مذہبی پیشواؤں پر راجہ کا اثر تھا۔ ظاہر ہے راجہ اور دہلی کی رعیت کو یہ دیکھ کر بہت کوفت ہوتی ہوگی کہ حیدر علی جو کل تک اسی ریاست کا سپہ سالار تھا، اب وہ حکمران بن کر رعایا اور راجہ دونوں پر حکومت کر رہا ہے۔ آگے چل کر راجہ اور رعیت کا حیدر علی کے خلاف بڑا سخت رد عمل ہوا۔

پس —

حیدر علی کے خلاف پہلی سازش ۱۷۶۱ء میں ہوئی جب راج محل کی رانیوں نے اسے نمائندے راٹے درگ سری نواس راٹے کے ذریعے مدراس کے گورنر کے پاس درخواست پیش کی کہ وہ حیدر علی خاں سے راجہ میسور کو آزاد کرانے میں رانیوں کی مدد کرے۔ اس وقت مدراس کا گورنر لارڈ پیکاٹ تھا۔ اس نے درخواست کے جواب میں رانیوں کو اپنی تائید کا یقین دلایا۔

حیدر علی خاں کے خلاف دوسری سازش ۱۷۶۵ء میں ہوئی۔ رانیوں کو انگریزوں کی طرف سے زبانی جمع خرچ کے سوا، علی طور پر کوئی مدد حاصل نہ ہوئی تو انہوں نے اپنے نمائندہ کو پونہ روانہ کیا۔

پونہ اس وقت مرہٹوں کا صدر مقام تھا اور مرہٹوں کا پیشوا وہیں رہتا تھا۔ اس درخواست میں بھی رانیوں نے مرہٹوں کے پیشوا سے سرنگا پٹم کو حیدر علی خاں سے آزاد کرانے کے لیے مدد مانگی تھی۔

مرہٹے خود بھی جنوب میں ابھرتی ہوئی اس طاقت سے خائف تھے۔ اب جو ان سے رانیوں نے مدد مانگی تو وہ فوراً تیار ہو گئے اور مادھوراؤ پیشوا نے ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ مرہٹوں کو

ختم کرنے کے لیے میسور کے علاقوں پر حملہ کر دیا۔
لیکن۔

اسے ایک کے بعد ایک مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اپنی مشکلات پر قابو نہ پاسکا اور اسے خود حیدر علی سے صلح کر کے واپس ہونا پڑا۔
سلطنت خداداد کے خلاف تیسری سازش ۱۷۶۷ء میں ہوئی۔ یہ سازش اکیلے نہیں ہوئی بلکہ اس میں جنوبی ہند کی تین طاقتوں:

۱۔ الالاجہ محمد علی نواب ارکاٹ

۲۔ نظام الملک حیدر آباد دکن اور

۳۔ ایسٹ انڈیا کمپنی

کی ملی جھگت، بنیاد جی تھی۔

والالاجہ ارکاٹ کا حکمران تھا اور انگریز اس کے ایجنٹ تھے۔ ارکاٹ پر نظام دکن کی سیادت تھی اور والالاجہ خود مختار ہونے کے لیے حیدر آباد دکن میں سازشیں کر رہا تھا۔ حیدر آباد کا وزیر رکن الدولہ اور میر عالم ایسٹ انڈیا کمپنی کے جال میں پھنس چکے تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے حیدر آباد سے ایک معاہدہ کیا۔
اس کی تین شرطیں تھیں:

۱۔ والالاجہ محمد علی کو ارکاٹ کا مستقل اور آزاد حکمران تسلیم کر لیا گیا اور اسے نذرانے اور پیش کش سے بھی معافی مل گئی۔

۲۔ نظام الملک دریائے کرشنا کے جنوب میں پورے علاقوں سے دست بردار ہو گیا۔

۳۔ انگریزوں کو والالاجہ کا نامزد ایجنٹ تسلیم کر لیا گیا۔

اس معاہدے میں نہ صرف والالاجہ محمد علی اور ارکاٹ کا مسئلہ طے ہوا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس معاہدے میں صوبہ راجا کا معاملہ بھی شامل کر دیا۔ چنانچہ معاہدہ کی شق نمبر ۱ کے تحت صوبہ سرکاری دیوانی ساتھ لاکھ روپے دینے کے عوض صوبہ کمپنی کو بخش دیا گیا۔
مگر۔

صوبہ سرکار کا حکمران جو حیدر علی خاں تھا اس لیے معاہدے کی شق نمبر ۱ سے یہ ظاہر کیا گیا کہ

حیدر علی نے صوبہ سرکار پر زبردستی قبضہ کیا ہے اور وہ غاصب ہے۔

ان تینوں طاقتوں بلکہ سازش یوں نے اپنے طور پر سازش مکمل کرنے کے بعد متحدہ طور پر حیدر علی پر حملہ کر دیا جس میں نظام، والالاجہ اور انگریز تینوں ہی کی فوجیں شامل تھیں۔ اس جنگ کو "میسور کی پہلی جنگ" کا نام دیا گیا۔

حیدر آباد کی ایک مطبوعہ تاریخ اسے اس طرح بیان کرتی ہے:

"حیدر علی خاں کی ہمسایہ ریاستوں میں ایک طرف مرہٹے۔

دوسری طرف نظام سرکار اور تیسری طرف نواب کرناٹک تھے۔ نواب

کرناٹک کے درپردہ کرناٹک۔ پرانگیز حکمرانی کر رہے تھے۔

انگریزوں کو حیدر علی خاں سے سب سے زیادہ خطرہ تھا۔ خود حیدر

علی خاں بھی اس بدیسی طاقت کو ہند سے نکالنا چاہتے تھے لیکن نواب

کرناٹک کی سادہ لوحی نے انگریزوں کے قدم ہند میں جما دیے تھے۔

اور نواب کرناٹک ہی کے توسط سے انگریزوں نے نظام علی خاں

کے پاس اچھا سوخ حاصل کر لیا تھا۔"

انخاد یوں کے لیے اس جنگ کا نتیجہ بہت مایوس کن نکلا۔ انگریزوں کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے نتیجہ میں "سلطان ممد راس" لکھا گیا جو انگریزوں کی ذلت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سلطنت خداداد کے خلاف تیسری سازش میں مرہٹوں، نظام، والالاجہ اور انگریزوں کے ساتھ راج محل کی رانیوں کا نام کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ممکن ہے کہ وہ نواب حیدر علی سے اس وقت بہت زیادہ خد ہوں۔

لیکن۔۔۔ میسور کی پہلی جنگ، اور معاہدہ ممد راس کے بعد رانیوں میں ایک بار پھر حرکت پیدا ہوئی اور انہوں نے ریاست کی باز بانی کے لیے مرہٹوں کا منہ دیکھنا شروع کیا۔

چنانچہ ۱۷۶۷ء میں رانیوں نے اپنے دیوان تمل راڈ کو پونا روانہ کیا۔ تمل راڈ نے گونا پہنچ کر مرہٹوں کے پیشوا مادھوراؤ کے سامنے رانیوں کی درخواست پیش کی۔ اس وقت مرہٹے بھی کچھ انہی خطوط پر سوچ رہے تھے۔

ان کے پیش نظر پہلے ہی سے دو امور تھے:

۱۔ میسور پر قبضہ کرنا

۲۔ سید علی سے انتقام لینا

میسور کی رانیوں اور مرہٹوں کے مفادات تقرباً مشترک تھے اس لیے مادھورائے پیشوا نے زل زل کو تعاون کا یقین دلایا واپس بھیج دیا اور مرہٹوں نے ۱۷۷۲ء میں میسور پر چڑھائی کر دی۔

مرہٹوں کی کان خود مادھورائے پیشوا کو رہا تھا مگر اسے سید علی کے خلاف کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی اور وہ واپس چلا گیا۔

اس طرح دکن میں ہندو راج قائم کرنے کا خواب ایک بار پھر خواب ہی بن گیا اور شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

حیدر علی خاں کو جاسوسوں نے بتایا کہ اس سائش کا سرغنہ راج محل کی رانیوں کا پردھان یعنی دیوان ترل رائے ہے جو مرہٹے پیشوا کو میسور پر حملہ کی ترغیب دینے خود پونا گیا تھا۔ حیدر علی نے اسے گرفتار کر لیا مگر رانیوں کی خوشامد درآمد اور اپنے جذبہ ترقی سے مجبور ہو کر اسے معاف کر دیا اور اپنی طرف سے اسے کٹہرہ میں نواب عبدالکلیم خاں کے دربار میں اپنا وکیل مقرر کر دیا۔

احسان فراموش ترل رائے کٹہرہ پہنچ کے خاموش نہیں بیٹھا بلکہ اس نے دہل ایک اور سازش یعنی سلطنتِ خداداد کے خلاف پانچویں سازش کی ابتداء کی۔

اس سازش میں اس کا بھائی نارائن رائے بھی شریک ہو گیا جو اس وقت اتفاق سے کٹہرہ ہی میں موجود تھا۔

ان دونوں کو معلوم ہوا کہ مدراس کا گورنر لارڈ پیکاٹ ہو گیا ہے یہ دہلی گورنر تھا جس نے چار سال پہلے رانیوں کو مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔

دونوں بھائیوں نے کٹہرہ سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ انہیں یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ لارڈ پیکاٹ نے ریاستِ تنجاور کے اندرونی معاملات میں دخیل ہونا شروع کر دیا ہے اور اب حالات زیادہ سازگار ہیں۔

ان حالات اور خیالات کے تحت دونوں بھائی پہلے تنجاور پہنچے۔ اس وقت تنجاور میں انگریز

ریزیڈنٹ جان سیلیوان تھا۔

ترل رائے اور نارائن رائے نے جب اپنا منصوبہ جان سیلیوان کے ساتھ ساتھ راجہ تنجاور کے سامنے رکھا تو وہ دونوں ان کے ہمراز ہو گئے۔

ان دونوں بھائیوں نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ لارڈ پیکاٹ نے کچھ عرصہ پہلے رانیوں کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔

راجہ تنجاور کا تعاون حاصل کرنے کے بعد دونوں بھائی مدراس پہنچے اور پیکاٹ کو اس کا سالانہ وعدہ یا دلیا۔ لارڈ پیکاٹ نے از سر نو رانیوں کو مدد دینے کا وعدہ کیا مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس منصوبہ کا آغاز کس طرح کیا جائے۔ اس لیے کہ یہ سب کے سب ماضی اُس وقت کے میسور کے اندرونی حالات سے بالکل واقف نہیں تھے اور کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ میسور کے حالات سے واقفیت حاصل کی جائے۔

لارڈ پیکاٹ کو گورنر ہونے کی حیثیت سے وسیع اختیارات حاصل تھے۔ چنانچہ اس نے ایک پادری کو اپنا قاصد بنا کر مرنگاپٹم روانہ کیا۔ اس پادری کا نام شوارٹز تھا۔ اسے ایک دستاویز خط لے کر نواب حیدر علی کے پاس بھیجا گیا تھا اور اس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ پادری شوارٹز کو مذہبی تبلیغ کی اجازت دی جائے۔

حیدر علی خاں کو دستاویز خط بھیجنے کا تو ایک بہانہ تھا۔ دراصل پادری کو ایک جاسوس کے خرائق سننے گئے تھے۔ اور اسے راج محل کی رانیوں سے ملاقات کا حکم دیا گیا تھا۔ اس مقصد میں یہ پادری بہت کامیاب رہا۔

نواب بہادر حیدر علی خاں نے پادری شوارٹز کی پذیرائی کی اور اسے مذہبی تبلیغ کی اجازت دے دی۔

پادری نے تبلیغ کی اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور میسور کی رانیوں تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے ترل رائے اور نارائن رائے اور انگریز ریزیڈنٹ سیلیوان اور گورنر مدراس کے درمیان ہونے والی تمام گفت و شنید سے رانیوں کو آگاہ کیا اور خود میسور کے اندرونی حالات سے آگاہ ہو کر تنجاور پہنچا۔

تنجاور میں میسور کے پادری نے گورنر مدراس کی اجازت سے میسور کی رانی کشنما اور ایٹ اینڈ ایکسپریس کے درمیان ایک معاہدہ ترتیب دیا جس کا خاکہ حسب ذیل ہے :

میسور میں ہندو راج قائم کرنے کا معائدہ

مؤرخہ ۲۸ اکتوبر ۱۸۲۲ء
شہر لکھنؤ

ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے

رائی لکشمی کی جانب سے
ایسٹ انڈیا کمپنی حیدر علی سے
ہمارا تمام ملک واپس ہم کو لے کر
دے تو:

۱۔ جس وقت انگریز فوج حیدر
علی کے خلاف نقل و حرکت
شروع کرے گی تو انگریزوں
کو تین لاکھ کنٹا یا ایک لاکھ
(تھوڑے کانتھ تین روپے
کے برابر) دیے جائیں گے۔

۲۔ جس وقت انگریز فوج
حیدر علی کے چھوڑ کر بالاکھا
پر برہمن کی اور اودیسلی
بادیسی برہمن کے مقامات پر
قبضہ کرے گی تو مزید
ایک لاکھ گھوڑا دیے
جائیں گے۔

۳۔ جس وقت انگریز فوج
میسور پر قبضہ کر کے اس

ملک کو ہمارے قبضے میں دے دے گا تو
ایک لاکھ گھوڑا اور دیے جائیں گے
۴۔ جس وقت سرنگاپٹم کو تسخیر کر لیا
جائے گا اس وقت مزید پانچ لاکھ
گھوڑا دیے جائیں گے۔

۵۔ سرنگاپٹم فتح کرنے کے بعد جس
وقت سے رائی لکشمی کا منظور کردہ
راجہ تخت پر بیٹھے گا اس تاریخ سے
ایسٹ انڈیا کمپنی کو پانچ لاکھ گھوڑا
بطور خراج دیے جائیں گے۔

اس کے علاوہ سرکار میسور میں
ایک لاکھ کی جاگیر بھی کمپنی کو دی جائے
گی اور کمپنی کو اپنی فوج کا ایک حصہ
ہماری حفاظت کے لیے یہاں رکھنا
ضروری ہوگا۔

۶۔ کمپنی کو ملک کے اندر دفنی نظم و نسق
میں کوئی دخل نہ ہوگا۔

۷۔ حیدر علی کی تمام املاک، مال و زراعت
اور گھوڑے اور قلعوں میں جس قدر
سامان ہو۔ وہ میسور کے حوالے

ایسٹ انڈیا کمپنی یہ چاروں شرائط
منظور کرتی ہے۔

کمپنی اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ
رائی کے منظور کردہ راجہ کو تخت نشین
کرے لیکن رقم کے متعلق اس وقت
تعیین نہیں کیا جاسکتا۔ معلوم نہیں ملک
کی حفاظت کے لیے کس قدر فوج
ضروری ہو۔

کمپنی ملک کے اندر دفنی نظم و نسق میں
دخل نہیں دے گی لیکن وہ خراج جو
میسور کی طرف سے مرہٹوں یا سلطنت
مغلہ کے سو بیداروں کو دیا جاتا ہے
وہ کمپنی کے ذریعے ادا کیا جائے گا۔
براہ راست ادا کرنے کا میسور کو اختیار
نہ ہوگا۔

یورپی قاعدہ جنگ کے مطابق تمام
مال غنیمت سپاہیوں کا حق ہوتا ہے۔
اگر اس مال غنیمت کے عوض کوئی رقم

کر دینا ہو گا۔

مقرر کر دی جائے تو کمپنی اپنے افسروں کو ہدایت کرے گی کہ رقم لے کر مال غنیمت چھوڑ دیں۔

کمپنی حیدر علی کے خلاف بطور حریف جنگ کر رہی ہے اس لیے یہ شرط منظور نہیں کی جاسکتی البتہ میسور کی راجدھانی کے نوادہ مد نظر رکھے جائیں گے۔

دستخط :

جان سلیمان

ریڈیٹنٹ تینلور (برائے)

ایٹنڈ یا کمپنی)

دستخط :

۱۔ سیٹی ٹنلور

۲۔ ٹرل رائے (برائے

رائے میسور)

اس معاہدہ کے سلسلے میں تاریخ کے اوراق میں تین خطوط بھی موجود ہیں۔

ایک خط ٹرل راؤ اور اس کے بھائی نارائن راؤ کا دستخط شدہ ہے جس میں ان دونوں بھائیوں نے راجہ تیندرا اور ریڈیٹنٹ سلیمان کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے میسور کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا۔

دوسرے اور تیسرے خط پر لارڈ میکارتھی کے دستخط ہیں۔

ان میں پہلے خط کے ذریعے لارڈ میکارتھی نے رانی کشتا کو انگریزوں کے تعاون کا یقین دلایا ہے اور دوسرے خط میں اس معاہدے کی تصدیق کی ہے۔

جس زمانے میں یہ معاہدہ طے پایا تھا اس وقت حیدر علی اور انگریزوں کے درمیان میسور کی دوسری جنگ جاری تھی۔

یہ سازش حیدر علی کے خلاف کی گئی تھی لیکن اتفاقاً اس زمانہ میں نواب حیدر علی خاں وفات پا گئے اس لیے یہ سازش سلطان شیو کے خلاف استعمال ہوئی۔

جس وقت حیدر علی خاں کا انتقال ہوا تو سلطان شیو انگریزوں سے جنگ میں مصروف تھا۔

میدر علی خاں کا انتقال بھی دارا سلطنت مرزگا پٹم سے باہر ہوا تھا۔ یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ حیدر علی کے انتقال کی خبر پہلے مرزگا پٹم پہنچی پھر شہزادہ شیو کو اس کی اطلاع ہوئی۔ اس لیے سلطنت نے احتجاج کے طور پر شہزادہ کہیم کو مرزگا پٹم میں سے تخت نشین کر دیا تھا تاہم دشمنوں کو عازم کرنے کا موقع نہ ملے۔

سازشی تو ایسے ہی مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ دارا سلطنت مرزگا پٹم میں سازشوں کا ایک مرکز تو راج محل تھا جہاں کی رانیاں مرثیوں اور انگریزوں سے ساز باز کرتی رہتی تھیں تاکہ انہیں سکانون سے ریاست واپس مل جائے لیکن رانینوں کے علاوہ بھی مرزگا پٹم میں کٹر ہندوؤں کا ایک ایسا گروہ تھا جو یہ چاہتا تھا کہ میسور میں خالص ہندو حکومت قائم ہو۔ اس گروہ کا سرغنہ اپنے شاہیا تھا۔

اس کا پورا نام شاہیا انیگا تھا اور اسے حیدر علی خاں مرحوم نے ڈاک کا افسر اعلیٰ بنایا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی کا نام رنکا انیگا تھا جسے رنگیلا کے نام سے پکارتے تھے۔ اس گروہ کا تیسرا آدمی زرسنگ راؤ تھا۔ یہ شخص بلدیہ کا صدر تھا اور اس کے ساتھ ہی خزانہ کا افسر بھی تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی کا نام سنگیا تھا اور یہ شخص کوٹنور میں جج کے عہدہ پر مقرر تھا۔

ان سرمنوں کے علاوہ اس سازش میں اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے سرکاری عہدیدار شریک تھے۔

ان سب نے باہم طے کیا کہ مرزگا پٹم پر قبضہ کر کے ہندو راج قائم کیا جائے۔ اس سازش کو کامیاب کرنے کے لیے انہوں نے دو تہا دیز پر غور کیا اور ان پر عمل کے مندرجہ ذیل طریقے طے کیے :

۱۔ موقع ملنے پر سلطان شیو کو میدان جنگ میں قتل کر دیا جائے۔ یا پھر انگریزوں سے مدد حاصل کر کے ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جن سے سلطان کی میسور کو واپسی ناممکن ہو جائے۔

۲۔ ایک مقررہ دن مرزگا پٹم میں علم بغاوت بلند کر کے قلعہ پر قبضہ اور تمام مسلمان افسروں کو قید کر دیا جائے۔

پہلی تجربہ کو عمل میں لانے کے لیے تمل راؤ اور شوارٹز کے معاہدے نے راستہ صاف کر دیا تھا مگر مرزا کا پٹم والوں کو یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ شہزادہ بیٹو نے منگلور میں اس فوج کا محاصرہ کر لیا تھا جو کرنل ہمبرٹن کے ماتحت تھی۔

اس خبر سے لاطینی کے باعث سازشیوں نے سازش کے دوسرے حصے پر عمل شروع کیا جس کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز تھیں۔

۱۔ تنخواہ کے دن جب مسلمان سپاہی تنخواہ لینے آئیں تو انہیں ہندو سپاہیوں اور پرہے داروں کے ذریعے گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے۔

یہ اس لیے ممکن سمجھا گیا کہ تنخواہ لیتے وقت فوجی سپاہی عام طور پر ہتھیار لگاتے تھے۔

۲۔ رسالدار اسد خاں کو اسی وقت قتل کر کے فوراً خزانہ کے علاوہ گولہ بارود اور تمام ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا جائے۔

۳۔ ان تجاویز پر عمل کے لیے فوج کے ہندو سپاہیوں اور پرہے داروں کو اپنے ساتھ لایا جائے۔

۴۔ ضلع کو مختور (پانہیں گھاٹ) کے جج کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ انگریز فوج کی نقل و حرکت میں مدد دے۔

۵۔ شامیا کے بھائی رنگیا کو یہ کام سونپا گیا کہ قلعہ میں قید انگریز قیدیوں کو آزاد کر کے ان کی مدد سے قلعہ پر قبضہ کر لیا جائے۔

رنگیا نے اس مقصد کے لیے دس دن پہلے جنرل میٹھیوز اور دوسرے قیدیوں سے ملاقات کی تھی۔

۶۔ ان تجاویز کو عمل میں لانے کے لیے ۲۴ جولائی ۱۷۸۲ء کا دن مقرر کیا گیا تھا۔

فائنشورڈوں کا کہنا ہے کہ دو عادتیں انسان کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑتیں۔

۱۔ نیند کی عادت اور

۲۔ عشق و محبت کی عادت

اس کے لیے ایک مثل مشہور ہے کہ انسان کو تلوار کی نوک اور پھانسی کے تختے پر بھی لٹا دیا جاتا ہے۔

اسی طرح یہ مثل بھی مشہور ہے کہ عشق و محبت کی کرشمہ سازیاں میدان جنگ میں بھی اپنا ایک دکھا کے رہتی ہیں۔

میور کے ہندو راجاؤں کے پاس سواری کے لیے کئی ہاتھی تھے۔ ان ہاتھیوں کو سنبھالنے کے لیے ایک مسلمان خاندان مامور تھا۔

مسلمانوں کا یہ خاندان صدیوں سے راج کے ہاتھیوں کی دیکھ بھال کا کام کر رہا تھا۔ اس زمانہ خاندان کی راجسٹری راج محل کے قریب ہی تھی۔

پھر جب راجاؤں سے ریاست نکل کر حیدر علی خاں کے پاس چلی گئی تو بھی رمضان خاں فیضان محل ہی میں مقیم رہا۔ دراصل اسے راج محل میں ایک فرد کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

رائی لکشمیا نے ریاست ہاتھ سے نکل جانے کے بعد رمضان خاں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ دراصل کے پاس جا سکتا ہے مگر رمضان خاں نے اس خاندان کا نام لکھایا تھا اس نے راج محل سے اسے انکار کر دیا۔

رائی لکشمیا اس کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوئی اور رمضان خاں مع اپنی اکلوتی بیٹی کے جو مانی کے نام سے مشہور تھی، راج محل میں بے خوف و خطر رہنے لگا۔

رمضان خاں کے خاندان کے دوسرے لوگ راج محل سے چلے گئے تھے اور انہوں نے محل خاں کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔

رمضان بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور اب اس سے کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ رائی لکشمیا نے اسے کام کرنے سے روک دیا تھا اور اسے گھر بیٹھے گزارہ کے لیے تنخواہ مل رہی تھی۔

رمضان کی بیٹی رمضان تیرہویں چودھویں سال میں قدم رکھ رہی تھی رکھنے کو بھی اچھا لگتا تھا اس لیے خوب رنگ روپ نکالا تھا۔

وہ دن بھر راج محل میں گھسی رہتی تھی اور لکشمیا کی خدمت کی بجا آوری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔

رائی لکشمیا کا محل سازشوں کا مرکز تھا۔ وہاں ہندو سازشیوں کے مشورے ہوتے اور

منسوبے تیار کیے جاتے تھے۔

جب رمضان چھوٹی تھی تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا لیکن جوں جوں شعور پیدا ہوا وہ ان باتوں کو سمجھنے لگی تھی۔

رمضان کی بات سن کے آتی تو باپ سے کہتی:

"بابا یہ لوگ نواب بہادر کو مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نواب بہادر نے ریاست پر قبضہ کر لیا ہے۔ انہیں مار کر یہ ریاست کو آزاد کرائیں گے۔"

اور رمضان اسے زور سے ڈالتا:

"چپ رہو جازمضان۔ اسمیں باتیں نہیں کیا کرتے۔"

"میں کب باتیں کرتی ہوں بابا۔"

رمضان جواب دیتی:

"یہ باتیں تو وہ لوگ کرتے ہیں۔ جو رانی لکشمیا کے پاس آتے ہیں۔"

پھر رمضان اسے محبت سے سمجھاتا:

"دیکھ رمضان۔ تو رانی لکشمیا کی خدمت پر لگی ہے۔ کوئی باتیں کیا کرے تو تو اپنے کان بند کر لیا کر۔ کچھ سننے کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ نواب بہادر کو ماریں یا نواب بہادر انہیں ماریں ہمیں کسی بات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ سن یا تو نے؟"

مگر رمضان ہند کیڑہ بانی:

"مگر بابا! کلو نو کلو کتا ہے کہ نواب بہادر فرشتہ ہیں فرشتہ۔ انوں نے تو کبھی رانی لکشمیا کو مارنے کی بات نہیں کی۔"

کلو اس کے چچا کا بیٹا تھا۔ اس کا چچا خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ قلعہ میں چلے جانے کے بعد قلعہ دار کی نوکری میں تھا۔

رمضان ہفتہ میں ایک دن چچا کے گھر ضرور جاتی تھی۔ کلو سے اس کی کچی دوستی تھی یا یوں کہنا چاہیے کہ دونوں میں محبت تھی۔

پتہ نہیں کلو کا نام کلو کیوں رکھا گیا تھا۔ اس کا رنگ گورا تھا اور آنکھیں بھوری بھوری۔ ہاتھ پیر بھی اچھے تھے۔

کلو کے باپ نے رمضان سے کہہ دیا تھا کہ اگلی عید پر وہ رمضان کو اپنی بہو بنا کر لے

ہلے گا مگر رمضان، بیٹی کو اپنی زندگی میں اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ:

"رمضان میری جان کے ساتھ ہے کلو کے باپ۔ جب تک میں زندہ ہوں اسے میرے ہی ساتھ رہنے دو۔ میرے بعد پھر یہ بتا رہے ہی گھر رہے گی اور کہاں جائے گی۔"

کلو کے باپ کا مطالبہ بھی درست تھا۔ اس کا بیٹا ہند کر رہا تھا کہ رمضان کو راج محل سے لڈالے آیا جائے۔

کلو نے اس کی کوئی خاص وجہ نہیں بتائی تھی لیکن رمضان جانتا تھا کہ راج محل میں رمضان کا لینہ بن کے رہنا کچھ مناسب نہیں۔ وہاں کا ماحول بالکل ہندوانہ تھا۔ رات دن پوجا پاٹ کا چرچا ہوتا تھا۔ شہر کے بڑے بڑے پڈت رانیوں کے پاس آتے رہتے تھے۔ ایسے ماحول میں رمضان اسے سے بیٹھ بھی سکتی تھی۔ ماں اس کی پہلے ہی مر گئی تھی اور رمضان کو تو یوں ہی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔

کلو کے باپ کے مطالبے میں اس قدر شدت پیدا ہوئی کہ رمضان بیٹی کو اگلی عید پر گھر رخصت کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

رمضان تو دل ہی سے یہ چاہتی تھی اور اب تو یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ رمضان کی رخصتی کے اتنے ہی رمضان بھی راج محل سے قلعہ میں آجائے گا۔

کلو بھی قلعہ دار سید محمد خان کی نوکری پر لگ گیا تھا اور اس نے قلعہ دار سے اپنی رانیوں کے الگ کو اڑ بھی مانگ لیا تھا۔

لیکن۔

اراموں بھری رمضان کی رخصتی عید سے پہلے ہی ہو گئی۔

اس کی وجہ شہزادہ پیپو (جو اب سلطان بن چکا تھا) کے خلاف وہ سازش تھی جس کا سرغنہ لہڑاک کا افسر علی انچے شامیا تھا۔

یہ وہی سازش تھی جس کا ذکر سابقہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ اس سازش پر ۱۲۴۰ھ - ۱۲۴۱ھ کو علی ہونا تھا۔

مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے یعنی ۲۳ - ۲۴ جولائی ۱۷۸۲ء کی درمیان رات کو تمام رانی لکشمیا کے محل میں جمع ہوئے۔

رانی کشمانے اگرچہ اس سازش میں براہ راست حصہ نہیں لیا تھا لیکن وہ اس میں شریک ضرور تھی اور تمام کاروائی اسی کے محل میں ہو رہی تھی۔

اس تاریخ یعنی ۲۳ جولائی ۱۷۸۴ء کو منصوبہ کے مطابق ہندو پیریداروں اور سپاہیوں میں ہتھیار تقسیم کر دیے گئے تاکہ ۲۴ جولائی کو مسلمان سپاہیوں میں ستخوہ تقسیم ہونے کا موقع پر انہیں قتل کر دیا جائے۔

رمضانی اگرچہ رات دن رانی کشما کی خدمت میں رہتی تھی مگر اسے اس سازش کا پتہ بالکل نہ چل سکا۔ ہوسکتا ہے پھر بھی سازشوں کی ناکامی کے بعد رانی کشما زیادہ محتاط ہو گئی ہو اور سازشیوں کے اجلاس وغیرہ میں زیادہ رازداری سے کام لیا گیا ہو۔ اس لیے رمضانی کو کچھ بہ معلوم ہو سکا۔

رمضانی دراصل ایسی باتوں کی کریمہ نہ کرتی تھی بلکہ جو کچھ اس کے کانوں تک پہنچ جا تھا اسے وہ باپ اور بھائی تک پہنچا دیتی تھی۔

مگر۔

۲۳ اور ۲۴ جولائی ۱۷۸۴ء کو اتفاقاً طور پر رمضانی پر اس سازش کا انکشاف ہو گیا۔ ہوا یوں کہ رمضانی معمول کے مطابق رانی کشما کی خدمت میں موجود تھی کہ ایک لونڈی نے دھاوا بھڑک رانی کو اطلاع دی:

"بڑی ڈبوڑھی کا جوکیدار کچھ عرض کرنے حاضر ہوا ہے۔"

رانی کو جوکیدار کا اس وقت آنا شاید ناگوار گزرا۔ اگرچہ ابھی رات کچھ زیادہ نہ ہوئی اور رانی خاصی دیر سے سویا کرتی تھی مگر رانی نے بڑے سخت لہجے میں جواب دیا:

"کیوں آیا ہے۔ کیا کھانا چاہتا ہے اس وقت؟"

لونڈی نے گھر سے آئے ہوئے ہاتھ دھوئے کہا:

"اے رانی۔ اس نے مجھے چھ نہیں بتایا۔ ابھی پوچھ کے آتی ہوں۔"

رانی کشما نے منہ بنا کر اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ قریب سیڑھی ہوئی رمضانی نے لونڈا کو اس طرح اشارہ کیا جیسے کہ "رہی ہو کہ" جا اور پوچھ کے آ۔"

لونڈی اٹے پیروں واپس ہو گئی اور چند ہی منٹ بعد لوٹ آئی۔

رانی کشما کا مزاج پہلے ہی گہر چکا تھا۔ اس نے اور زیادہ سختی سے پوچھا:

"کیا کھتا ہے جوکیدار۔ کیوں آیا ہے؟"

لونڈی کو ڈر کی وجہ سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا:

"ہمارا رانی۔ جوکیدار نے بتایا ہے کہ اپنے شامیا اور دوسرے لوگ آئے ہیں اور آپ سے اور ملنا چاہتے ہیں۔"

اب رمضانی کی باری تھی۔

اس نے رانی کے بولنے سے پہلے ہی جواب دیا اور جواب بھی بالکل رانیوں کے سے ملازمین دیا:

"جا۔ اور ان سے کہہ دے کہ ہمارا رانی اس وقت نہیں مل سکتی۔ اپنے شامیا صبح سے دوبار ملنے آچکا ہے۔ اب کیا ایسا ضروری کام پڑ گیا ہے کہ پھر پریشان کرنے آ گیا ہے۔ زما رانی آرام نہ کریں کیا؟"

لونڈی شاید واپس جانے لگی تھی کہ رانی نے اسے رد کیا:

"گھر جا۔ اپنے کو بٹھا۔ میں آتی ہوں ابھی۔"

پھر ہلٹ کر رمضانی سے کہا:

"تو گھر جانا چاہیے تو چلی جا۔ اگر بیٹھنا ہو تو انتظار کر۔ میں ابھی آتی ہوں ان سے دو بات کر کے۔"

"اچھی کہاں جاؤں گی ہمارا رانی۔"

منہ چڑھی رمضانی نے تڑپ سے جواب دیا:

"مجھے اتنی جلدی نیند کہاں آئے گی۔"

رمضانی کی بات ختم ہونے سے پہلے رانی اپنے کمرے سے نکل چکی تھی۔

رمضانی کا مانتا تھا کہ اپنے شامیا رمضانی کو پسند بھی نہ تھا۔ وہ بے دمہڑک راج محل آتا تھا کہ رمضانی بھی سمجھتی رہی کہ وہ رانی کا کوئی عزیز ہزار ہے جبھی روز آتا ہے اور کبھی تو کے دن میں کئی کئی چکر لگ جاتے تھے۔

اپنے شامیا کا رمضانی سے آنا سامنا ہو جاتا تو وہ اسے بھڑکتا۔

"رمضانی۔ تو کتنی اچھی ہے۔ پلے گی میرے گھر؟"

رمضانی فوراً انکار کرتی:

"واہ جی۔ میں کیوں جانے لگی کسی کے گھر۔ ہمارا بیٹے کب چھوڑتی ہیں۔ وہ مجھے کھانا گھر نہیں جانے دیتیں۔"

"میں تجھے ہمارا بیٹے سے مانگ لوں۔ تب تو چلے گی۔"

رمضانی نے ہمارا بیٹے سے شکایت کیا کھانا تھا:

"ہمارا بیٹے یہ جو اپنے تئیں مہاراج ہیں، کہتے تھے کہ رمضان میں تجھے ہمارا بیٹے سے مانگ لوں گا۔ آپ انکار کر دیجیے گا۔ میں ان کے گھر نہیں جاؤں گی۔"

ہمارا بیٹے نے ہنس کے کہا تھا:

"وہ تجھے چھوڑتا ہے۔ محول کرتا ہے گھر ہے اچھا آدمی۔ بڑا امیر ہے۔ اس کے پاس چپ جلنے کی تو عیش کر سکتی ہو۔"

"واہ ہمارا بیٹے۔ میں کیوں جلنے لگی۔"

رمضانی نے صاف انکار کر دیا تھا:

"مجھے آپ کے پاس کیا کمی ہے جو میں کسی اور کے گھر جاؤں؟"

"تو تو کسی کے گھر نہیں جاسکتی؟" رانی نے پوچھا تھا۔

اور رمضان نے بے دھڑک کہا تھا:

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ آپ کو چھوڑ کے کسی کے گھر نہیں جاؤں گی۔"

"کلو کے گھر بھی نہیں جاسکتی کیا؟"

اور رمضان نے شرمائی ہوئی تھی۔

وہ انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ لوٹتی پھر آگئی۔

"اب کیوں آئی۔ کیا کوئی اور آگیا ہے ملنے ہمارا بیٹے سے؟"

رمضانی کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا اس لیے وہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔

"ہاں رمضان جی۔"

لوٹتی نے جواب دیا:

"مگر دہشت آئے ہیں۔"

رمضانی اور چڑچڑی ہوئی:

"انہیں بھی اسی وقت آنا تھا۔ جا کے کہہ دے کہ ہمارا بیٹے اس وقت مصروف ہیں۔ کسی

نہیں مل سکتیں۔"

لوٹتی چپ چاپ واپس ہو گئی۔

وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے رمضان سے محبت کی تو وہ ہمارا بیٹے سے شکایت کر دے گی اور پھر اس کی مصیبت آجائے گی۔

لوٹتی کے جانے کے بعد رمضان کو اک دم خیال آیا کہ ہمارا بیٹے کو گئے ہوئے تو ایک گھنٹہ سے زیادہ ہو چکا ہے۔ اسی کی باتیں ہو رہی ہیں جو ہمارا بیٹے نے اتنی دیر کر دی!

اس شخص نے رمضان کے دل میں ایسی کھلبلی مچائی کہ وہ دریافت حال کے لیے اس کے پاس کی طرف چلی جاں ہمارا بیٹے والوں سے ملاقات کیا کرتی تھیں۔

اس سے پہلے اس نے کبھی چپ کے باتیں سننے کی کوشش نہ کی تھی۔ ہاں اس کے کان میں چلتے پھرتے اگر کوئی بات پڑ جاتی تو وہ اپنے باپ اور گلوٹنگ ضرور پہنچاتی تھی۔

رمضان کو اس کے پاس پہنچنے تو اسے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ مگر اس کے اندر شمعوں کی تیز روشنی ہو رہی تھی اور یہ روشنی پردوں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

رمضان کو کمرے کی کھڑکیوں تک پہنچنے کی ضرورت نہ پڑی۔ باہر کی راہداری میں اندر ہونے والی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

رمضان نے راہداری کے ایک ستون کے پاس رک کر پہلے تو کمرے کے اندر نظر دوڑائی۔ کمرے کے اندر موجود لوگ اس کے لیے اجنبی نہ تھے۔ ان میں دو تو اس کے خاص واقف کار تھے۔ ایک اپنے شامیہ۔ دوسرا رنگی۔

بہ دو دونوں کے بھائی تھے اور دونوں ہی رمضان کو چھوڑتے رہتے تھے۔ رنگی نے تو ایک دن آہستہ سے اس سے کہہ بھی دیا تھا:

"رمضان! میرا دل تجھ پر آگیا ہے۔ میں تجھے اپنی رانی بناؤں گا۔"

رمضان کو ہنسی آگئی۔ اس نے جواب دیا تھا:

"مہاراج۔ یہی بات تمہارے بھائی شامیہ نے بھی کہی تھی۔"

"وہ تو صرف تجھے چھوڑتا ہے۔ رنگی نے اسے ہلا دیا تھا۔"

"تم بھی تو مجھے چھوڑتے ہو۔" رمضان نے ہنس کے کہا تھا۔

"نہیں رمضان۔ مجھے تجھ سے محبت ہے۔ میں بھوٹ نہیں ہوں۔ میں تجھے اپنی رانی

بنائے رکھوں گا۔

”اچھا تو جب تم راجہ ہو جاؤ تو مجھے رانی بنالینا۔“
رمضانی نے رنگی کا منہ بند کر دیا تھا۔

مگر۔

اس وقت تو بچے شامیا اور رنگی کمرے کے اندر شیر کی طرح دھاڑ رہے تھے۔ ان کا چہرے لال تھے اور منہ سے کف اڑ رہا تھا۔

رمضانی نے ادھر کان لگا دیے۔ اب جو اس نے ان لوگوں کی باتیں سنیں تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

”ہائے کیا میرا کلو بھی مار ڈالا جائے گا۔“

اس کے ساتھ ہی رمضانی کے دل میں ایک ٹیس اٹھی اور ہوک بن گئی۔ اس کا سر پکڑ لیا لگا اور ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

دہ تیزی سے رانی کے کمرے کی طرف پلٹی۔ اس میں اب اور کوئی بات سننے کی طاقت نہ رہ گئی تھی۔ غداروں اور باغیوں کا پورا منصوبہ اس کے دل و دماغ پر ہتھوڑے کی طرح چڑھ گیا رہا تھا۔

کمرے میں پہنچ کے وہ فرش پر جیسے گر پڑی۔ اس کا سر بھاری ہو گیا اور سارا جسم ٹوڑ رہا تھا۔

اس نے سب باتیں سن لی تھیں اور آنے والے کل کے طوفان کی شدت وہ ابھی سے محسوس کرنے لگی تھی مگر۔ اس طوفان میں اسے صرف اپنا کلو تھیرے کھانا دکھائی دے رہا تھا۔ رمضانی کو آتے ہوئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ رانی کشمکش کمرے میں داخل ہوئی۔

”اے رمضانی۔ تو اب تک گھر نہیں گئی؟“ رانی نے تعجب کا اظہار کیا۔

رمضانی، رانی کے ایک دم آجائے سے گھر اٹھی تھی مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا

ادب سے بولی:

”مہارانی میں کیسے جاتی آپ کی اجازت کے بغیر؟“

اور کشمکش نے اسے اجازت دیدی:

”اگر میں مصروف ہو جاؤں تو تو بغیر اجازت چلی جایا کر۔ باجلی جا۔ بہت رات ہو گئی!“

رمضانی بھاگ بھاگ گھر پہنچی۔ باپ بڑ بڑایا:

”اتنی رات کر دی۔ میرا بھی کچھ خیال کیا کر۔“
رمضانی نے ٹالا:

”رانی نے اب اجازت دی ہے تو آئی ہوں۔“

باپ نے اور کوئی سوال نہیں کیا۔

رمضانی تو بے چین ہو رہی تھی۔ اس نے کہا:

”بابا۔ میں قلعہ جا رہی ہوں۔“

”کیوں؟“ بابا چونک پڑا۔

”تمہیں پتہ نہیں کلو بہت بیمار ہے۔“ رمضانی نے صاف جھوٹ بولا۔

”کب سے بیمار ہے کلو۔ مجھے تو نے بتایا نہیں۔“

”بتایا تھا۔ تمہیں یاد کب رہتا ہے؟“

پھر ذرا ٹھہر کے بولی:

”پہلی جاؤں پھر؟“

”مجھے بھی ساتھ لے چل۔“

”کل لے چوں گی۔“

اور رمضانی کو ٹھہری کے دروازے پر پہنچ گئی۔

باپ نے نصیحت کی:

”دیکھو بھال کے جانا۔ رات میں آنے کی ضرورت نہیں۔ کیا پتہ کیا ہو جائے؟“

رمضانی کو پوری چھوٹ مل گئی۔

راجہ کے محلات کے گرد ایک اونچی دیوار تھی جو تفصیل کا بھی کام کرتی تھی۔ تفصیل کے گیٹ پر پھر سے دار نے رمضانی کو گھور کے دیکھا مگر اسے رد کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ رانی کشمکش کی غصہ کنیز کو کون روک سکتا تھا۔

راج محل سے قلعہ دارا اس کے مکان کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ ایک روشن لمبی شرک ان

دونوں حصوں کو ملائی تھی۔

سڑک کے دونوں طرف بڑی بڑی شمعیں اشع دانوں میں جل رہی تھیں اور رمضان تیز تیز قدموں سے قلعہ دار کے مکان کی طرف جاگ رہی تھی۔

اس وقت سرنگا پٹم کا حاکم قلعہ (قلعہ دار) سید محمد خاں تھا۔

وہ بڑا محنتی اور دفا دار افسر تھا۔ صبح سویرے نکلتے ہی دفتر میں پہنچ جاتا اور شام غروب آفتاب کے وقت گھر واپس جاتا۔ دفتر سے اس کا گھر قریب سی گزیرا۔ دفتر کی اوقات میں گھر نہیں جاتا تھا۔

قدرت کے کام نزلے ہوتے ہیں۔

وہ جو کام بگاڑنا چاہے تو اس کے اسباب پیدا کرتی ہے اور اگر کسی کام کو سنوارنا منظور تو اس کے اسباب بھی غیب سے پیدا کرتی ہے۔

قلعہ دار سید محمد خاں غروب آفتاب کے وقت گھر واپس آ جاتا کرتا تھا۔ اس کا پر سے دار کلو بھی اسے گھر تک پہنچانے کے گھر چلا جاتا کرتا تھا۔

مگر اس شام —

قلعہ دار کو ایک ضروری کام کی وجہ سے دفتر میں ہی رکنا پڑا اور جب وہ دفتر سے اٹھا تو رات بھیگ رہی تھی۔

قلعہ دار سید محمد خاں اور کلو آگے پیچھے دفتر سے قلعہ دار کے گھر کی طرف آ رہے تھے کہ انہیں کسی کے بھاگنے کی آواز محسوس ہوئی۔

کلو نے فوراً ہندو سیدھی کر لی۔ قلعہ دار نے کہا:

”کوئی ہمارے دفتر کی طرف بھاگتا ہوا جا رہا ہے۔ تم آگے بڑھ کے دیکھو۔ میں تمہارا ہمیں

پر انتظار کر رہا ہوں۔“

کلو حکم پا کے بندوق چھپتا ہوا تیز قدموں سے آگے بڑھا۔

قلعہ دار سید محمد خاں کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ بظاہر تو قلعہ دار کی فضا پر سکون تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ یہاں کسی وقت بھی کوئی بڑا حادثہ ہو سکتا ہے۔ جب تک نواب بہادر جات تھے، ماضی ڈرڈ کے کام کرتے تھے مگر ان کے بعد یہ شیر ہو گئے تھے۔ مخالفین کا خیال تھا کہ جوں عمر سلطان پٹو اتنی بڑی سلطنت کو سنبھال نہ سکے گا اسی لیے جگہ جگہ

چھوٹی چھوٹی بغاوتیں اور سازشیں سر اٹھانے لگی تھیں۔

قلعہ دار سید محمد خاں ایسے ہی خیالات میں الجھا کھڑا تھا کہ کلو واپس آیا مگر وہ تنہا نہ تھا۔ کوئی عورت اس کے ساتھ تھی۔

”یہ کون ہے کلو؟“ قلعہ دار نے دریافت کیا۔

”آقا یہ — یہ رمضان ہے۔ کلو نے رک رک کے بتایا۔

”یہ اتنی رات گئے یہاں کیوں آئی ہے؟“ قلعہ دار کا لہجہ کھٹ ہو گیا۔

قلعہ دار کی ڈانٹ پر کلو ڈر گیا:

”آقا۔ یہ کہتی ہے کہ کل قلعہ میں قیامت آئے گی۔ سب مسلمان مار دیے جائیں گے اور

— اور —

”کیا بکواس ہے یہ؟“

قلعہ دار کو غصہ آ گیا:

”اور آرمضان! کیا کہہ رہی ہے تو؟“

رمضان کلو کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔ اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ قلعہ دار کی آواز سن کے

ڈرتے ڈرتے آگے آئی۔

”صاحب.....“ رمضان کی آواز گلے میں پھنسے لگی۔

”گہر امت رمضان!“

قلعہ دار نے اسے تسلی دی:

”بتا کیا بات ہے۔ آج تک رات میں تو ادھر کبھی نہیں آئی۔ اب کیا مصیبت پڑی کہ

بھاگی چلی آئی ہے؟“

”صاحب جی۔ میں جھوٹ نہیں بولتی۔“

رمضان ذرا سنبھلی:

”جھوٹ ثابت ہو تو گردن اڑا دیجیے گا۔“

”کیا جھوٹ ثابت ہو جائے۔ کچھ بتا تو؟“ قلعہ دار نے نرمی سے پوچھا۔

رمضان ذرا اور سنبھلی:

”صاحب جی۔ وہ اپنے شامیا، اس کا بھائی رنگیا اور — اور سب راج محل میں رانی

لکشمیا کے پاس کہہ رہے ہیں کہ کل سب مسلمانوں کو مار ڈالو۔ قلعہ۔

”چپ ہو جا۔ ٹھہر جا۔“

قلعدار نے رمضان کو روک دیا۔ پھر کلو کو حکم دیا:

”تو جا اور ایک سو بندو قیدیوں کو ساتھ لے کے دم میں واپس آ جا۔ رتی بھر دیر نہ ہو۔ بھاگتا ہوا جا۔“

قلعدار سید محمد خاں نے کلو کو ادھر بھیجا اور خود رمضان کو لے کے اپنے گھر آیا۔ اس کے گھر والے رمضان کو پہچانتے تھے اس لیے اُسے دیکھ کر انہیں کچھ زیادہ حیرت نہ ہوئی مگر قلعدار کے حکم پر انہیں بہت جراتی ہوئی۔

قلعدار کا حکم تھا:

”پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ شاید یہیں یہاں سے نکلنا پڑے۔“

پھر قلعدار، رمضان کو اپنے کمرے میں لے گیا اور اس سے پوچھا:

”ہاں رمضان اب بتا۔ راج محل میں کیا ہو رہا ہے؟“

”صاحب جی!“

رمضان کا خوف دُور ہو چکا تھا۔ اس نے اطمینان سے بنانا شروع کیا:

”شامیا۔ رنگیا اور سب ہندوؤں نے طے کیا ہے کہ کل جب سپاہی تختہ اعلیٰ آئیں تو

ہندو سب مسلمان سپاہیوں کو قتل کر ڈالیں۔ صاحب جی۔ آپ کل کلو کو تختہ اعلیٰ لے نہ بھیجے گا۔“

قلعدار کو رمضان کی بات پر غصے کی بجائے اس کی معصومیت پر رحم آ گیا۔ سچ ہے کہ گھٹنے

پیٹ ہی کی طرف مڑتے ہیں۔ رمضان کو صرف کلو کی نکر تھی اور یہی فکر اسے راج محل سے یہاں

کھینچ لاتی تھی۔

قلعدار نے آہستہ سے کہا:

”گہر امت رمضان۔ تیرا کلو نہیں مارا جائے گا۔ اب بتا اور کیا باتیں ہو رہی تھیں دہلی؟“

”صاحب جی۔ اب تو وہ سب لوگ چلے گئے ہیں۔ ہمارا بھی اپنے کمرے میں واپس آ گئی

تھی۔ جی تو میں موقع پا کر کلو کو خبر دینے آ گئی۔“

رمضان کی معصومیت بدستور برقرار تھی۔ اس کی ہر بات کی تان کلو پر آ کر ٹوٹتی تھی۔

”کوئی اور بات بھی ہوئی تھی ان میں؟“ قلعدار نے نرمی سے پوچھا۔

”ہاں صاحب جی۔“

رمضان نے بتایا:

”شامیا کہہ رہا تھا کہ فوج کے بندہ سپاہیوں کو انہوں نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔“

”ہوں۔“

قلعدار نے ایک لمبی سانس کھینچی:

”اور کچھ بھی سنائے تو نے؟ یاد کر کے بتا رمضان۔ تیرے بتانے سے سیکڑوں مسلمانوں کی

جانیں بچ جائیں گی۔“

”صاحب جی۔ میں کیوں نہیں بتاؤں گی۔ جیسے کلو کی جان ویسے دوسروں کی جان۔ میں سوچ سوچ

کے بتاتی ہوں۔۔۔۔۔“

رمضان ایک لمحہ ٹھہری۔ پھر بولی:

”وہ آپ کے قلعہ میں انگریز قیدی ہیں ناں۔ ان میں ایک بڑا افسر بھی ہے۔ یہ لوگ اس افسر

سے ملے ہیں اور طے کیا ہے کہ اس کی مدد سے قلعہ پر قبضہ کر لیں گے۔“

اتنا کہہ کے رمضان پھر خاموش ہو گئی۔

قلعدار سید محمد خاں بہت بے چین تھا۔ اس نے پھر پوچھا:

”کچھ اور یاد کر رمضان۔ شاید یاد آ جائے!“

رمضان سوچتے ہوئے بولی:

”صاحب جی۔ وہ باہر سے فوج بلانے کی بات بھی کر رہے تھے اور۔ اور ہاں جی۔ وہ کہنے

کہہ رہے تھے۔ ہائے۔ میری زبان کٹ جائے۔ کہہ رہے تھے کہ سلطان کو وہیں قتل کر

دیں گے۔ اور ہاں کوئی زہ سنگ راؤ ہے وہ انگریزی فوج لائے گا۔“

اتنے میں اطلاع ملی کہ کلو واپس آ گیا ہے۔ قلعدار سید محمد خاں باہر آ گیا۔ ایک سو بندو قیدی

باہر موجود تھے۔

قلعدار سید محمد خاں تیس پینتیس سال کا ایک تیز منہ سردار تھا۔ اس نے اسی وقت مندرجہ

ذیل احکام جاری کیے:

۱۔ دس بندو قیدی برادر زہ سنگ راؤ کو گرفتار کر کے لے آئیں۔

۲۔ دس بندو قیدی برادر اپنے شامیا اور رنگیا کو گرفتار کر کے لائیں۔

۳۔ پانچ ہندو برادر شتاب رائے کو گرفتار کر کے لائیں۔
 ۴۔ دونوں گرفتار سوار فوراً سلطان معظم کی طرف روانہ ہوں جو انہیں اس سازش سے آگاہ کرنے کے علاوہ ان سے اپنی ذاتی حفاظت کی درخواست کریں۔
 ۵۔ ۲۵ ہندو برادر اپنے ساتھ مزید سپاہیوں کو لے جائیں اور قلعہ میں موجود تمام ہندو سپاہیوں کو گرفتار کر لیں۔
 ۶۔ دس سوار قلعہ کے جیل خانہ پر جائیں اور پہرے پر جس قدر ہندو سپاہی ہوں، ان سے گرفتار کر کے ان کی جگہ مسلمان پہرے دار مقرر کر دیے جائیں۔
 باقی ہندو چیچروں کو لے کر قلعہ دار سید محمد خاں صدر دروازے پر پہنچا اور وہاں سخت پہرہ لگا دیا۔

قلعہ کے باقی دروازوں پر بھی پہرے دار زیادہ کر دیے گئے۔ تمام راج محلوں کے گرد زبردست پہرہ لگا دیا گیا۔
 ان انتظامات میں آدھی سے زیادہ رات گزر گئی۔ قلعہ دار سید محمد خاں گھوڑے پر سوار پورے قلعہ میں چکرانا پھر رہا تھا اور حسب ضرورت جگہ جگہ چوکی پر سو سخت کر رہا تھا۔
 اس نے اب تک رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اسی پر کیا موقف گھر کے تمام لوگوں نے بھی کچھ کھایا یا پیا نہیں تھا اور وہ سب مختصر سامان کے ساتھ آمادہ سفر تھے مگر خدا کا شکر تھا کہ سازش تکمیل کے مراحل سے گزرنے سے پہلے ہی کھل گئی تھی اور قلعہ دار کو اپنے گھروالوں کو قلعہ سے باہر نہیں پھینکا پڑا تھا۔
 پھر بھی سب پر ایک خوف و دہشت سا طاری تھا۔
 ایک بار جب سید محمد خاں کسی طرف سے گھوم کے گھر پہنچا تو رمضان نے گلو گھیرا اور اس سے درخواست کی:
 "صاحب جی۔ مجھے گھر بھجوا دیجیے یا میرے بابا کو وہاں سے بلو لیجیے۔ وہ میرے بہت گھبرا رہا ہو گا۔"
 "رمضان۔ ہم تمہارے احسان مند ہیں۔
 قلعہ دار تے متشکر ہے میں کہا:
 "میں بھی تمہارے بابا کی اسی قدر فکر ہے جتنی تمہیں ہے مگر تمہیں کچھ دیر اور انتظار کرنا پڑے

۱۶۷
 ۱۔ باغیوں کے گرفتار ہوتے ہی ہم تمہارے بابا کو یہاں بلوالیں گے۔ تمہارا یا تمہارے بابا کا اب راج محل میں یا اس کے قریب رہنا ٹھیک نہیں۔ ہم تمہیں اور تمہارے بابا کو یہاں سرکاری مہمان کے طور پر رکھیں گے۔ تم نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا ہے۔"
 قلعہ دار کی بات ختم ہوئی تھی کہ دس ہندو چیچروں کے پہرے میں زسنگھ راؤ گرفتار کر کے لایا گیا۔
 زسنگھ راؤ، سرزنگا پٹم کی بلکہ یہ کا صدر اور خزانہ کا افسر تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے آیا اور قلعہ دار سید محمد خاں کو دیکھتے ہی اس کے پیروں پر گر پڑا۔
 "خان صاحب۔ تمہیں اپنے اللہ کی قسم۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے اپنے شامیانے بھکایا تھا۔ وہی دونوں بھائی سازش کے سرغنہ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے زبردستی ردیہ نکلوا کر سپاہیوں میں بانٹا تھا۔ مجھے معاف کر دو خان صاحب۔ سید صاحب۔ میں عمر بھر تمہارے گھروالوں کو دعاؤں دیتا رہوں گا۔"
 زسنگھ راؤ نے بغیر پچھے سازش کا اعتراف کر لیا۔
 قلعہ دار سید محمد خاں کو رمضان کی بات کا یقین تھا، پھر بھی اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا کہ شاید رمضان کے سننے میں کچھ فرق ہو۔ مگر زسنگھ راؤ کے اقبال جرم کے بعد رمضان کی تمام باتوں کی تصدیق ہو گئی تھی۔
 قلعہ دار نے اسے جواب دیا:
 "زسنگھ راؤ۔ چیخ و پکار کی ضرورت نہیں۔ تو بغاوت میں شریک ہے خواہ اس کے سرغنہ کوئی بھی ہوں۔ تیرا مقدمہ سلطان معظم کے حضور پیش ہو گا اور وہی فیصلہ کریں گے۔ رخصت کھڑا رہ۔ جو گویا ہے وہی کاٹے گا۔"
 زسنگھ راؤ کی آدھی جان نکل گئی۔

اسی وقت، قلعہ کے صدر دروازے کے دو پیریدار ایک ہندو کو لے کر حاضر ہوئے۔
 قلعہ دار نے قلعہ کے تمام دروازے سیل کر دیے تھے اور حکم دیا تھا کہ اگر کوئی شخص باہر جانے کی ضرورت ہے تو پہلے اس کی تلاشی لی جائے پھر اسے پیش کیا جائے۔
 پیریداروں میں سے ایک نے بتایا:
 "قلعہ دار صاحب۔ یہ آدمی خود کو ہمارا نیکشتا کا خاص ملازم بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارا

نے اسے منگھوڑا اپنے ایک عزیز کے پاس بھیجا ہے اس لیے اس کا اسی دقت قلعہ سے باہر ہونا ضروری ہے۔“

قلعدار نے دریافت کیا:
”تم نے اس کی تلاشی لی۔ کچھ نکلا اس کے پاس سے؟“
”نہیں قلعدار صاحب۔“

پھر سے دار نے جواب دیا:

”یہ کہنا ہے کہ وہ زبانی پیغام لے کر ہمارا ہے۔ اس نے تلاشی دینے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارا فی کے محل کے آدمیوں کی گیٹ پر تلاشی لینے کا حکم نہیں ہے۔“

قلعدار کو طیش آ گیا:

”حکم ہے کہ نہیں، یہ تو بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے تم اس کی تلاشی لو۔“

پھر یاروں نے اس کی تلاشی لی تو اس کی اندر کی جیب سے ایک بند لٹافہ نکلا۔ لٹافہ قلعدار سید محمد خاں کو دیا گیا۔

اس نے لٹافہ چاک کر کے خط نکالا اور روشنی میں لے جا کر پڑھا۔

لٹافہ سے جو خط نکلا وہ جرنل میتھیوز کا لکھا ہوا تھا۔ یہ جرنل دوسرے انگریزوں کے ساتھ قلعہ سرنگا پٹم میں قید تھا۔

جرنل میتھیوز نے خط میں، منگھوڑ میں مقیم کرنل ہمرٹن سے درخواست کی تھی کہ وہ فوراً سرنگا پٹم روانہ ہو جائے کیونکہ بغاوت ہو چکی ہے اور سرنگا پٹم اور قرب وجوار کی پوری ہندو آبادی اس بغاوت میں شریک ہے۔ سلطان سرنگا پٹم سے دور ہے اور قلعہ پر قبضہ کر کے کوشش جاری ہے۔

خط پڑھنے کے بعد قلعدار نے ہندو قاصد سے پوچھا:

”سچ سچ بتا۔ یہ خط تجھے کس نے دیا ہے؟“

قاصد نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش کھڑا رہا۔

قلعدار نے کلمہ کو حکم دیا:

”کلہو خاں۔ اس سے تین بار پوچھو کہ یہ خط اسے کس نے دیا ہے۔ اگر یہ تیسری بار بھی

جواب نہ دے تو اس کے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں قلم کر دو۔ اگر پھر بھی نہ بتائے تو بائیں

ہاتھ کی انگلیاں کاٹ دو۔ پھر دایاں ہاتھ، بایاں ہاتھ۔ دایاں پیر، بایاں پیر۔ اور آخر میں خنجر.....“

قاصد کے ہاتھ پیر لرز رہے تھے۔ جب بات خنجر پر پہنچی جو اس کی مکمل موت کی خبر تھی تو وہ رو پڑا اور ہاتھ جوڑ کے بولا:

”میری جان بخش دو قلعدار صاحب۔ میں سب کچھ بنانا ہوں۔“

وہ اس قدر خوفزدہ تھا کہ دھوئی ہی میں اس کا پیشاب خطا ہو گیا۔

قلعدار سید محمد خاں چنچ کے بولا:

”بتا چاہے نہ بتا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں تم لوگوں کو قتل تو کر سکتا ہوں مگر کسی کو معاف نہیں کر سکتا۔ تم لوگ سلطان معظم کے مجرم ہو۔ تمہارا فیصلہ وہی کریں گے۔“

قاصد نے ہاتھ جوڑ کے کہا:

”قلعدار صاحب۔ مجھے خط اپنے شامیلانے دیا تھا مگر وہاں اس کا بھائی رنگیا بھی موجود تھا۔“

قلعدار نے دوسرا سوال کیا:

”یہ خط تجھے راج محل میں دیا گیا یا کسی اور جگہ؟ اور کیا تجھے معلوم ہے کہ اس مازش میں رانی لکشمیا شامل ہے؟“

”نہ۔ نہ قلعدار صاحب۔ مجھے ہمارا فی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“

قاصد کڑکڑاتے ہوئے بولا:

”یہ خط مجھے اپنے شامیلانے اپنے گھر ملا کر دیا تھا۔ راج محل میں تو میں آج تک گیا ہی نہیں۔“

اسی شب۔

اپنے شامیلا۔ رنگیا اور دوسرے سرنٹوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ نائب قلعدار شتاب رائے کو

بھی حراست میں لے لیا گیا۔ یہ سرنگا پٹم کا سابق قلعدار تھا۔

قلعدار سید محمد خاں نے قلعہ میں موجود تمام افراد کو طلب کر لیا تھا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی

بتایا کہ ہندو سپاہیوں میں کچھ اسلحہ بھی تقسیم کیا گیا ہے۔

چنانچہ۔ رسالدار اسد خاں کو حکم دیا گیا کہ تقسیم شدہ اسلحہ ہندو سپاہیوں سے واپس لے

کر سپاہیوں کو جیل میں بند کر دیا جائے۔

یہ تمام کام نہایت خاموشی سے کیا گیا۔ راج محل یا قلعہ والوں کو اس وقت تک کوئی خبر نہ

تھی کہ وہاں تیار ہونے والی سازش کا کیا انجام ہوا؟
انہیں اس وقت کچھ شبہ ہوا جب قلعدار سید محمد خاں کے حکم سے رمضان کے باب رمضان
کو راج محل کی غلام گردش سے بلوایا گیا۔ اسے پانچ سواری لینے آئے تھے۔ وہ سیدے رمضان کی
کوٹھڑی پر پہنچے اور اسے ایک گھوڑے پر بٹھا کر ساتھ لے گئے۔
یہ خبر فوراً عمارانی لکشا کو پہنچائی گئی۔

اس نے رمضان کے بارے میں پوچھا مگر کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ جب سوار رمضان کو لے کر
بارہے تھے تو راج محل کے پہرے دار اور دوسرا اعلیٰ دور ہی کھڑا تھا۔ دیکھا کہ کسی کو قریب
آنے کی جرات نہ ہوئی۔

عمارانی کو اگرچہ شبہ ہو گیا تھا کہ شاید سازش ناکام ہو گئی ہے لیکن وہ اپنے شاہیا کسی اڈ
کے گھر اپنا آدمی بھیج کر خود کو اس سازش میں فوٹ نہ کرنا چاہتی تھی۔

صبح ہونے پر جب یہ خبر عاں ہوئی تو ہر شخص حیران رہ گیا۔ مسلمانوں کو اس بات کا افسوس تھا
کہ حیدر علی خاں مرحوم اور ان کے پوتے سلطان پٹو نے صرف چند گاؤں پر مشتمل ریاست
میسور کو ایک عظیم الشان سلطنت میں تبدیل کر دیا ہے لیکن راج محل کی رانیوں نے اب تک نواب
کو نواب اور سلطان کو دل سے سلطان تسلیم نہیں کیا اور وہ اٹھ دن حکومت کے خلاف سازشیں
کر رہی ہیں۔

ادھر قلعدار سید محمد خاں نے تمام باغیوں کو سخت پہرے میں سلطان کے پاس منگوا کر
روانہ کر دیا۔

وہاں پہنچنے پر سلطان نے باغیوں سے پوچھ گچھ کی تو سب نے مدافیاں مانگنا شروع کر دیں۔
باغیوں کے ساتھ قلعدار نے رسالدار احمد خاں کو بھیجا تھا تاکہ وہ سلطان کو سازش کی پوری تفصیل
سے آگاہ کرے۔

سلطان نے پوری تحقیق کے بعد تمام باغیوں کو سولے شتاب رائے کے قتل کر دینے کا
حکم دیا۔ شتاب رائے کے خلاف کوئی مضبوط ثبوت نہیں تھا اس لیے اسے رہا کر دیا گیا۔
اس طرح سلطنت، خداداد کے خلاف یہ سازش بھی ناکام ہو گئی۔

انگریزوں نے اسی سال سلطان سے معاہدہ کر لیا۔ یہ عہد نامہ الیٹ انڈیا کمپنی نے مجبوراً
کیا تھا کیونکہ اس معاہدہ سے جنوبی ہند میں ان کے اقتدار کو سخت دھچکا پہنچائی اور جب اس کی

برائے انگلستان پہنچی تو وہاں کھلم کھچ گیا۔

مسزود ناما کا ایک انگریز جو اس جنگ میں خود شامل تھا، لکھتا ہے:
”مجھے یقین ہے کہ پٹو سے جو معاہدہ ہوا ہے وہ عارضی ثابت ہوگا
کوئی انگریز ان ذلتوں کو برداشت نہیں کر سکتا جو اس جنگ میں
اٹھانا پڑیں۔“

اس سازش کے فوراً بعد سلطنت خداداد کے خلاف ساتویں سازش کی گئی۔

یہ سازش دراصل نظام دکن اور مرہٹوں کے درمیان ایک معاہدہ تھا۔ ان دونوں کا خیال
تھا کہ سلطنت میسور انگریزوں کے ساتھ چار سالہ جنگ میں اس قدر کمزور ہو گئی ہے کہ اسے
آسانی سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے آپس میں معاہدہ کر کے سلطان سے جنگ
چھیڑ دی۔

یہ جنگ تین سال تک جاری رہی اور آخر نظام اور مرہٹوں کو اس میں شکست اٹھانی پڑی
سلطان کو یہ فتح ۱۷۸۸ء میں حاصل ہوئی۔

انگریز اس عرصہ میں بظاہر خاموش تھے لیکن ان کا رابطہ رانی کے ایجنٹ تمل راڈ سے
قائم تھا۔

انگریز، ہندوستان اور انگلستان میں سلطان کو نہایت گندے الفاظ میں بدنام کرنے کی
کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اُس وقت انگلستان کا وزیر اعظم مسٹر پٹ تھا۔ اسی نے لارڈ کارنوالس
کو ہندوستان کا گورنر جنرل اور جرنل میڈوز کو مدراس کا گورنر بنا کر بھیجا تھا۔

لارڈ کارنوالس کو امید تھی کہ جرنل میڈوز اپنی جنگی قابلیت کے زور پر سلطان کو
شکست دیدے گا مگر خلاف توقع جرنل میڈوز کو پے درپے شکستیں اٹھانی پڑیں۔

شکستوں سے کارنوالس اس نتیجے پر پہنچا کہ جنوبی ہند کی کوئی انفرادی طاقت سلطان کو شکست
دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی اس لیے ضروری ہے کہ سلطان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم
کیا جائے جس میں جنوبی ہند کی تمام طاقتیں شامل ہوں۔

ظاہر ہے کہ لارڈ کارنوالس یہ چاہتا تھا کہ نظام دکن، مرہٹوں کا پیشوا اور وہ خود بھی

انگوینہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ پھر سلطان پر ایک بھرپور حملہ کر کے اس کے کس بل نکال دیے جائیں۔ پس۔

اس نے اسی منصوبہ کے تحت کام شروع کیا۔

مرحوم نواب بہادر جید علی خاں اور سلطان شیو کے خلاف ہونے والی سازشوں پر اگر کیا جاسے تو ان میں بعض باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ان تمام سازشوں میں راج علی کی رائیاں بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک دکھائی دیتی ہیں۔

دوسری بات جو مشترک ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے وہ یہ کہ ان سازشوں کی ناکامی یا انکشاف میں عام طور پر حسن و عشق کی دیدہ دلیریاں اور کارفرمایاں نظر آتی ہیں۔

انچے شامیہ والی سازش اس قدر زبردست تھی اور اس کا تانا بانا اس انداز سے بنایا گیا کہ اس کے ناکام ہونے کی ایک فیصد بھی امید نہ تھی مگر اس میں ایک معمولی فیضان کی بیٹی رضفا کے عشق نے ایسی لگ رگائی کہ بہترین سازشی دانوں کا ہٹا ہوا یہ تانا بانا ایک دم جل کر بھس ہو گیا۔

تمام باغی اپنے کبوتر گردار کو پہنچے اور رضفا کا عشق کامیاب ہوا۔ سلطان نے رضفا کو کٹو کے ساتھ نہ صرف شادی کرائی بلکہ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے شاہی اخراجات سے ہوئی اور سلطان بہ نفس نفیس اس بارات میں شامل ہوا۔

رضفا اور کٹو کو اس قدر سلائی مل جو ان کی آئندہ کئی پشتوں کے لیے کافی تھی۔ کٹو زرق بھی دی گئی۔

لاڈ کا رنوالس نے منہ مجاذ یا اتحادی تلانہ کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ دوسری طرف اس نے اپنے گورنروں کو حکم دیا کہ سلطنت خداداد کے اندر سازشوں کا جال پھیلا دیا جائے اور سلطان کے افسروں کو مال و دولت یا دوسرے لالچ اور وعدوں سے خرید لیا جائے۔ اس کا

کے لیے کرنل ریڈ کو مقرر کیا گیا۔

کرنل ریڈ نے ان لوگوں، امیروں، پالیگاردوں اور حکمرانوں کو ڈھونڈ نکالا جو سلطان شیو کے ایک یا کسی دوسری وجہ سے خلاف ہو گئے تھے۔

ایسے لوگوں میں کنکنڈی نالہ کے پالیگار بھاری کورہ کے لڑکے، چک بالاپور، گر بکوٹہ، کلکویر، بدن پٹی، آئینکلی اور انکوس گری کے پالیگاروں کے علاوہ نیکنندہ کاراجہ اور جیل نائیک کا پالیگار بھی شامل تھا۔

ان لوگوں کو یقین دلایا گیا کہ اگر میسور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو ان کے علاقے اور ریاستیں انہیں واپس دیدی جائیں گی۔

سلطان کے ان مخالفوں کو حکم دیا گیا کہ وہ سلطنت خداداد میں داخل ہو کر اپنی اپنی جگہ پہنچیں دروہن کے حالات سے انگریزوں کو مطلع کریں۔ نیز جنگ کے وقت انگریزی فوج کو رسد و غیرہ مہیا کریں۔ اس کے لیے ان میں سے ہر ایک کو کافی رقم دی گئی کہ وہ جس طرح چاہیں اس رقم کو استعمال کریں۔

سلطان نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ مخالفین کو سلطنت خداداد میں ہرگز داخل نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ناجروں کا بھیس بدلا اور مختلف راستوں سے سلطنت خداداد میں داخل ہو کر ملک بھر میں سازشوں کا جال پھیلا دیا۔

کرنل ریڈ جو ان سازشوں کا انچارج تھا، اس نے میسور کے ایک اہم کارکن (افسر) کو پنے ہال میں پھانسی لیا اور یہ کرنل ریڈ کا سب سے بڑا کارندہ بن گیا۔ اس کا نام سید امام تھا۔

سید امام نے سلطان کی ملازمت کر لی تھی اور سرنگا پٹم سے انگریزوں کو خبریں بھی کرتا تھا۔ بے کرنل ریڈ نے بہت کافی رقم بھجوائی تھی کہ وہ اپنے ساتھ اور لوگوں کو بھی شامل کرے۔ چنانچہ ماندار ملک و ملت نے اپنے ساتھ پندرہ بیس سرکاری افسروں کو شامل کر لیا تھا۔ یہ لوگ دن میں سرکاری کام کرتے نظر آتے مگر ان کی راتیں شبستانوں میں گزرتی تھیں۔

سید امام کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس نے نلے اوپر چار شادیاں کی تھیں مگر کوئی اولاد نہ پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس نے ایک لڑکے کو متبنتی کر کے اپنا بیٹا بنالیا تھا۔

سید امام کا یہ بیٹا سن سنوڑ میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ ہر وقت باپ کے ساتھ رہتا تھا اور

ہلتے جلتے رگ گیا۔

اس نے زربینہ کی سہیلی سے کہا:

”میں نے زربینہ سے ایک بات پوچھی ہے۔ وہ مجھے خواب دیتے ہوئے ہچکچا رہی ہے۔ تم اس کی سہیلی ہو۔ اس کا جواب لے کے مجھے بتا دو۔ میں مہمان خانے میں بیٹھا ہوں۔“

وہ یہ کہہ کے مہمان خانے میں چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی زربینہ تیزی سے اٹھی اور دوڑ کے سہیلی سے لپٹ گئی۔ وہ اس بذور سے لپٹی کہ اس کی سہیلی بانو کی پسلیاں چڑچڑانے لگیں۔

”جھوٹ۔ جھوٹ۔ زربینہ۔ کیا مجھے مارنے کا ارادہ ہے؟“ بانو نے کسماتے ہوئے کہا اور زربینہ نے اسے جھوٹ دیا۔

پھر خود ہی زربینہ نے بات پھر دی:

”آج باپ نے مجھ سے ایک بڑی اچھی بات کہی ہے زربینہ!“

”اور تو نے باپ کو اس کا جواب نہیں دیا؟“ بانو نے ہنس کر کہا۔

”کسے اللہ۔ مجھے کیسے معلوم ہوا؟“

”بس۔ فرشتوں نے بتایا ہے۔“

”سچ سچ بتا۔ تجھے کس نے بتایا؟“

زربینہ ذرا سنجیدہ ہوئی تو بانو نے کہا:

”پہلے تو یہ بتا کہ باپ نے آج تجھ سے کیا بات کہی تھی تب میں بتاؤں گی۔“

”باپ نے کہا تھا۔“

اور زربینہ کا چہرہ جیسا سے گلنار ہو گیا۔ وہ مزید کچھ کہنے کے بجائے ایک بار پھر بانو سے لپٹ کر رہ گئی۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔ میں سمجھ گئی۔“

بانو نے اسے الگ کرتے ہوئے کہا:

”شادی کی بات کی ہوگی باپ نے۔“

”ہاں۔ یہی بات تھی۔ زربینہ ہنس پڑی:

”مگر تو نے کیسے جانا؟“

اس کے کارناموں سے پوری طرح واقف تھا۔

یہ لڑکا جس کا نام غفرام تھا، اپنے باپ کی حرکتوں سے سخت نالاں تھا مگر کچھ کہہ بھی نہ سکتا تھا اس لیے کہ اس کا اور کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور اس کا باپ اسے اس خیال سے کہیں ملازم نہ کرانا تھا کہ کہیں اس کے کرتوتوں کا بھانڈا نہ پھوٹ جلتے۔

خدا معلوم کہ غداروں کا یہ کردہ اور کیا غضب ڈھاتا کہ آخر اس کا بھانڈا اچھوٹ گیا۔ یہ روایت اس طرح بیان کی گئی ہے:

جس حویلی میں سید امام اور غفرام رہتے تھے اس کے سامنے سرنگاپٹم کے ایک مسلمان تاجر کا مکان تھا۔ اس کی اکیلی بیٹی زربینہ آتے جلتے غفرام کو دیکھتی اور غفرام اسے دیکھا کرتا۔

یہ دیکھا دیکھی اور ناک جھانک آنحضرت میں بدل گئی۔ یہ بات جب زربینہ کے باپ کے کانوں تک پہنچی تو اس نے بیٹی سے پوچھ گچھ کی:

”زربینہ بیٹی۔ میں نے سنا ہے کہ سید امام کا لے پاک بیٹا تجھے آتے جاتے تاکتا ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟“

زربینہ مسئلے میں آگئی۔

اکیلی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ باپ کی بہت منہ چڑھی بلکہ بیباک تھی مگر باپ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر وہ پسینے میں نہ آئی۔

باپ نے کوئی جواب نہ پایا تو پھر کہا:

”زربینہ! تو میری اکیلی اولاد ہے۔ تیری ماں کے مرنے کے بعد میں نے تیری ماں اور باپ دونوں کے فرائض ادا کیے ہیں۔ تیری کوئی بات سمجھی نہیں ٹالی۔ اگر غفرام کو تو اچھا سمجھتی ہے تو مجھے بتا دے میں اس سے تیری شادی کر دوں گا۔“

باپ نے بڑی معقول پیش کش کی تھی۔ زربینہ کو مان لینا چاہیے تھی مگر۔ جڑا ہوا اس نسواں کا۔ زربینہ کی زبان باپ کے سامنے پھر بھی نہ کھل سکی اور وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہا۔

حالاںکہ اس کے دل میں لڑو پھوٹ رہے تھے۔

پھر۔

اس کی یہ مشکل اس کی ایک سہیلی نے حل کر دی۔

زربینہ کا باپ واپس جانے کو تھا کہ زربینہ کی رازدار ایک سہیلی گھر میں داخل ہوئی۔ زربینہ

"میری شادی سے پہلے میرے بابا نے بھی مجھ سے پوچھا تھا۔" بانو نے کہا۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ بانو کی ماں بھی بچپن ہی میں سرگئی تھی اور اس کے باپ نے بھی زربینہ کے باپ کی طرح دوسری شادی نہ کی تھی۔ اس طرح یہ دونوں بے ان کی پچھل آئیں میں کھلتے کودتے جوان ہوئی تھیں۔

مگر اب زربینہ اکیلی ہو گئی تھی۔ ایک سال پہلے بانو رخصت ہو کے دوسرے شہر چلی گئی تھی۔ پھر وہ جب کبھی میکے آتی تو دونوں سہیلیاں مل بیٹھتیں پھر بچپن کے دن یاد کیے جاتے اور وہ گھنٹوں باتیں کیا کرتیں۔

زربینہ نے جواب دیا:

"تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ بابا پوچھ رہے تھے کہ کیا مجھے خرافا پسند ہے۔ میں شرم کے مارے انہیں کوئی جواب نہ دے سکی۔"

"اور وہ تیرے جواب کے لیے اب تک ممان خانے میں انتظار کر رہے ہیں۔" بانو نے مسکرا کر

اسے چھیڑا۔

"بابا انتظار کر رہے ہیں؟"

زربینہ نے تعجب سے اس کی بات دہرائی:

"مگر وہ تو تمہارے آنے سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔"

"وہ جا رہے تھے کہ میں آ گئی۔"

بانو نے اسے بتایا:

"انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے زربینہ سے ایک بات پوچھی ہے تم اس سے جواب لے کر

مجھے بتاؤ اور یہ کہ وہ ممان خانے میں جواب کا انتظار کریں گے۔"

"ہائے۔ بابا اب تک یہاں بیٹھے ہیں۔" زربینہ گھبرا گئی۔

"گھبرانے کی کیا بات ہے۔ جواب دو۔ تمہیں خرافا پسند ہے کہ نہیں؟" بانو نے زربینہ کے

چہرے لے کر پوچھا۔

"پسند تو ہے مگر میں اپنے منہ سے کیسے کہوں؟" زربینہ کے ماتھے پر پسینے کے قطرے

چھک اٹھے تھے۔

"بس اب تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" بانو نے ایک اور چٹکی لی:

"میں تمہاری پسند بابا کو پہنچا دوں گی۔"

بانو اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔

"کہاں چلیں۔ بیٹھنا؟" زربینہ نے اسے رد کیا۔

"تمہارے بابا انتظار کر رہے ہیں۔ میں انہیں جواب دینے جا رہی ہوں۔" اور بانو پیک

چھک کرتی کمرے سے نکل گئی۔

زربینہ کا خیال تھا کہ بانو، بابا سے گفتگو کرنے کے بعد اس کے پاس واپس آئے گی لیکن

جب وہ دیر تک نہ آئی تو اس نے ملازم سے پوچھا۔

ملازم نے بتایا کہ:

"وہ تو ایک منٹ صاحب جی سے بات کر کے اپنے گھر چلی گئیں۔ صاحب جی بھی ان کے

بعد ہی چلے گئے تھے۔"

زربینہ اسی الجھن میں گرفتار تھی کہ بانو ہنستی ہوئی پھر داخل ہوئی۔

"نئے مبارک ہو زربینہ۔ میں نے تمہاری پسند تمہارے بابا تک پہنچا دی ہے۔" اس نے

مسکراتے ہوئے بتایا۔

"اچھا۔" زربینہ نے دلچسپی سے پوچھا:

"بابا نے کچھ کہا تھا؟"

بانو منہ بنا کے بولی:

"تیرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے سہیلی۔ وہ مجھ سے کیا کہتے۔ ہاں یہ ضرور کہا تھا کہ مشکل یہ ہے

کہ دونوں گھروں میں کوئی عورت نہیں ہے۔ شادی کی بات کس طرح چلائی جائے؟"

زربینہ نکلے مند ہو گئی:

"اب کیا ہو گا۔ سیداما سے بات کون کرے گا؟"

"تو فکر کیوں کرتی ہے؟" بانو نے اسے تسلی دی:

"اس کا علی بھی میں نے سوچ لیا ہے۔"

"مجھے بھی بتاؤ۔ تم نے کیا سوچا ہے؟" زربینہ اس کے سر ہو گئی۔

بانو نے اسے بتایا:

"میں نے سوچا ہے کہ جس دن سیداما گھر آئیں تم مجھے بلو لینا۔ میں خود ان سے بات

کردوں گی۔

”تم۔ تم میری شادی کی بات سیدام سے کرو گی؟“

زرینہ نے جبران ہو کر پوچھا:

”تمہیں شرم نہیں آئے گی؟“

”تم بالکل احمق ہو زرینہ۔ میں آخر شادی شدہ ہوں۔ تجھے بات کرنے کا سلیقہ ہے۔“ بانو نے جواب میں کہا:

”تم بس مجھے خبر بھیج دینا۔ پھر میں جانوں۔“

سیدام اور خزام دونوں دن بھر گھری پر رہتے تھے مگر ادھر کچھ دنوں سے شاید سیدام پر کام کچھ زیادہ پڑ گیا تھا اس لیے وہ دونوں صبح کو آپس میں ملتے۔ پھر سیدام سویرے ہی گھر سے نکل جاتا اور رات بھی بہت دیر سے واپس آتا۔

زرینہ اور بیکری منزل میں چلی جاتی اور خزام کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں بیٹھ جاتی اور خزام جیسا کامنہ بولا باب اب کم ہی اپنے ماتھے لے جاتا تھا۔ بھی پہلی منزل کے کمرے میں چلا جاتا۔ بس پھر دونوں کی نظریں ٹکراتیں اور اشاروں میں دل کی باتیں کرتی رہتیں۔

کہتے ہیں دو محبت کرنے والے اگر زبان سے بات نہ بھی کریں تو ایک دوسرے کا مطلب بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔

یہ سلسلہ ایک ہفتے تک چلتا رہا۔

پھر ایک صبح ایسا ہوا کہ خزام کہیں جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ اسی وقت سیدام باہر سے آ گیا۔ دونوں میں دروازے ہی پر گفتگو ہوئی۔ پھر خزام کہیں باہر چلا گیا اور سیدام گھر میں داخل ہوا۔

زرینہ کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔ اس نے ملازمہ کو بھیج کے فوراً ہی بانو کو گھر بلوایا۔

”آج سیدام گھر میں ہیں؟“ اس نے بانو کے داخل ہوتے ہی اسے اطلاع دی۔

بانو مسکرا دی اور بولی:

”تو اس قدر گھبراٹی ہوئی کیوں ہے۔ اپنی حالت تو سنبھال۔“

”تم جاؤ گی نہیں اُن کے پاس؟“ زرینہ بوکھلا کر بولی۔

بانو کو ہنسی آ گئی:

”تو ایسے پریشان ہو رہی ہے جیسے کل ہی تیری شادی ہو جائے گی۔ ذرا سوچنے دے۔“

سیدام اسے کس ڈھنگ سے بات کر دے گی۔ میں ڈرتی نہیں لیکن ہپلا موقع ہے غیر مرد سے بات کرنے کا۔ پتہ نہیں کس دماغ کے ہیں بزرگ محترم۔“

بزرگ محترم نہیں۔ وہ تو اپنے آپ کو اب تک جوان ہی سمجھتے ہیں۔“ زرینہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی:

”گھر سے نکلے ہیں تو دروازے پر رک کر اچھی طرح پگڑی کو سنبھال کے مر رہ جاتے ہیں۔ اگر کوئی عورت اتنے جلد مل جاتے تو اسے کنکھیدوں سے دیکھتے ضرور ہیں۔“

”بہت تجزیہ کار معلوم ہوتے ہیں۔“ بانو ہنسی۔

”بڑے لگاؤ نہیں۔ چار بیویاں کھلا چکے ہیں۔“

زرینہ جھک رہی تھی:

”اگر پانچویں مل جاتے تو اس سے بھی کم لیں۔“

”ایسے تجزیہ کار تو بڑے اچھے جیون ساتھی ثابت ہوتے ہیں۔“ بانو نے شرارت سے نظروں سے زرینہ کو دیکھا۔

زرینہ باتیں تو خوب بناتی تھی مگر تھی سیدھی سادی۔ وہ بانو کی بات کی تہ تک نہ پہنچ سکی اور فوراً بولی:

”یہ بات تو تم نے سچ کہی۔ بوڑھے شوہر اپنی بیویوں سے پیار کر جتے بہت ہیں۔“

بانو اسی موقع کی تلاش میں تھی۔ اس نے فوراً جملہ کہا:

”تو پھر کیا خیال ہے۔ تیرا پیغام خزام کے جلتے سیدام کے لیے نہ دے دے۔“

بڑے عیش کرنے لگی بوڑھے کے ماتھے۔ جھوپیاں بھر بھر محبت ملے گی تبھی اور۔“

”خدا کی مار تجھ پر۔“

زرینہ نے اسے دو ہتھکڑیاں سید کر کے کہا:

”تو یہ سوچ رہی ہے میرے لیے۔ سبیل ہے کہ میری دشمن۔ میں اس کوھوٹ کی داڑھی میں

امگ نہ لگا دوں۔ خدا غارت کرے اُسے۔

”ارے رے رے۔“ بانو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا:

”اپنے ہونے والے خسر کو ایسا نہیں کہتے اس غریب نے تیرا کیا بگاڑا ہے!“

پھر بانو نے ایک ہلکا سا قہقہہ بلند کیا اور اس میں زربینہ کی آواز بھی شامل ہو گئی۔

بانو چلنے کے لیے تیار ہوئی تو زربینہ اسے دروازے تک پہنچانے لگی۔

”خدا ام بھی ہے گھر میں؟“ بانو نے دروازے سے نکلنے ہوئے پوچھا۔

”ہو نہ ہو۔ تمہیں کیا؟“ زربینہ چڑھ گئی:

”بات تو سید اماں سے کرنا ہے۔“

بانو مسکراتی ہوئی چل پڑی۔

مکان دُور ہی کتنا تھا۔ سڑک کے ادھر زربینہ کا گھر اور اُدھر بالکل سامنے سید اماں کا رہا

تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

بانو بے دھڑک داخل ہو گئی۔

”کون ہے؟“ دروازے کے برابر والے کمرے سے آواز آئی۔ یہ کمرہ همان خانے کے

طور پر استعمال ہوتا تھا۔

”میں ہوں۔ سامنے کے مکان سے آئی ہوں۔ بانو نے بجاری آواز سے اندازہ لگایا

یہ سید اماں ہی ہو سکتا ہے۔

وہ سید اماں ہی تھا۔ اس نے جھانک کے دیکھا:

”کس سے ملنا ہے تم کو؟“

”آپ سید اماں ہیں نا؟“

”اُہ۔ میں ہی سید اماں ہوں۔“

”بس آپ ہی سے ملنا ہے۔“

”جھ سے۔“

اور پھر سید اماں نے دروازہ کھول دیا: ”آجاؤ اندر۔“

بانو بلا کھٹکے اندر چلی گئی۔

”بیٹھ جاؤ۔“

بانو ایک گدے دار کوچ پر بیٹھ گئی۔

اب کو۔ کس لیے آئی ہو؟“ سید اماں حیران نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کے مکان کے بالکل سامنے میری ایک سینی رہتی ہے۔“

”رہتی ہوگی۔ پھر۔“ سید اماں نے الجھتے ہوئے کہا۔

”زربینہ نام ہے اس کا۔ بڑی سلیقہ شعار اور خوبصورت لڑکی ہے۔ دیکھا ہوگا آپ نے

میں اُسے۔“

بانو بہت سنبھل سنبھل کے بات کر رہی تھی مگر اصل مطلب زبان پر نہ آ رہا تھا۔ اس کے

یہ پہلا موقع تھا ایسی بات کا۔

سید اماں نے ایک انگلی سے سر کھمایا۔ پھر سوچتے ہوئے کہا:

”شانید دیکھا ہے۔ گھر پھر؟“

”دیکھا ہے آپ نے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ کیسی لگی آپ کو؟“ بانو کو یوں محسوس ہوا جیسے

وہ منزل کے قریب پہنچ گئی ہو۔

”اچھی ہے۔ خوبصورت ہے۔ مگر پھر؟“ سید اماں کا سوال اپنی جگہ برقرار تھا۔

”دیکھیے نا۔ آپ کا گھر کیسا سٹونا سٹونا ہے۔“

بانو نے کھٹنا شروع کیا:

”آپ نے چار شادیاں کیں۔ اللہ کی مرضی کسی سے اولاد نہ ہوئی۔ گھر کی دیرانی سے تو

آپ مزدور الجھتے ہوں گے؟“

”کیوں نہیں۔ بہت الجھتا ہوں۔ مگر پھر؟“

”پھر یہ کہ۔“

بانو ایک لمحے کے لیے رکی۔ پھر ہمت کر کے کہا:

”پھر یہ کہ اس گھر میں عورت آجائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ گھر میں کسی نہ کسی عورت کا ہونا

بہت ضروری ہے۔ آپ چاہیں تو یہ گھر آباد ہو سکتا ہے۔“

”مگر کیسے۔ کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں؟“

سید اماں کے دل میں لڈ پھوٹنے لگی:

”کیا تم اب تک کنواری ہو؟“

"میری بات چھوڑے۔ میری شادی ہو چکی ہے۔"
بانو کھل کے بات کرنے لگی۔

"میں — میں جانتی ہوں۔ سب زربینہ اس گھر میں آجائے۔ آپ نے تو دیکھا ہے اُسے؟"
"اچھا۔ تم آج —" بات کر رہی ہو۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔ خوبصورت ہے۔ سید امام
سر ہلایا۔

"تو آپ زربینہ کو بیاہ کے لانے پر آمادہ ہیں؟" بانو نے اسے پکا کرنا چاہا۔
"میں بالکل تیار ہوں مگر تم نے زربینہ سے بھی پوچھ لیا ہے؟ سید امام کا دل خوشی کے آ
پٹیوں اچھل رہا تھا۔

"زربینہ کا میرا دم۔"

بانو نے فوراً کہا:

"مگر آپ فخر امام کی مرضی معلوم کر لیجیے۔ دیکھیے نا۔ وہ آپ کا سکا بیٹا تو ہے نہیں۔ لے پا
ہے۔ کیا پتہ وہ اس رشتے کو پسند نہ کرے۔ پوچھ لیجئے میں تو کوئی حرج نہیں۔"
فخر امام کے نام پر سید امام جیسے ہتھ سے اکھڑ گیا۔ سخت لہجے میں بولا:
"اس کی کیا مجال جو میری مرضی میں دخل دے۔ میرے ٹکڑ پر پڑا ہے۔ جب چاہوں! —
نکال باہر کروں۔ کیا پہلی شادیاں میں نے اس سے پوچھ کے کی تھیں جو آپ پوچھوں؟"
"جی —" اور بانو گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ہاں ہاں۔ اس کی کیا مجال کہ چوں بھی کر سکے۔"
سید امام بڑے جوش سے بول رہا تھا:

"میں عزت و آدمی ہوں۔ اللہ نے دولت سے مالا مال کیا ہے۔ دربار میں میری بار
ہمیشہ اونچی رہتی ہے۔ مجھے اختیار ہے میں جس سے چاہوں شادی کروں۔ زربینہ کو اطمینان
دلانا کہ گھر میرا ہے۔ فخر امام کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ میں کس سے شادی کرتا ہوں اور
کسے گھر میں بساتا ہوں۔ میں آج ہی فخر امام کو یہاں سے چٹا کر دوں گا۔ نہ رہے گا بانس
نہ بچے گی بانسری۔"

"میں جاری ہوں۔" یہ کہتی ہوئی بانو کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس کے چہرے پر
ہوٹیاں اڑ رہی تھیں۔

"ارے۔ ابھی بات تو پوری نہیں ہوئی؟"
سید امام بھی کھڑا ہو گیا:

"نکاح کب ہو گا۔ سو تو میں آج ہی قاضی کو بلا کر دہن پڑھوا لوں۔ مجھے کسی چیز کی بھی
مردت نہیں۔ ہاں یہ تو بتاتی حادثہ ہر گنا ہو گا۔ اگر زربینہ چاہے تو ہر کی رقم نقد بھی ادا
کیا جاسکتی ہے۔"

"ادب دے۔ تیرا دام تو نہیں چل گیا؟"

بانو دروازے سے نکلتے ہوئے بولی:

"چار بیویوں کو کھا چکا ہے۔ اب تک تیری نیت نہیں بھری۔ تو زربینہ کے باپ سے
بہن بڑا ہے۔"

"یہ کیا بد تمیزی ہے۔"

سید امام اس کے پیچھے دروازے پر پہنچ گیا:

"خود ہی رشتہ لانی ہو اور خود ہی ناراض ہو رہی ہو؟"

"ہاں۔ میں رشتہ لانی تھی۔"

بانو شرک پر پہنچی اور پلٹ کر کہا:

"مگر تیرے لیے نہیں۔ یہ پیغام تیرے بیٹے فخر امام کے لیے تھا بڑے۔ تو بیچ میں کہاں
سے کو دڑا؟"
بانو تو شرک پار کر کے نکل گئی۔

مگر — سید امام جس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو گئے تھے، وہ اس انکشاف
سے ایسا پریشان ہوا کہ اس کا سر چمک ایا اور وہ دھڑام سے دروازے پر گر پڑا۔ راگمروں
نے اسے اٹھا کر اندر پہنچایا۔

زربینہ نے جب بانو سے بڑے میاں کی باتیں سنیں تو ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گئی۔
فخر امام اسی شام گھر سے نکال دیا گیا۔
اس کے پاس سامان ہی کیا تھا۔ ایک قبیلے میں دو جوڑے کپڑے۔ یہی اس کی کُل کائنات
تھی اور بس!

فخر امام جب گھر سے نکل کر جا رہا تھا تو بانو نے اپنے شوہر کے ذریعے اسے اپنے گھر بلوایا

اور اسے تمام قصے سے آگاہ کر دیا۔

فخر امام کو کچھ باتیں تو منہ بولے باپ سے معلوم ہو گئی تھیں باقی باتیں اب معلوم ہوئیں۔ اسے اپنے منہ بولے باپ پر افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سید امام ایسی پست طبیعت کا مالک ہے کہ وہ دنیا کا ذلیل سے ذلیل کام کر سکتا ہے۔

پھر

اس کے دل میں سید امام کی محنت کی جگہ وطن کی محنت پیدا ہو گئی۔ سلطان کا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ سلطان سے ملاقات کے لیے مشکور جا رہا تھا۔

فخر امام نے سلطان کے حضور پیش ہو کے بڑی رقت سے عرض کیا:

اے شاہ! تجھ پر خدا کی مار پڑی ہے کہ میں یہ نہیں جانتا کہ تجھے کس ماں نے پیدا کیا اور میرا باپ کون ہے۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے بتایا گیا کہ سرنگا پٹم کے سید امام نے مجھے تنہائی کیلئے اور میں اس کی لے پاگ اور اولاد ہوں۔

میں نے سنا تھا کہ لے پاگ اولاد کی بہت قدر ہوتی ہے کیونکہ وہ اعلیٰ اولاد کا بدل ہوتی ہے لیکن سید امام نے مجھے دو وقت کی روٹی اور پرانے کپڑوں کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ یہ بات نہیں کہ وہ غریب ہے یا اس کا ناقص تنگ ہے۔ وہ سلطنت خداداد کا ایک بڑا خزانہ ہے مگر اس کی عیاشیاں حد سے بڑھی ہوئی ہیں۔ وہ گھر میں اور گھر کے باہر شراب و شباب کی محفلیں جمانا ہے اور ہمہ وقت بدکار عورتوں میں گھرا رہتا ہے۔

میں اس کی بدکاریاں اور ڈانٹ پھٹکار تو اب تک برداشت کرتا رہا مگر پچھلے سال میں نے سید امام کو ایک ہندو خسر سے گفتگو کرتے ہوئے سنا تو مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ پھر میں اس کی ٹوہ میں مل گیا۔

مجھے معلوم ہوا کہ یہ شخص ایک طرف تو سرکار سے تنخواہ لیتا ہے اور دوسری طرف ملک اور قوم سے غداری کے صلے میں اسے ہر ماہ ایک بڑی رقم حاصل ہوتی ہے۔

سید امام کا کام یہ ہے کہ دارا سلطنت میں ہونے والی سرکاری اور غیر سرکاری باتوں کی اطلاع انگریزوں کو بھیجتا رہے۔

ان لوگوں کا ایک باقاعدہ گروہ ہے جس میں لال خان بخشنی چکنور میر نظیر علی موکب داراؤ اس کا بھائی اسماعیل خان رسالدار وغیرہ شامل ہیں۔

چونکہ میں نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے اس لیے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یا تو میں بے وقوف ہوں یا بالکل پاگل ہوں۔ اسی لیے ان لوگوں نے مجھے بالکل نظر انداز کر رکھا ہے۔

مجھے یہ سب باتیں سلطان معظم کو بہت پہلے بتا دینا چاہیں تھیں لیکن میں سوچتا تھا کہ میرے پاس ان کا کوئی ثبوت نہیں۔ پھر پتہ نہیں میری باتوں کا یقین کیا جائے یا نہیں۔

اب میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ آپ مجھے جھوٹا سمجھیں یا سچا۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے عرض کر دیا۔

جس وقت فخر امام نے سلطان کے سامنے یہ بیان دیا، سلطان کے پاس صرف چند سردار موجود تھے۔ سلطان نہایت توجہ سے فخر امام کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ پھر اس نے فوراً "نظر علیٰ اسماعیل اور لال خان کو گرفتار کرنے کا حکم دیدیا۔

سلطان پیشوا کا کچھ ایسا رعب تھا کہ جب یہ لوگ گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیے گئے تو انہوں نے فوراً اقبال جرم کر لیا۔

سید امام کچھ مال منوں کر رہا تھا لیکن جب اس کے سامنے فخر امام کو لایا گیا تو اس نے بھی فوراً روم کا اقبال ہی نہیں کیا بلکہ اپنے گمراہ میں شامل پندرہ مزید لوگوں کے نام بتا دیے۔ وہ تمام افراد بھی گرفتار کر لیے گئے۔

ان سب کو موت کی سزا دے دی گئی۔

ان میں سے ایک ہا موس جس کا نام امام الدین تھا وہ کوئلار اور نندی گڑھ کے علاقہ میں تعینات تھا۔ اسے کہیں سے خبر مل گئی۔ وہ راتوں رات بھاگ نکلا اور ساگھر پہنچ کے دم لیا۔

اس مازش کے ختم ہونے پر سلطان نے فخر امام کو اپنا متبئی بناتے ہوئے کہا:

"خدا کی ذات سے ناامید نہ ہونا چاہیے فخر امام۔ خدا انسان کو آزاد پیدا کرتا ہے اور اپنے اپنی زندگی کا راستہ چننے کا پورا اختیار دیتا ہے۔ اگر تم پہلے ہی ہمت کر کے ہیں اس سازش سے آگاہ کر دیتے تو تمہیں اتنے دن تکلیف نہ اٹھانا پڑتی۔"

اس کے بعد سلطان نے فخر امام اور زرینہ کی شادی کرادی اور فخر امام کو اپنے جاسوسی کے
نکملہ میں ملازم رکھ لیا۔



پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ملیوار پر سلطان نے فروری میں حملہ کیا تھا۔ یہ حملہ اپریل ۱۷۹۰ء تک جاری رہا۔

اس میدان میں سلطان کے چھ ہزار سواروں کے سامنے راجدھرم راجہ کی ایک لاکھ فوج
جنگ کر رہی تھی۔ پھر بھی راجہ کو پسپا ہونا پڑا۔

سلطان کے ساتھ فرانسیسی سالار موسیہ لال تھا۔ اسے سلطان نے کونگور کی طرف بھیجا تاکہ
وہ انگریزوں کی اس فوج کو رد کے جو بمبئی سے مدد گت کے لیے آئی تھی۔

راجدھرم راجہ ہر جگہ شکست کھانے کے بعد جنوب میں پسپا ہو گیا۔ مئی کے آخر تک سلطان
ٹراونکور کے محاذ پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔

اس زمانہ میں انگریزوں، مرہٹوں اور نظام ادکن میں مدد فریق معاہدہ ہوا تھا جس کا مقصد
سلطان کی طاقت کو ختم کر کے اس کی سلطنت کے حصے بخرے کرنا تھا۔ سلطان نے پسپا ہوتے ہوئے
راجدھرم راجہ کا تعاقب نہ کیا اور نہ وہ اس سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

انگریزوں نے سلطان کے ٹراونکور پر حملہ کے خلاف اسے ایک خط بھیجا تھا جس میں
اس سے شکایت کی گئی تھی کہ ٹراونکور انگریزوں کا حلیف ہے اور سلطان اور انگریزوں میں بھی
جنگ نہ کرنے کا ایک معاہدہ موجود ہے اس لیے سلطان نے ٹراونکور پر حملہ کر کے اس
معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔

سلطان نے اس کے جواب میں جنرل انگلینڈ کو لکھا کہ :

ٹراونکور کے سپاہیوں کی نازیبا حرکات سے مشتعل ہو کر

سلطانی فوج نے ٹراونکور پر حملہ کیا تھا۔ اس سے اس معاہدے کو

توڑنا مقصود نہ تھا جو اس کے اور انگریزوں کے درمیان موجود ہے۔

جنرل انگلینڈ نے سلطان کے پاس تجویز بھیجی کہ سلطان اپنے دربار میں انگریز کشتروں کو

تینیات کرنے کی اجازت دے۔ سلطان نے انگریزوں کی یہ تجویز بھی منظور کر لی تھی۔

مگر دوسری طرف۔

لارڈ کارنوالس تو جنگ پر تلا بیٹھا تھا اور اب تو مدد فریق معاہدہ بھی ہو گیا تھا اس لیے اس
نے مدراس کے گورنر کو خط لکھا کہ :

"بمبئی کے ان تمام خطوط کے جواب میں اُسے لکھا جائے کہ کونگور

اور ارجے کوٹ، ولندیزیوں کے آزادانہ مقبوضات تھے۔ انہوں نے

راجہ کو جین کو کبھی خراج ادا نہیں کیا۔ انہیں یہ حق حاصل تھا کہ وہ ان

مقبوضات کو راجہ ٹراونکور یا کسی اور کو دے دے وہ مناسب سمجھیں اس کے

لکھ فر دخت کر دیتے۔

بمبئی نے ٹراونکور کی سرحد پر خود حملہ کیا ہے اور اس حملہ اور فوج کا

وہ خود سپہ سالار ہے۔ راجہ کا بیس سال سے اس پر قبضہ تھا اور اسے

تسلیم کر لیا گیا تھا۔

بمبئی کا یہ حملہ ایک مخلصانہ قدم ہے جس نے ہمارے درمیان موجود

معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔

یہ خط موصول ہونے ہی جنرل میڈوز، مدراس سے ترچناپلی کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کی
فوج ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔

جنرل میڈوز نے اپنے ترچناپلی آنے کی اطلاع سلطان کو پہلے ہی بھجوا دی تھی۔ جب وہ

ترچناپلی پہنچا تو اسے سلطان کا ایک خط ملا جس میں سلطان نے سلطنت خدا داد کی سرحد پر انگریزوں

کی فوج کے اجتماع کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا اور اس بات کی خواہش کی تھی کہ وہ اپنے ایک

معتد کو ترچناپلی بھیجنا چاہتا ہے تاکہ وہ وہاں پر اپنی صفائی پیش کرے اور غلط فہمیاں

ہو سکے۔

سلطان نے اس بات کی بھی خواہش کی تھی کہ دونوں حکومتوں کے درمیان خلوص و اعتماد

کی فضا پیدا ہوئی چاہیے۔

سلطان کے اس خط کے جواب میں جنرل میڈوز نے جو کچھ لکھا اس کے لفظ لفظ سے

غور و درتکبر شگاہ ہے۔ اس مغرور نے سلطان کو لکھا :

"آپ کا خط ملا۔ اس میں جو کچھ درج ہے میں اسے خوب سمجھتا ہوں
آپ ایک عظیم الشان حکمران ہیں۔ آپ نے اپنے قیدیوں کے ساتھ
جو سلوک روا رکھا ہے اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے تو میں سمجھتا
ہوں کہ آپ کا شمار روشن خیال فرمانرواؤں میں ہوتا ہے۔
انگریزوں کو بھی برداشت کرتے ہیں اور نہ خود دوسروں کی
توہین کرتے ہیں۔ ہماری آپ سے اسی دقت جنگ چھڑ گئی تھی جب
آپ نے ہمارے حلیف راجہ پر حملہ کیا تھا۔ خدا تعالیٰ ہمیشہ زبردست
ہی کو فتح بخلا نہیں کرتا اور نہ ہی تیز رو ہمیشہ ددڑ میں جیتے ہیں بلکہ
فتح و کامرانی کا انحصار عام طور پر عدل و انصاف پر ہوتا ہے اور اسی پر
ہمارا اعتقاد ہے۔"

جنرل میڈوز مئی ۱۸۰۱ء کے آخری ہفتے میں تہ چنپلی پہنچا تھا۔ وہ فوج کی کمان سنبھالتے ہی
سلطانی حدود میں داخل ہو گیا۔
سلطان کو جب جنرل میڈوز کے حملہ کی اطلاع ملی تو وہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھا۔
سنی منگل اور ہروڑ کے نواح میں دونوں لشکروں کا سامنا ہوا۔ ہر لشکر نے دوسرے پر بڑھ چڑھ
کے حملے کیے مگر فریقین میں سے کسی کو کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ سولہ گے اس کے کہ انگریزوں نے
پسپا ہوتے ہوئے بڑی چالاکی سے سنی منگل پر قبضہ کر لیا۔
یہ تھا میسور کی تیسری جنگ کا آغاز۔

انگریزوں نے سلطان ٹیپو کے خلاف میسور کی تیسری جنگ کا آغاز کر دیا۔
وہ اپنے اس اقدام میں کس قدر حق بجانب تھے، تاریخ اس کا جواب اس طرح دیتی ہے۔
مہرجان مالک جو کارنوالس کا بڑا مداح تھا، لکھتا ہے:
کارنوالس نے اس عہد نامے کو مضبوط کر دیا جو ۱۷۸۲ء میں
انگریزوں اور سلطان کے درمیان ہوا تھا۔ یہ معاہدہ بنگلور کے نام
سے مشہور تھا۔

اس معاہدہ کی بجائے کارنوالس نے اس معاہدہ کو مستند قرار
دیا جو ۱۷۸۸ء میں یعنی سولہ سال پہلے ہوا تھا۔ اس معاہدے میں
نظام الملک، مرہٹے، سردار اور نوابین اودھ وادکاٹ اور راجگان
تاجور اور ٹراونکور ایک دوسرے کے حلیف قرار دیے گئے تھے۔
کارنوالس، سلطان کا نام نظر انداز کرنے میں حق بجانب نہیں تھا۔
کیونکہ عہد نامہ بنگلور کے مطابق، سلطان کو انگریزوں کا حلیف مانا
گیا تھا۔

یہ تو کارنوالس کے ایک مداح کا بیان ہے۔ اب کرنل وکس کا بیان "تاریخ میسور"

میں ملاحظہ ہو:

کارنوالس جیسے سیاست دان اور انصاف پسند انسان سے یہ امید نہ تھی کہ وہ منگھوڑ کے عہد نامے کی خلاف ورزی کرے گا۔ اس وقت مدراس کا گورنر مسٹر ہالینڈ تھا۔ کارنوالس نے اسے حکم دیا کہ وہ سلطان کے خلاف جنگی تیاریاں کرے اور سلطنتِ خدا داد کے خلاف صف آرا ہو جائے۔

مسٹر ہالینڈ نے اس حکم کے جواب میں کارنوالس کو تحریر کیا کہ سلطان ٹیپو کا ہماری قوم کے خلاف جنگ کرنے یا عہد نامہ منگھوڑ کو توڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

کارنوالس نے ہالینڈ کے اس جواب سے اندازہ لگایا کہ ہالینڈ اس کے ڈھب کا آدمی نہیں ہے۔ اس لیے اس نے مسٹر ہالینڈ کو مجبور کر کے اس سے استعفیٰ لے لیا اور اس کی جگہ جنرل میڈوز کو مدراس کا گورنر مقرر کیا۔

خود سلطان ٹیپو نے بھی انگریزوں کو یقین دلایا تھا کہ وہ ان سے جنگ نہیں کرنا چاہتا اور نہ ٹراونکور پر حملہ کا اسے کوئی خیال ہے لیکن کارنوالس نے ٹراونکور کا ہانہ بنا کر جنگ شروع کر دی۔

کارنوالس کے دل میں سلطان ٹیپو کے خلاف جو بد ارادے تھے وہ اس کے اس خط سے بالکل بے نقاب ہو جاتے ہیں جو اس نے اپنے نئے گورنر مدراس، میڈوز کو لکھا تھا۔ جیسے مل کے مطابق اس خط کا مضمون اس طرح تھا:

”ہندوستان میں انگریز قوم کی عزت اور شہرت کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سلطان ٹیپو سے بزدل رہا ہوں۔ نہ صرف بزدل رہا ہوں بلکہ اس کی طاقت کو موقع پا کر ختم کر دیں ورنہ اگر اسے فرانسیسیوں کی کمک حاصل ہو گئی تو پھر ہمیں ہندوستان کو خیر باد کہنا پڑے گا۔“

اس سلسلے میں صاحبِ نشانِ حیدری لکھتے ہیں:

۱۷۹۰ء میں جب سلطان نے پورے پاٹن گھاٹ کو مسخر کر لیا

اور انگریز فوج جہازوں پر پناہ لینے پر مجبور ہو گئی۔ اس کے علاوہ ٹراونکور کے پورے علاقے پر سلطان کا قبضہ ہوتا دکھائی دینے لگا تو اس وقت دکن کے وزیر اعظم شیر الملک نے ابو قاسم عرف میر عالم کو لکھتے بھیجا کہ گورنر جنرل کو سلطان کے خلاف جنگ پر آمادہ کرے۔

کارنوالس نے سازش شروع کی اور نظام دکن کو اپنے ساتھ لایا۔ دوسری طرف اسے بھونسلہ راجہ ناگپور سے خطرہ تھا کہ وہ کہیں روڑے نہ اٹھائے اس لیے اس نے جان فاسٹر کو بھونسلے اور مرہٹوں کا ارادہ معلوم کرنے کے لیے ناگپور بھیجا۔

اس وقت مرہٹے بلاوجہ سلطان سے جنگ کرنے پر آمادہ نہ تھے اس اطلاع پر کارنوالس نے جان فاسٹر کو دوسرا خط لکھا جس میں کہا گیا کہ کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے کہ مرہٹے انگریزوں کے ساتھ مل جائیں۔

چنانچہ جان فاسٹر نے پھر کوشش کی اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اتحادِ ثلاثہ (انگریز، نظام، مرہٹے) کا ایک باقاعدہ معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ سلطان کی روز افزوں بڑھتی طاقت کو ختم کر دیا جائے اور اس کے ملک کو تینوں طاقتوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جائے۔

اس معاہدے کے ہوتے ہی جنوری ۱۷۹۱ء میں کارنوالس لکھتے سے مدراس پہنچ گیا اور ایک ہی مہینہ کے اندر اس کی فوجیں بغیر اعلانِ جنگ کے سلطنتِ خدا داد کی حدود میں داخل ہو گئیں۔

نظام علی خان ۴۰ ہزار سوار اور ۲۰ ہزار پیدل، امرا، وزرا اور اپنے دونوں بیٹوں عالی جاہ اور سکندر جاہ کے ساتھ حیدرآباد سے چل کر آئیکل میں خیمہ زن ہوا اور اپنے امیروں کو فوجیں دے کر سلطانی علاقوں پر قبضہ کے لیے روانہ کیا۔

اس جھڑپ میں کرنل فلائیڈ بھی زخمی ہوا۔ سلطان سپاہ نے ۲۰۰۔ انگریز سپاہیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان سپاہیوں کے پاس گھوڑے بھی تھے۔ اس جھڑپ کے نتیجے میں جنرل میڈوز ہاپس مدراس طلب کر لیا گیا۔

سرفریقی معاہدہ میں اگرچہ مرہٹے برابر کے فزولت تھے لیکن اس جنگ میں انہوں نے کوئی خاص مرگرمی نہ دکھائی۔ شاید ان کی افرادی قوت کم ہو گئی تھی۔ مرہٹوں کی طرف سے صرف ایک سردار پرورام بھاؤ انگریزوں کی حمایت میں سلطنت خداداد پر حملہ آور ہوا۔

مرہٹوں کی اصل کمان کیپٹن رسل کے ہاتھ میں تھی۔ وہ پندرہ ہزار مرہٹہ فوجیوں کے ساتھ دریائے کرشنا پارکر کے قلعہ دھاڑوار پر قابض ہو گیا۔

انگریز فوج پہلی مرتبہ مشرقی گھاٹ میں آئی تھی۔ اس وقت سلطان پاٹھ پجری کے علاقہ میں فرانسیسیوں کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا لیکن فرانسیسی کمانڈر نے کارنوالس کو یقین دلایا تھا کہ اس کے اور سلطان کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہے اس لیے وہ سلطان کو ملگ مہیا نہیں کرے گا۔ اس مقام پر سلطان کو اطلاع ملی کہ کارنوالس ویلور پہنچ گیا ہے۔ سلطان نے بھی ویلور کا رخ کیا مگر کارنوالس وہاں سے بنگلور کی طرف نکل گیا۔

کارنوالس کے پاس اس وقت بے تحاشہ فوج تھی۔ اس کی فوج میں پہلی بار ۲۰۰ ہاتھی بھی شامل ہوئے تھے جو اوودھ سے اسی مقصد کے لیے بلائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ کثیر تعداد میں ساز و سامان اور ۲۰ ہزار سامان لے جانے والے چھکڑے اور تل بھی اس کے پاس پہنچ گئے۔ پھر وہ اس تمام لاڈلشکر کو لے کر بنگلور پہنچا۔

انگریزوں نے اپنی ہر منزل پر دہشت گردی اور لوٹ مار کا بڑے پیمانے پر مظاہرہ کیا۔ کارنوالس نے لشکر کو حکم دیا کہ وہ خوف و دہشت پھیلانے تاکہ لوگ اس قدر ہراساں ہو جائیں کہ سلطان کی مدد نہ آئیں۔

پھر وہاں سے کارنوالس کو لار پہنچا۔ اس جگہ حیدر علی خاں کا پرانا مقبرہ تھا۔ تیسرے دن انگریز فوجیں بنگلور سے دس میل پر آ کر خیمہ زن ہوئیں۔ اس جگہ سے بالکل قریب سلطان کا لشکر موجود تھا۔ اگلے دو دنوں میں انگریز بنگلور کی تفصیل تک پہنچ گئے۔

اب قلعہ پر حملہ شروع ہوا۔ کرنل مورس اور جنرل میڈوز نے فضا میں پر سخت حملہ کیا۔ محصورین نے پوری طاقت سے

دوسری طرف کارنوالس نے اپنی انگریزی فوج کے ساتھ موگی گھاٹ اور وٹکٹ گری عبور کر کے مبارکلی، کولار اور ہوسکوٹہ میں چوکیاں قائم کیں۔ وہاں سے وہ کرشنا راچپور پہنچا جو بنگلور سے صرف ۳ میل دور تھا۔

سلطان کچھ حلف سازشوں کے زبردست جال پھیلانے لگے تھے جن میں سلطان کے تقریباً تمام بڑے بڑے امیر اور وزیر شامل تھے۔

سلطان کو دشمنوں کی پیش قدمی کی کوئی خبر نہ دی جا رہی تھی۔ اسے حملہ کی خبر اس وقت ہوئی جب انگریز فوج بنگلور پر حملہ کے لیے پرتول رہی تھی۔

کرنل فلائیڈ کی تجویز تھی کہ سواروں کو کوہنٹور میں رہنے دیا جائے اور باقی فوج کو مستی ملگ کے محاذ پر لگادیا جائے۔

لیکن ایک دوسرا انگریز انفر کیپٹن آرچی بالڈ براؤن اس تجویز کا مخالف تھا۔ اس نے دلیل دی کہ ایک ایسے قلعے کی چھار دیواری میں خود کو مقید کرنا جو صرف بارہ پونڈ کے ایک گولے سے تباہ ہو سکتی ہے یہ زیادہ بہتر ہے کہ کھلے میدان میں ٹھہرا جائے۔

چنانچہ کیپٹن کی رائے قبول کی گئی اور تمام فوج کو کھنٹور میں ٹھہری رہی۔ پھر کرنل اسٹوارٹ بھی ان سے آگلا اور جنرل میڈوز نے بنگلور پر حملہ کا منصوبہ تیار کرنا شروع کر دیا۔

سلطان انگریزوں کی پیش قدمی کی خبر سن کر سرنگاپٹم سے نکلا اور ننگی پیچ کے قیام کیا۔ اس وقت انگریز فوج بنگلور سے صرف ۳ میل دور تھی۔

سلطان نے سید حمید سپہ سالار کو قلعہ بنگلور کی حفاظت کے لیے روانہ کیا۔ شیخ انصاری، بخشی محمد خاں اور بہادر خاں قندھاری کو قلعہ داری کی خدمت سونپی۔

ابھی خیمے اچھی طرح نصب نہ ہوئے تھے اور سلطان کی سواری کو ۳ ہزار سوار اور چار ہینڈ اسدا لٹی گھرے ہوئے تھے کہ کرنل فلائیڈ نے ایک دستہ فوج کے ساتھ سلطان پر حملہ کر دیا۔

سلطان نے توپ خانے کو گولہ باری کا حکم دیا اور انگریز دستے پر اس قدر گولے برسے کہ وہ حواس باختہ ہو کر میدان چھوڑ بھاگا۔

مدافعت کی۔ ہزاروں آدمی مارے گئے۔ ان مرنے والوں میں کرنل مورس بھی تھا۔

دو ہفتہ تک انگریزی فوجیں قلعہ پر شدید گولہ باری کرتی رہیں۔ اس کے سبب شہر کی تفصیل ٹوٹ گئی۔

سلطان نے قرالدین کو حکم دیا کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ والوں کی مدد کرتا رہے لیکن جب دشمن کی گولہ باری سے قلعہ کا حصار بھی گر گیا تو سلطان نے قلعہ خالی کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت کشن راؤ قلعہ کے اندر گیا اور تمام مال و اسباب اٹھا کر دارالسلطنت مرنگا پٹم بھجوا دیا۔ صرف تھوڑی سی فوج قلعہ کے انتقام کے لیے چھوڑ دی گئی۔

کشن راؤ سلطان پٹوکا وزیر خزانہ (میر بخش) اور ایک قابل اعتماد وزیر تھا مگر اس کم بخت نے انگریزوں کو ایک خفیہ پیغام بھیجا کہ قلعہ پر قبضہ کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔

تاریخین! اس کشن راؤ کو یاد رکھیے۔ اس لیے کہ یہ ایک بڑی زبردست سازش کا مرکز تھا جس کا اوپری دل سے سلطان کے آگے پیچھے بھڑکتا تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آئے گا۔

مارچ کے آخری عشرے میں انگریزوں نے رات کے وقت قلعہ پر آخری کاری ضرب لگائی۔ خندق پار کر کے قلعہ کے دروازے پر شدید حملہ ہوا۔

یہاں سید حمید سپہ دار اور دوسرے بہادروں نے وہ جو ہر شجاعت دکھائے کہ انگریزوں کے دانت کھٹے ہو گئے۔ مگر انگریز دوسری سمت سے تفصیل پہ چڑھ گئے۔ اب دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔

قلعہ والے ایک جگہ جم کے کھڑے ہو گئے اور جب تک ان کی تمام کی لاشیں نہ لگ گئیں وہ وہیں کھڑے رہے۔

جب لاشوں کا شمار کیا گیا تو وہ ایک ہزار سے زیادہ تھیں جو صرف ایک مقام پر پائی گئی تھیں۔

محصورین کے بیوی بچوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ایک بیان کے مطابق انگریزوں نے ان کے ناموس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا۔

یہ وقت ایسا تھا بلکہ غداروں اور سازشیوں نے سلطان کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ وہ قلعہ سے صرف چند میل دور ہونے کے باوجود محصورین کی مدد نہ کر سکا۔

انگریز لشکر قلعہ پر قبضہ کے بعد ماگرٹی کے جنگل میں خیمہ زن ہو گیا تھا۔ اب انگریزوں اور سلطان میں آنکھ پھولی قسم کی جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ سے زیادہ جھڑپھاؤ تھی مگر کارنوالس کو جلد ہی محسوس ہو گیا کہ سلطان اس کے لشکر کا دم ختم کرنا چاہتا ہے تاکہ پھر پلٹ کر ایک بھر پور حملہ کرے اور انہیں عبرت ناک شکست سے دوچار کر دے۔

انگریزوں نے سلطان کو اپنے سامنے لانے کے لیے مرنگا پٹم پر حملہ کر دیا مگر اس کا جواب دہ لشکر لے کر منگلور سے شمال مشرق کی سمت روانہ ہوا۔ کارنوالس چاہتا تھا کہ وہ نظا کے لشکر سے مل جائے۔ پھر رسد حاصل کرے اور تازہ دم آنے والی فوج کو ساتھ لے لے۔

بنگلور پر انگریزی قبضہ کے سلسلے میں محمود بنگلوری کا بیان بھی قابل توجہ ہے۔ اس لیے کہ اس مؤرخ کا تعلق اسی شہر سے تھا۔ اس نے بنگلور پر انگریزی فوج کے قبضہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

دوسرے دن کرنل مورس اور جنرل میڈوز نے بنگلور پر حملہ کر دیا۔ اس معرکہ میں طرفین کے کئی ہزار آدمی کام آئے۔ کرنل مورس بھی اسی جنگ میں مارا گیا۔

انگریزی فوج دو ہفتہ تک حصار قلعہ توڑنے میں مصروف رہی۔ آخر دیوار ٹوٹ گئی اور تک حرام کشن راؤ کی سازش سے انگریزوں کو قلعہ میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔

کشن راؤ بنگلور میں سلطانی معتمد کے ہندہ پر مامور تھا اور قلعہ کے اندر کی رقی رقی خبریں انگریزوں کو پہنچاتا تھا اور انگریزان کے مطابق تدابیر کر لیا کرتے تھے۔

سید حمید سپہ دار اور قلعہ دار دروازے کے سامنے مدافعت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اور شیخ انور سپہ دار امیر ہو گیا۔ قلعہ کے تمام رہنے والے گرفتار کر لیے گئے۔ شہر لوٹا گیا اور بے شمار جواہر و زیورات انگریزوں کے ہاتھ آئے۔

یہ خبر جب سلطان کے حضور پہنچی تو میر قمر الدین اور سید صاحب نے دست بستہ ایک ساتھ عرض کیا:

سلطان معظم۔ ہمیں انگریزوں پر حملہ کرنے کی اجازت عطا فرمائی جائے تاکہ ہم سپہ دار اور قلعہ دار کے خون کا انتقام لے سکیں۔

سلطان نے جواب میں فرمایا:

جب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہو تو سپاہ کی طاقت کو منتشر کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ سلطان کو ابھی تک یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ اس شکست کی وجہ ایک گھری سازش ہے ورنہ ممکن تھا کہ سلطان اسی وقت جنگ کو رہہ چلا کر دیتا۔

سلطان نے نواح ماگڑی میں قیام کیا۔

اس کے چوتھے روز انگریزوں نے تین ہزار ہندوستانی سپاہی اور چھ سو گورے قلعہ کی حفاظت کے لیے چھوڑے اور دیون ہلی کے قریب کیمپ لگایا۔

دیون ہلی کا قلعہ دار بھی اس سازش میں شریک تھا اس لیے بغیر کسی جنگ کے قلعہ دیون ہلی انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔

انگریز یہاں سے چک بالا پور پہنچے اور اس پر قبضہ کر لیا۔

چک بالا کوٹ قدیم وقتوں میں رام سوامی گوڈھ کے پاس تھا۔ کارنوالس نے ایک لاکھ روپے کے عوض چک بالا کوٹ اس کے اولین مالک کو دے دیا۔

کارنوالس نے یہ قدم اس لیے اٹھایا تاکہ میسور کے پرانے حاکموں میں یہ خبر پھیل جائے کہ انگریز سلطان سے علاقے واپس لے لے کر ان کے داروں کے حوالے کر رہے ہیں۔

کارنوالس کے اس اقدام سے واقعی پرانے دارنہیں پر ہمت اثر ہوا۔ انہوں نے سلطان کے خلاف پورے ملک میں بغاوت کی آگ کو اور زیادہ بھڑکانا شروع کر دیا۔

سلطان انگریزوں کے تعاقب میں بالا پور کی طرف روانہ ہوا۔ بالا پور کے لوگوں کو مازنیوں نے پہلے ہی بھڑکا دیا تھا۔ چنانچہ جب سلطان کا ہراول دستہ بالا پور کے قریب پہنچا تو وہاں کے باشندوں نے سلطان کو بھڑانے کے لیے کتوں کی طرح بھونکنا شروع کر دیا اور بعض

لوگوں نے جنگلی بگل بجانا شروع کر دیے۔

سلطان کو ان لوگوں کے اس ناشائستہ رویے پر سخت غصہ آیا اور اس نے لشکر کو حملہ کا حکم دے دیا۔

اس لڑائی میں دو ہزار آدمی مارے گئے اور ۳۰۰ پیادوں کو گرفتار کر کے سلطان کے

سامنے پیش کیا گیا۔ سلطان نے لوگوں کو عبرت دلانے کے لیے ان سب کے ہاتھ پیر کاٹنے کا فرمان جاری کر دیا۔

سلطان اب تک کشن راؤ کی غداری سے بے خبر تھا اس لیے اس نے کشن راؤ کو مرنگا پٹم کے انتظام کے لیے بھیج دیا اور خود بالا پور کی فوج کے بعد سنگڑ سے ہوتا ہوا ویکٹ گری کوٹ کے مقام پر پہنچا اور انگریز لشکر کے سامنے خیمہ زن ہوا۔

صبح کو سلطان حملہ کی تیاری کر رہا تھا کہ مرنگا پٹم سے ایک تیز رفتار قاصد اس کے پاس پہنچا اور سلطان کی والدہ ماجدہ کا ایک خط ان کے حوالے کیا۔ اس خط میں ایک نئی سازش کا انکشاف کیا گیا تھا۔

اس مختصر مگر اہم خط میں درج تھا:

کشن راؤ نے کھانڈے راؤ مردود کی طرح فتنہ اور بغاوت کا جال بچھایا ہے اور بھٹی سے ایک لشکر کثیر آنے والا ہے۔ قلعہ کے اندر ہم سب موت کے منہ میں بیٹھے ہیں۔ تم سب سے پہلے دارالسلطنت کی خبر لو ورنہ پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔

سلطان نے خط کے مندرجات سے آگاہ ہونے کے بعد انگریزوں پر حملہ کرنے کا منصوبہ معطل کر دیا اور اسی روز سید صاحب کو ایک لشکر کثیر کے ساتھ دارالسلطنت کے انتظام اور کشن راؤ کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے مرنگا پٹم روانہ کر دیا۔

اگر سلطنت خدا داد کے خلاف ہونے والی سازشوں کو شمار کیا جائے تو نمبر کے اعتبار سے یہ آٹھویں یا نویں سازش ہوتی ہے۔

اس سازش میں بھی ہندوؤں کے علاوہ راج محل کی رانیوں، خصوصاً رانی لکشا کا پورا ہاتھ تھا۔ مگر ان کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا۔

اس سازش کی تفصیل پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام سازشوں میں ایک ہی منصوبہ بنایا جاتا رہا تھا کہ مرنگا پٹم میں موجود مسلمان افسروں کو قتل کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا جائے۔ ان سازشوں میں ایک بات کی اور یکساںیت پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ ہر منصوبے کو کسی نہ کسی

امینداروں یعنی پالیگا روں کو ان کی خود مری کی وجہ سے سلطان نے معزول کر دیا تھا۔ ہر سازش کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ سرنگا پٹم پر قبضہ کر کے راجہ اوڈیہ کی حاکمیت بحال کی جائے اور میسور پہلے کی طرح پھر ایک ہندو ریاست بن جائے۔ سرنگا پٹم دارالسلطنت تھا۔ سلطان اور اس کا پورا شاہی خاندان یہیں رہتا تھا۔ سرنگا پٹم کی حفاظت کے لیے قلعہ کو مضبوط کیا گیا تھا اور قلعہ دار اور سپہ سالار عام طور پر مسلمان مقرر کیے جاتے تھے۔ سپہ دار یعنی قلعہ کے دروازوں کے محافظوں کا سردار بھی عام طور پر مسلمان ہی ہوتا تھا۔

کشن راؤ جب تک معتمد سلطانی رہا اسے سلطان کے ساتھ ساتھ رہنا پڑتا تھا اور وہ سوائے سلطان کے دشمنوں یعنی انگریزوں کو خبریں پہنچانے کے اور کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ دشمن کو خبریں بھیجنا بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا اور اس بنا پر انگریز اپنے لشکر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے وقت احتیاط برتتے اور ان راستوں کو استعمال نہ کرتے جن کے بارے میں ان کو اطلاع دی جاتی کہ ادھر سلطانی فوجیں گھات لگائے بیٹھی ہیں۔

مگر اب —

جبکہ کشن راؤ سرنگا پٹم پہنچ چکا تھا اور اسے دارالسلطنت کی دیکھ بھال کا کام سونپا گیا تھا تو اس کے اختیارات میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ پس اس نے سرنگا پٹم پہنچنے ہی اپنے مذموم ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کشن راؤ اگرچہ قلعہ دار نہ تھا لیکن اب اس کے اختیارات گورنر جیسے تھے اور وہ شہر اور قلعہ کے تمام سول محکموں کا ممبر تھا۔

کشن راؤ نے اپنا دفتر اپنے محل ہی میں بنایا تھا۔ یہ دراصل ایک پرانی حویلی تھی جسے اس نے معتمد سلطانی ہونے کے بعد ایک محل میں تبدیل کر دیا تھا۔

اب اس کے اختیارات لا محدود تھے۔ سرنگا پٹم کے تمام مسلمان افسر ایک طرح سے اس کے ماتحت تھے اور اس کی کسی صورت مخالفت لینے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ اگر کشن راؤ نے کسی کی شکایت سلطان تک پہنچا دی تو اس کی ملازمت فی الفور ختم ہو سکتی ہے۔

کشن راؤ ایک عیاش طبع اور شرابی افسر تھا۔ عیاش طبع اس لیے کہ سرنگا پٹم کی سرزمین پر

عورت نے افشا کیا تھا۔ اس سازش کا انکشاف بظاہر سلطان کی والدہ کی طرف سے ہوا لیکن انہیں اس سازش کی خبر بخشناور نامی ایک کینز زادی نے دی تھی۔ تمام تواریخ میں بخناور نامی کینز کی زادی کا ذکر موجود ہے اس لیے اس کے نام میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بخناور کے گرد جو کہانیاں بھنی گئی ہیں ان میں کچھ سناہ اختلاف ہے مگر یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ بخناور نے جان پر کھیل کے جو قدم اٹھایا اس کے پس منظر میں بھی عشق خانہ خراب کی سرشاریاں موجود تھیں۔

کشن راؤ معتمد سلطانی کی بغاوت اور بغت اور کی دلیری یہ کہانی اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب سلطان نے قلعہ سنگپور کے قبضہ کے دوران اپنے معتمد اور وفادار وزیر کشن راؤ کو سرنگا پٹم کے انتظام کے لیے دارالسلطنت بھیجا تو کشن راؤ کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ کشن راؤ ان سازشوں میں شامل تھا جنہیں انگریزوں نے لاپچھے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ یہ تمام لوگ بظاہر سلطان کے بہرہ ور اور وفادار تھے مگر دراصل انگریزوں کو تمام خبریں پہنچاتے اور درپردہ ان کے لیے رسد وغیرہ کا انتظام کیا کرتے تھے۔

کشن راؤ جسے کشن راؤ بھی لکھا گیا ہے، کے گروہ میں سوامی گورڈ، وینکٹ ناٹر، جوگی پنڈت ناٹ صوبے دار اراکٹ، ہرین ہلی اور رائے درگ کے پالنگار پیش پیش تھے۔ انگریزوں نے بالا پور خورد فوج کے ایک لاکھ سالانہ کے عوض رام سوامی گورڈ کے حوالے کر دیا تھا کہ یہ شخص اس علاقے کے اولین وارثوں میں سے تھا۔

یہ علاقہ حاصل ہونے ہی اس نے اپنے خرچ پرہ اور اپنے آدمیوں کے ذریعے سلطان کے خلاف دوردوز دیک بغاوت کا زہر پھیلا نا شروع کر دیا۔

جوگی پنڈت ریاست میسور کے تمام مندروں کے بڑے پنڈتوں کا نمائندہ تھا۔ یہ پنڈت رائی کشما کے اشارے پر میسور کو مسلمانوں سے واپس لے کر دہاں پرانی ہندو ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جوگی پنڈت مذہب کی آڑ میں سلطان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا تھا۔ وینکٹ ناٹر، ناٹ تویم کا ایک بڑا سردار تھا اور ناٹوں کی حکومت بنانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

ہرین ہلی اور رائے درگ کے علاقے چھوٹی چھوٹی زمینداروں پر مشتمل تھے اور ان کے

ایک ہندو ریاست قائم ہونے کی وجہ سے دہلی عہد قدیم ہی سے عیاشی کا دور دورہ رہا تھا۔ ہندو بیڈت اور پروہت، مذہب کی آڑ میں بکشتو عورتوں کے ساتھ، مندروں کی اندھیری کو ٹھٹھیلے کو اپنی عیاشیوں سے روشنی اور رونق بخنتے تھے۔ شراب ان کے مذہب میں عام تھی۔ اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی حیدر علی خاں یا سلطان ٹیپو نے ہندوؤں کے لیے شراب نوشی کو منع قرار نہیں دیا تھا۔

شراب کو اتم الجھاٹ کہا گیا ہے یعنی شراب تمام برائیوں کی ماں ہے۔
کشن راڈ کی بیوی اگرچہ کم عمر اور بہت زیادہ حسین اور وفادار تھی لیکن جسے عیش و عشرت کا چمک بڑ گیا ہو وہ فرشتہ صفت بیوی کی کب پروا کرتا ہے۔
کشن راڈ کو کشتش کرتا تھا کہ اس کی سیاہ کاریوں پر پردہ پڑا رہے اس لیے وہ کسی نور کو گھرنے بلاتا تھا لیکن جب اس کے یہاں دوستوں کی دعوت ہوتی اور اس میں سرنگا پٹم اور دوسرے مقامات کے بڑے بڑے ہندو امرا مدعو ہوتے تو اسے ان کی خاطر داری کے لیے شراب و شہاب کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

کشن راڈ کی شادی کو چار سال گزر چکے تھے مگر ابھی تک وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے امید ہو چلی تھی کہ شاید وہ باپ بن جائے۔
یوں تو آئے دن اس کی بیوی کو دیکھنے ایک نہ ایک دائی آیا ہی کرتی تھی لیکن اس کے خاندان والوں نے اسے مجبور کیا تھا کہ مادر ملکہ یعنی سلطان کی والدہ محترمہ سے درخواست کرے کہ وہ شاہی دائی کو اجازت دیں کہ وہ کشن راڈ کی بیوی کو دیکھنے آئے۔

چنانچہ کشن راڈ نے ایک دن مادر ملکہ کے حضور پیش ہو کر عرض کیا:
"عالی مقام مادر ملکہ! میں اپنی اور اپنی بیوی کی طرف سے درخواست کرتا ہوں کہ بختاوردی ماں کو ایک بار میری بیوی کو دیکھنے کی اجازت دی جائے!"

شاہی دائی کا اصل نام گلاب تھا لیکن وہ پورے سرنگا پٹم میں بختاوردی ماں کے نام سے مشہور تھی۔ بختاوردی، گلاب کی اکلوتی بیٹی تھی اور ماں کے ساتھ امیروں اور وزیروں کے عیلات اور حلیوں میں بچہ کی پیدائش کے وقت جایا کرتی تھی۔

مادر ملکہ کو معلوم تھا کہ کشن راڈ کی بیوی ان دنوں امید سے ہے۔ کشن راڈ نے اپنی بیوی کو دارالسلطنت کی ہر دائی کو دکھایا تھا اور سب نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ واقعی باپ

بننے والا ہے لیکن کشن راڈ کو کسی طرح یقین ہی نہ آ رہا تھا اور آخر خاندان والوں کے کہنے سے آج وہ بختاوردی ماں کو لینے آیا تھا۔

اُسے یقین تھا کہ اگر گلاب نے بھی وہی کہا جو سب دائیاں کہہ رہی ہیں تو پھر اس بات میں واقعی کوئی شک نہیں ہے کہ وہ باپ بننے والا ہے۔

بختاوردی ماں ایک نہایت پختہ کار دائی تھی۔ خاندانی دائی ہونے کی وجہ سے اس کا نور باہر عمل اور بڑی حویلی میں جانے کا اتفاق ہونا تھا اور تمام بیگمات اسے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ ہندو رائیاں بھی ایسے موقعوں پر اسی کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔

مادر ملکہ، بختاوردی ماں کو مسلمان امیروں کے گھر تو بھیج دیا کرتی تھیں مگر راج محل یا دوسرے ہندو افسروں کے گھروں میں بھیجنے پر وہ ناک بھونچ رہتی تھیں۔

کشن راڈ بھی ہندو تھا مگر اس کی حیثیت مستند سلائی کی تھی اور اب وہ سرنگا پٹم کا گورنر ہو کر آیا تھا۔

مادر ملکہ انکار نہ کر سکیں۔ انہوں نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:
"کشن راڈ! گھر آئیں۔ ہمیں معلوم ہے سلطان ٹیپو تمہارا کس قدر خیال رکھتا ہے۔ تمہیں جب ضرورت پڑے بختاوردی ماں کو بلو لینا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

مادر ہریان! "کشن راڈ نے جلدی سے کہا:

"میں تو شاہی دائی کو لینے آیا تھا۔ میری بیوی کو اس وقت اس کی ضرورت ہے۔ آپ اجازت مرحمت فرمائیے۔ عین نوازش ہوگی۔"

مادر ملکہ کو کشن راڈ کا بختاوردی ماں کو دائی "کنا کچھ ناگوار گزرا۔ انہوں نے تنبیہ کے لہجے میں کہا:

"کشن راڈ! ہم بختاوردی ماں کو تمہارے ساتھ بھیج رہے ہیں لیکن خیال رہے کہ تم اسے بختاوردی ماں ہی کہنا۔ دائی مت کہنا۔ شاید اسے برا لگے۔"

کشن راڈ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بولا:
"مادر ملکہ۔ مجھے اپنی غلطی پر افسوس ہے۔ اب ایسی غلطی ہرگز نہ ہوگی۔"

”میں بھی جاؤں گی ماں!“ بختاؤر نے اچانک دخل دیا۔

”چپ ہو جا بختاؤر۔“ ماں نے اسے ہلکے سے ڈانٹا:

”بیچ میں نہیں بولا کرتے۔“

”ڈانٹ کیوں رہی ہوں۔ میں نے کوئی بُری بات کی ہے۔“

اور — بختاؤر نے منہ پھلایا۔

مادر ملکہ نے کشن راؤ سے دریافت کیا:

”تم سواری لے کے آئے ہو کیا؟“

”جی مادر ملکہ۔“ کشن راؤ نے جواب دیا:

”سواری میرے ساتھ ہے۔“

”بختاؤر کی ماں۔ تم ان کے ساتھ اسی وقت چلی جاؤ۔“ مادر ملکہ نے حکم دیا۔

بختاؤر کی ماں اٹھ کر کھڑی ہو گئی:

”جو حکم مادر ملکہ!“

بختاؤر نے پھر منہ کی:

”میں بھی ساتھ چلوں گی ماں۔“

”لبیتی جاؤ اسے بھی۔“ مادر ملکہ نے سفارش کر دی۔

اس طرح بختاؤر اور اس کی ماں کا کشن راؤ کی حویلی میں جانا آنا ہوا۔

بختاؤر روز ماں کے ساتھ کشن راؤ کے ہاں جاتی اور اپنی میٹھی میٹھی معصوم باتوں سے

کشن راؤ کی بیوی کا دل ہلاتی۔

کشن راؤ کی بیوی بختاؤر سے اس قدر مانوس ہو گئی کہ وہ بغیر کام کے بھی اسے اپنے پاس بلائے رکھتی تھی۔

یہ وہی ایام تھے جب سلطان کے خلاف کشن راؤ ایک زبردست سازش کرنے

میں لگا ہوا تھا۔

سرنگا پٹم میں وہ گورنر تھا اور گورنر پورے علاقہ کا مالک ہوتا تھا۔ چنانچہ اب اس کی

حویلی میں بانیوں، غلاموں اور سازشچیوں کے روز اجلاس ہوتے تھے جن میں سرنگا پٹم سے

باہر کے لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔

مادر ملکہ نے کینز بیچ کے بختاؤر کی ماں کو بلوایا۔

”کشن راؤ۔ تم تو جنگ کے علاقے سے آئے ہو۔“

مادر ملکہ نے اس دوران اس سے پوچھا:

”وہاں کا کچھ حال سناؤ۔ سنا ہے کہ بدلیسی قوم بڑی مکار ہے۔ وہ ہمارے سپاہیوں کے

جھگڑوں سے فائدہ اٹھاتی ہے۔“

”مادر ملکہ!“

کشن راؤ بڑے پرجوش لہجے میں بولا:

”سلطان معظم کے اقتدار کی قسم۔ انگریز قوم ذاتی بہت دھوکے باز ہے مگر سلطان اس

کی ایک نہیں چلنے دیتے اور سلطان لشکر کا تو کوئی مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔“

”ہوں۔ ہوں۔“

ضعیف العمر مادر ملکہ نے سر ہلایا:

”خدا سلطان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“

اسی وقت بختاؤر کی ماں آگئی۔ اس کے آگے آگے بارہ تیرہ سال کی ایک چھوٹری اچھلتی

کودتی چلی آ رہی تھی۔

”سلام بڑی ملکہ!“ بختاؤر نے قریب پہنچ کے ماں سے پہلے مادر ملکہ کو سلام

کیا۔ بختاؤر کی ماں، مادر ملکہ کو سلام کر کے خاموش کھڑی ہو گئی۔

”بختاؤر کی ماں!“

مادر ملکہ نے متین لہجے میں کہا:

”یہ ہیں کشن راؤ۔ سلطان نے انہیں سرنگا پٹم کا گورنر بنا کے بھیجا ہے۔ تمہیں ان کی

بیوی کو دیکھنا ہے۔“

پھر وہ ذرا رک کے بولیں:

”یہ خیال رکھنا کہ کشن راؤ کو باپ بننے کی بہت آرزو ہے۔ شادی کو برسوں ہو گئے ہیں

مگر اب تک اولاد کو ترس رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے مادر ملکہ۔ میں سمجھ گئی!“ بختاؤر کی ماں نے ملکہ مادر کی بات کے جواب میں

ادب سے کہا۔

کشن راڈ کی بیوی بہت نیک اور شریف عورت تھی۔ اسے شوہر سے بھی بہت محبت تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ سلطان اور شاہی خاندان کو بھی دعائیں دیتی تھی کہ اس کے شوہر کو ہونے کے باوجود گورنر جیسا اہم عہدہ دیا گیا تھا۔

اسے کوئی کام کاج تو تھا نہیں۔ طبیعت بھاری رہنے کی وجہ سے وہ بہت کم اپنے کام سے باہر نکلتی تھی۔ پھر ایک دن اس نے محسوس کیا کہ سوبلی میں باہر کے لوگوں کا آنا جانا ہی شروع ہو گیا ہے۔ اب تو رات کو بھی لوگ آنے جانے لگے تھے۔

عورتوں کی فطرت ہوتی ہے کہ اگر انہیں کسی بات پر شبہ ہو جائے تو وہ اس کا ٹوہ نگ جاتی ہیں۔ اور جب تک حقیقت معلوم نہ کر لیں انہیں چین نہیں آتا۔ یہی حال کشن کی بیوی کا ہوا۔

وہ اپنی جگہ سخت پریشان تھی کہ آخر سوبلی میں لوگ رات رات بھر کیوں ٹھہرے ہیں۔ بعض لوگوں کو تو کشن راڈ نے مستقل طور پر ہی ٹھہرایا تھا۔

پھر یہ راز اس پر جلد ہی کھل گیا! ایک شب وہ کچھ بے چین تھی اور اسے نیند نہ آرہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے میں گئی۔ سوبلی کی بیٹھک صحن کے دوسری طرف تھی۔ پھر بھی دکان بیٹھے بائیں کرنے والوں کی اس تک آ رہی تھیں۔

آخر تجسس اور شک، کشن راڈ کی بیوی کو کشاں کشاں مہمان خانے کے برابر دے لے گیا۔

اس کمرے میں بیٹھ کے وہ مہمان خانے میں ہونے والی گفتگو اچھی طرح سن سکتی تھی۔ اس نے چند ہی باتیں سنی تھیں کہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی:

”مائے رام! یہ کیا؟ کشن راڈ اپنے سلطان کے خلاف باتیں کر رہا ہے۔“

یہ خیال اس کے دماغ میں پیدا ہوا اور جم کے رہ گیا۔

اب وہ کھڑکی سے لگ کے کھڑی ہو گئی اور صبح تک کشن راڈ اور اس کے ساتھیوں کو بات غور سے سنتی رہی۔

پھر جب وہ اپنے کمرے میں واپس آئی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا شوہر ایک نیک حرام اور غدار آدمی ہے۔ سلطان نے اسے سب کچھ دے رکھا ہے۔ وہ پھر

مہمان کا تختہ الٹنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔

اب تو کشن راڈ کی بیوی رات ہوتے ہی مہمان خانے کے برابر والے کمرے میں چھپ کے پڑ جاتی اور غداروں، باغیوں اور احسان فراموشوں کی باتیں اور منصوبے سنتی رہتی۔

آخر اسے اس سازش میں شریک تفریباً تمام لوگوں کے نام معلوم ہو گئے۔ ان لوگوں میں رنگا بیٹم کے علاوہ باہر کے افراد زیادہ تھے۔

کشن راڈ کی بیوی تمام حالات سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ ایک عجب وطن عورت تھی لیکن ہر طرف اس کا جیون ساتھی تھا جس سے وہ بے پناہ محبت کرتی تھی۔

اس کے دل میں یہ کش مکش کئی دن جاری رہی جس کے نتیجے میں اس کی طبیعت سخت اب ہو گئی اور وہ کئی دن بے ہوش پڑی رہی۔

اپنی بیماری اور بے ہوشی کے عالم میں کشن راڈ کی بیوی نے یہ محسوس کیا کہ اس کا شوہر مرنے کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہو گیا ہے بلکہ وہ اب انسان سے شیطاں بن چکا ہے۔ اگر اس کی نگاہیں جلد نہ کھینچی گئیں تو شاہی محلات اور ان کے مکین جل کر راکھ ہو جائیں گے۔

پس جس طرح اس کا شوہر اپنے آقا کی وفاداری سے باغی ہو گیا تھا بالکل اسی طرح کشن راڈ کی بیوی اپنے شوہر سے باغی ہو گئی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سلطان کے خلاف اس سازش کو ناکام بنائے گی خواہ اس کے لیے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

ایک دن جب بختا در اس کے پاس آئی تو کشن راڈ کی بیوی نے باتوں باتوں میں اسے پوچھا:

”کیوں بختا در تو اپنی ماں کو کتنا چاہتی ہے؟“

”بہت چاہتی ہوں۔ سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔“ بختا در نے پٹ سے جواب دیا۔

کشن راڈ کی بیوی نے دوسرا سوال کیا:

”اچھا اب یہ بتا کہ تو اپنی ماں کو کتنا چاہتی ہے؟“

”ماکن یعنی مادر ملکہ کو پوچھ رہی ہیں آپ؟“

”ہاں ہاں۔ وہی تو تیری ماکن ہیں۔“

”انہیں بھی بہت چاہتی ہوں۔“

”کیوں چاہتی ہو آخر؟“

”وہ تو مادر ملکہ ہیں۔“

”بختاور کے لیے میں ادب آگیا۔“

”سب کی ماں ہیں۔ عمل والوں کی بھی امداد ملے سے باہر والوں کی بھی۔“

”اور سلطان کو تو کتنا چاہتی ہے؟“

”انہیں تو سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔“

”بختاور کے چہرے پر قوس و قزح بکھر گئی۔“

”وہ تو پوری دنیا کے مالک ہیں۔ بس خدا ان سے بڑا ہے اور سب ان سے چھوٹے۔“

”ہیں بی بی!“

”اچھا یہ بتا۔“ اس نے ذرا سنبھل کے کہا:

”اگر کوئی سلطان کو مارنے کی کوشش کرے تو تو کیا کرے گی؟“

”میں — میں — میں اس کی دانتوں سے بوٹیاں نیچ لوں گی۔“

”بختاور لال بھبھو کا ہو گئی۔“

”کس کی مجال ہے جو سلطان بہادر کو مارنے کی کوشش کرے۔“

”کشن راؤ کی بیوی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خود سے کہا:

”یہ معصوم بچی سلطان کو کس قدر چاہتی ہے۔ سلطان نے کچھ نہیں دیا اسے۔ پھر

یہ سلطان کو چاہتی ہے۔ اس لیے چاہتی ہے کہ سلطان، سلطان ہے۔ سب کا سلطان

ہمارا سلطان۔ اس کا سلطان مگر — مگر ایک وہ ہے کہ سلطان نے اسے سب کچھ دیا

وہ پھر بھی سلطان کو ختم کرنا چاہتا ہے۔“

بختاور بڑی خاموشی مگر بہت غور سے کشن راؤ کی بیوی کی خود کلامی سن رہی تھی۔

اس نے کہا کہ ”وہ پھر بھی سلطان کو ختم کرنا چاہتا ہے۔“ تو وہ خاموش نہ رہ سکی۔

زور سے چیخ پڑی:

”کون — کون سلطان کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ مجھے بتاؤ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے

کر ڈالوں گی — کون ہے وہ۔ بتاؤ تو مجھے۔“

”بختاور۔“

کشن راؤ کی بیوی بڑی افسردگی سے بولی:

”یہ بات میں تجھے کبھی نہ بتاتی مگر کیا کروں، تجھے بتائے بغیر اور کوئی چارہ نہیں۔“

اس وقت مادر ملکہ اور شاہی عجلات کے تمام لوگ بڑے خطرے میں ہیں۔ ان سب کو ختم کر

دینے کا منصوبہ بنا یا گیا ہے۔ اگر ان غداروں کو نہیں روکا گیا تو پورا سرنگا پٹم آگ میں

بھسم ہو جائے گا۔“

کشن راؤ کی بیوی نے رک کر بختاور کو دیکھا۔

بختاور منہ کھولے حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں پوری بات تو نہ

آئی تھی لیکن جتنا سمجھی تھی اس نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔

”تیری سمجھ میں کچھ آیا بختاور؟“

کشن راؤ کی بیوی نے اس سے پوچھا:

”میں نے کیا کہا ہے ابھی؟“

”مردارنی!“

بختاور نے سر جھکتے ہوئے کہا:

”کچھ کچھ سمجھ میں آیا ہے میرے۔ مگر یہ سب کون کر رہا ہے۔ آپ اپنے آدمی (میاں)

سے کہہ کر اسے پکڑوا کیوں نہیں دیتیں؟“

کشن راؤ کی بیوی نے پھر ایک گہری سانس لی:

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو بختاور — ہمارے سلطان نے کشن راؤ کو سرنگا پٹم کا گورنر بنا کر

اسی لیے بھیجا تھا کہ یہاں اگر کچھ گڑبڑ ہو تو کشن راؤ گڑبڑ کرنے والوں کو پکڑے اور

ان کو سزا دے۔“

”پھر آپ کہتی کیوں نہیں ان سے؟“

بختاور نے اپنی عقل کے مطابق بات کی:

”لوگ پکڑے جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

کشن راؤ کی بیوی نے دو درخلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا:
”تم ٹھیک کہہ رہی ہو بخت اور اب مجھے کہنا ہی پڑے گا۔ مگر کس سے کہوں؟“
کشن راؤ سے؟

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی:
”میری بھولی بخت اور۔ میں کشن راؤ سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کشن راؤ۔ میرا شوہر
یعنی سرنگا پٹم کا گورنر۔ وہ۔ وہ سلطان سے باغی ہو گیا ہے۔ اس نے غداری پر کمر
باندھ لی ہے۔ کشن راؤ ہی تو سب کچھ کر رہا ہے۔
رات رات بھر میرے گھر میں منسوبے بنائے جاتے ہیں۔ کشن راؤ، سلطان کو تباہ
کر کے سرنگا پٹم کا وزیر اعظم بننا چاہتا ہے۔ وہ انگریزوں سے مل گیا ہے۔ وہ نمک حرام
ہو گیا ہے۔“

اور۔

کشن راؤ کی بیوی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی!
بخت اور گھرائی۔ اس کی ننھی سی سمجھ میں یہ تو آ گیا تھا کہ گورنر کشن راؤ، سلطان سے
غداری کر رہا ہے مگر اب اس کی سمجھ میں یہ نہ آ رہا تھا کہ وہ کشن راؤ کی بیوی کی اس حالت کو
کدہ سنبھالے؟
کشن راؤ کی بیوی اس طرح رو رہی تھی جیسے اس کا کوئی رشتہ دار مر گیا ہو۔ چنانچہ بخت
چپ بیٹھی اُسے روتے ہوئے دیکھتی رہی۔

اچھی طرح آسٹو بہا لینے سے کشن راؤ کی بیوی کا دل کچھ ہلکا ہوا۔ تب اس نے بخت اور کو
اپنے اعتماد میں لیا اور اُسے اچھی طرح سمجھا بچھا کہ مادر ملکہ کے پاس ایک خاص پیغام دے
مگر بھیجا۔

اس پیغام کے نتیجے میں پہلا کام یہ ہوا کہ ایک گھنٹہ بعد مادر ملکہ کی خاص سواری کشن راؤ
کی حویلی پر آ کے رکی۔

سواری میں سے مادر ملکہ کی خاص کینزائری اور اندر پہنچ کے اس نے کشن راؤ سے
گفتگو کی جس کے نتیجے میں کشن راؤ نے اپنی بیوی کو شہی سواری میں بٹھا کے مادر ملکہ
کے پاس بھیج دیا۔

سلطان نے ٹیپو کشن راؤ کی غداری سے بے خبر تھا۔ وہ کشن راؤ کو دارالسلطنت
کے انتظام کے لیے بھیج کے ہالا لپٹا ہوتا ہوا سلطنت پہنچا۔ پھر وہاں انگریزوں سے مقابلے
کے لیے وینکٹ گری کوٹ کے مقام پر ڈیرے لگا دیے۔ انگریزی فوج اس کے مقابل
ٹھہری ہوئی تھی۔
صبح کو انگریزوں پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ سلطان کے پاس دارالسلطنت سے
ایک تیز رفتار قاصد پہنچا۔ اس نے سلطان کو مادر ملکہ کی طرف سے لکھا ہوا ایک خط پیش کیا
جس میں درج تھا:

کشن راؤ نے کھانڈ سے راؤ مردود کی طرح بغاوت کا جال
پھیلایا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بمبئی سے انگریزی فوج کثیر
سرنگا پٹم آ رہی ہے۔

ہم لوگ موت کے منہ میں بیٹھے ہیں۔ تم سب سے پہلے دارالسلطنت
کی خبر لو۔ ورنہ پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔
سلطان خط پڑھ کر سناٹے میں آ گیا۔

وہ کشن راؤ کی غداری کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اس نے اسی وقت سید صاحب
کے زیرِ کمان ایک لشکر کثیر سرنگا پٹم روانہ کر دیا۔

سلطان نے سید صاحب کو تاکید کی:
 "خبردار۔ راستے میں ذرا بھی دیر نہ ہو۔ کشن راؤ کو بے جبری میں جا پکڑو اور تمام
 خد اردن کو کیفر کر داریک پہنچاؤ۔"
 سید صاحب کو سرنگا پٹم روانہ کرنے کے بعد سلطان نے میر قمر الدین کو سپہ سالار
 مقرر کیا اور انہیں حکم دیا کہ:
 "آپ انگریزوں پر حملہ کریں۔"

پھر یہ وہ خود بھی تھوڑی سی فوج ساتھ لے کر دارالسلطنت سرنگا پٹم کی طرف روانہ
 ہو گیا۔
 میر قمر الدین نے فوراً اپنے لشکر کو حیدر آبادی لباس پہننے کا حکم دیا تاکہ اس کی شناخت
 نہ ہو سکے۔

سب کو معلوم تھا کہ سلطان سے لڑنے کے لیے حیدر آبادی لشکر بھی میسور میں داخل ہو
 چکا ہے اس لیے اس لشکر پر کسی کو شبہ نہ ہوا اور قمر الدین بیت منگل اور مالور کے راستے
 بنگلور کی طرف روانہ ہوا۔

راستے میں سامانِ رسد کا ایک بڑا کارواں دکھائی دیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا
 کہ یہ سامان انگریز لشکر کے لیے جارہا ہے۔

قمر الدین نے تھوڑی سوچ بچار کے بعد قافلے پر حملہ کر کے تمام سامان پر قبضہ کر لیا۔
 اس لوٹ میں پانچ ہزار بیل قمر الدین کے ہاتھ لگے اور ۲۰ آدمی گرفتار کیے گئے قمر الدین اسی
 طرح لوٹ مار کرتا ہوا بنگلور کی طرف چلتا گیا۔

اس قافلے کے علاوہ اور کچھ قافلے بھی اسے راستے میں ملے جو انگریزوں کے لیے
 رسد لے کر جارہے تھے۔ قمر الدین نے ان سب پر قبضہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز
 لشکر کو رسد ملنا بند ہو گئی اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ شاید نواب حیدر آباد ان سے
 اسلحہ ہو کر سلطان سے مل گیا ہے چنانچہ شکریوں نے باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا۔

دوسری طرف سید صاحب ماٹھری کے جنگل اور اتری واگ کے راستے بھاگ بھاگ معر لشکر

کے سرنگا پٹم پہنچے۔
 اس وقت نصف شب گزر چکی تھی۔ انہوں نے کچھ وقت دریا کے کنارے گزارا۔ پھر صبح
 سے کچھ پہلے ۵۰۰ جاں نثاروں اور اپنے خاص آدمیوں کو لے کر قلعہ کی طرف روانہ ہوئے اور
 لشکر کو تیار رہنے کا حکم دیتے گئے۔

قلعہ کا دروازہ اس وقت بند تھا۔ سید صاحب نے دروازہ کھولنے کے لیے دربان کو
 آواز دی۔ دروازے پر رسالدار اسد خاں متعین تھا۔ اس نے فوراً دروازہ کھلوا دیا۔

سید صاحب نے قلعہ کے اندر داخل ہوتے ہی اپنے آدمیوں کو خاص خاص مقامات پر
 پرے پر لگا دیا۔ پھر سیدھہ مادرملکہ کے محل پر پہنچے۔

مادرملکہ کو پریشانی کی وجہ سے نیند نہ آتی تھی۔ وہ اس وقت بھی جاگ رہی تھیں۔ سید صاحب
 کی اطلاع پا کر گھبرائی ہوئی آئیں اور آستے ہی پہلا سوال کیا:

"سلطان خیریت سے ہے نا؟"

"الحمد للہ۔ سلطان عظم بخیریت ہیں!"

"تہنا آئے ہو کہ لشکر ساتھ ہے؟"

"بے فکر رہیے۔ بہت بڑا لشکر ساتھ ہے۔"

"کشن راؤ کو اطلاع ہوئی کہ نہیں؟"

"بالکل نہیں۔"

مادرملکہ نے اطمینان کا سانس لیا:

"پہلے کشن راؤ کو گرفتار کر دو۔"

انہوں نے حکم دیا:

"پھر کچھ اور گفتگو ہوگی!"

سید صاحب نے تعین حکم میں سر جھکا دیا اور وہیں کھڑے کھڑے ساتھ آئے ہوئے دستے
 کو حکم دیا:

"کشن راؤ کی جوتی کو گھیرے میں لے کر اسے گرفتار کر دو۔ خبردار وہ بھاگنے نہ پاتے۔"

ادھر فوجی دستہ کشن راؤ کو گرفتار کرنے روانہ ہوا، ادھر سید صاحب نے مادرملکہ

سے اجازت لے کر ان کے محل میں کچری لگائی اور قلعہ دار، رسالدار، پرے دار اور تمام

چھوٹے بڑے افراد کو طلب کر لیا۔

سید سالار کا نام سن کر کشن راڈ کی سٹی گم ہو گئی گھبرائے ہوئے لہجہ میں بولا:

”سید صاحب۔ وہ تو سالار کا معتمد کے ساتھ ہیں۔ ان کا حکم یہاں کیسے پہنچا؟“

دستہ سردار نے بحث کرنے کے بجائے وضاحت کی:

”سید صاحب خود یہاں تشریف لائے ہیں۔ اس وقت مادر ملکہ کے محل میں کچہری لگائے بیٹھے ہیں۔ تمہیں طلب کیا ہے۔“

کشن راڈ کا رنگ فنی ہو گیا۔ گھگھیا کے بولا:

”میں سید صاحب کے حضور ابھی پیش ہوتا ہوں۔ آپ لوگ چلیے میں کپڑے بدل کر آ رہا ہوں۔“

ملکہ مادر کے محل پر۔

”مکار۔ بھگنا چاہتا ہے۔“

سردار نے ڈپٹ کر کہا:

”سپاہیو۔ کپڑا سارے اور گھٹیتے ہوئے لے چلو۔“

”نہیں نہیں۔ میں چل رہا ہوں۔“

اور وہ جلدی سے دو قدم آگے آ گیا۔

فوجی دستہ نے کشن راڈ کو مہلت دی نہ موقع۔ اور اسے اپنے گھر سے میں لے کر ملکہ مادر کے محل کا رخ کیا۔

دوسری طرف مادر ملکہ کے محل میں سید صاحب نے کچہری لگا رکھی تھی اور قلعدار اور سالار پر بگڑ رہے تھے:

”تم لوگوں کے کان میں تیل پڑا ہے۔ غضب خدا کا راتنی بڑی سازش ہوئی اور تم لوگ بے خبر رہے۔ میں میدان جنگ میں خبر مل گئی۔“

قلعدار صفائی پیش کر رہا تھا:

”سید سالار بہادر۔ مجھے کشن راڈ پر شبہ تو تھا مگر کوئی ثبوت نہ مل رہا تھا اس لیے کوئی خبر نہ بھیج سکا۔ پھر وہ گورنر ہے۔ ہم کچا قدم کیسے اٹھاتے؟“

”قلعدار! یہ بہت بڑی غفلت اور غیر ذمہ داری ہے۔ تمہیں شبہ تھا تو اس جتن سے

کشن راڈ کی حویلی پر فوجی دستہ پہنچا۔ اس کی حویلی پر پانچ مسلح ہندو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ سید صاحب کے بیٹے ہوئے دستہ کے سردار نے سپاہیوں کی طرف دیکھ کے سردیو میں کہا:

”کشن راڈ کو باہر بلاؤ۔“

”گورنر ہمارا رات بہت دیر سے سوئے ہیں۔ ایک پہرے دار نے بڑی دعوت سے اکوڑ کر کہا۔“

سردار دستہ کو غصہ آ گیا۔ پیچھے کے بولا:

”یہ ہمارے سوال کا جواب نہیں ہے۔ اندر جاؤ اور اسے باہر بھیجو۔“

”ہمیں جگانے کا حکم نہیں ہے۔“ پہرے دار نے اس تلخی کی کوئی پردہ نہ کی۔

سردار نے حکم دیا:

”اندر گھس جاؤ اور کشن راڈ کو پکڑ کر لے آؤ۔“

اس وقت تک گورنر کشن راڈ کو اخلاص پہنچ گئی تھی کہ کچھ سپاہی حویلی کے سپریداروں سے الجھ رہے ہیں۔ وہ بڑے بڑا ہوا باہر آیا۔

”کیا بات ہے؟“

کشن راڈ سپاہیوں کو دیکھ کے بڑے غصے سے بولا:

”کیوں اودھم مچایا ہے۔ کون ہو تم لوگ؟“

”تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے کشن راڈ۔“ سردار دستہ نے کہا۔

کشن راڈ پھر گیا:

”کون ہے تو۔ معلوم ہے کہ تو کسی سے بات کر رہا ہے؟“

”کشن راڈ بک بک نہ کر اور میرے ساتھ چپ چاپ چل۔“

سردار بھی لال پیلا ہو گیا:

”یہ حکم سید سالار دولت خدا داد میسور، سید صاحب کا ہے!“

میں مطلع کیا ہوتا۔

اتنے میں فوجی دستہ کشن راؤ کو اپنے گھر سے میں لیے ہوئے آگیا۔
”تشریف لے آئے گورنر بہادر“

سید صاحب نے زہر خند کیا:

”کس قدر نمک حرام ہے تو۔ سلطان نے تجھے کیا نہیں دیا اور مادرِ ملکہ نے تجھ پر کون سی مہربانی نہیں کی۔ تو نے اپنی بیوی کے لیے بختِ در کی ماں کی خدمات مانگیں اور انہوں نے اسے فوراً تیرے ساتھ بھیج دیا۔ تو کتنا ذلیل اور کمینہ ہے۔
کشن راؤ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ اسے پتہ چل گیا کہ مازشس بے نقاب ہو چکی ہے۔ اب کوئی عذر کرنا بیکار ہے۔

سید صاحب نے ذرا رک کر کہا:

”تجھ سے سوال جواب کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی میں تجھے صفائی پیش کرنے کا موقع دیتا ہوں۔
کہہ تو اپنی صفائی میں کیا کتنا چلتا ہے۔“
کشن راؤ نے ذرا دیر بعد کہا:

”مجھے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہنا کہ میں ہندو ہوں اور میں نے مسیو میں ایک ہندو ریاست قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور۔“
وہ ذرا رک کے بولا:

”اور مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں؟“

”اچھا ہوا کہ تم نے خود اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔“

سید صاحب نے ایک سانس لے کر کہا:

”کوئی خواہش ہو تو مرنے سے پہلے بتا دو۔“

”ہاں۔ ایک خواہش ہے۔“

اس نے بلا توقف کہا:

”میرے اس کام میں میری بیوی کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اسے سزا دی جائے۔“ کشن راؤ نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

”تمہاری بیوی مادرِ ملکہ کے پاس ہے۔ اس کی طرف سے اطمینان رکھو۔“ سید صاحب نے

جواب دیا۔

”ایک اور خواہش ہے اگر وہ پوری کر دی جائے تو۔“

”بیان کرو۔“ سید صاحب نے کہا۔

”مجھے یہ بتا دیا جائے کہ میری اس کوشش اور منصوبے کا راز کس نے افشا کیا؟
کشن راؤ نے دوسری خواہش بتائی۔

سید صاحب کو مادرِ ملکہ نے سب کچھ بتا دیا تھا اور کشن راؤ کی بیوی اس وقت عمل میں موجود تھی اس لیے سید صاحب نے یہ راز کھولنے سے گریز کیا۔

”مجھے افسوس ہے کشن راؤ۔“

سید صاحب نے جواب میں کہا:

”میں تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ ایک سلطانی راز ہے جسے کسی صورت کھولا نہیں جاسکتا۔“

اس کے ساتھ ہی سید صاحب نے اعلان کیا:

”مجھے سلطانِ عظمیٰ نے حکم دیا کہ میں سرنگا پیم پیچ کے کشن راؤ کی غداری کی تحقیق کروں اور اگر جرم ثابت ہو جائے تو مجرم کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔“

کشن راؤ نے اپنا جرم خود تسلیم کر لیا ہے اس لیے میں کشن راؤ کے قتل کا فوری اعلان کرتا ہوں۔ اس طرح کہ پہلے اس کے دونوں بازو قطع کیے جائیں۔ پھر اس کی گردن تن سے الگ کر کے اس کی لاشیں بڑے بازار کے چوک پر لٹکا دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور کوئی بغاوت یا غداری کی جرئت نہ کر سکے۔“

سید صاحب خاموش ہوئے تو کشن راؤ نے کہا:

”سنو سید۔ تم میرے جسم کے جتنے ٹکڑے چاہو کر ڈالو مگر یہ یاد رکھنا کہ میں نے جو آگ بھڑکائی ہے وہ تمہارے سلطان کے بجائے نہ بکھے گی۔“

کشن راؤ کے بازو قطع کر کے اس کی گردن بدن سے الگ کر کے بے سر کے دھڑ کو چور ہے پر لٹکا دیا گیا۔

کشن راؤ نے جو آخری بات کہی تھی وہ پوری ہو کے رہی!

کشن راؤ کی غداری کے اس واقعہ پر "میسور گزیٹر" کے ہندو مصنف بیرون راؤ نے خوب حاشیہ آرائی کی ہے۔

وہ گزیٹر کے صفحہ ۲۶۲۵ پر لکھتا ہے :

"کشن راؤ کی بیوی جو خوبصورت، دلفار اور باعصمت تھی اپنے شوہر کی موت کے بعد ایک روایت کے مطابق سلطان کے خاص حرم میں بھر (بجوالہ کرمانی) داخل کر لی گئی۔"

بد ذات مصنف کی شرارت دیکھیے کہ اس نے اپنی تحریر میں کرمانی کا حوالہ دیا ہے جبکہ کرمانی کا تحریر میں "بجراور کرمانی" کے الفاظ موجود ہیں۔
کرمانی کی تحریر اس طرح ہے :

"اس کی بیوی نے جو حسین بھی، جیادار بھی اور بادشاہ بھی تھی،
ملکہ معظمہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا درخواست کی اور انھیں کے ذریعے حرم مراٹے سلطانی میں داخل ہوئی۔"

ملاحظہ ہو کہ کرمانی اور ہندو مصنف کی تحریر میں کس درجہ فرق ہے۔ ہندو مصنف کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشن راؤ کی بیوی کو اس کے گھر سے پکڑو کے لایا گیا اور اسے زبردستی حرم میں داخل کر دیا گیا جبکہ کرمانی کی تحریر بتاتی ہے کہ کشن راؤ کی بیوی نے خود درخواست کی اور مادر ملکہ کی سفارش سے حرم سلطانی میں رہنے کی اجازت دی گئی۔

مصنف نے ایک طرف تو "کرمانی" پر تہمت لگائی ہے اور دوسری طرف سلطان عالی مقام پر ایک نازیبا الزام عاید کیا ہے۔

مصنف نے گزیٹر کے دوسرے اور تیسرے حصہ میں جو میسور کی تاریخ پر مشتمل ہے جہاں بھی موقع ملا ہے، مسلم سلاطین کو زہریلے الفاظ سے یاد کیا ہے مگر وہ جو فادسی کا ایک مقولہ ہے کہ :

"دردغ گو را حافظہ نہ باشد"

یعنی جھوٹے آدمی کا حافظہ کمزور ہوتا ہے اور وہ اپنی کئی ہونی بات کو بعد میں بھول جاتا ہے تو اس ہندو مصنف نے اس کا خود ہی ثبوت فراہم کر دیا۔

اس نے گزیٹر کے صفحہ ۲۶۲۵ پر تو سلطان عالی مقام پر ایک نازیبا الزام لگایا ہے

۱۸۷۷ء پر یہی مصنف سلطان عالی مقام کے بارے میں لکھتا ہے :

"اس (سلطان) کو عورتوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ وہ ایک تاکید خط میں برہان الدین کو عورتوں سے دور رہنے کے لیے کہتا ہے۔ اگرچہ اس (سلطان) کے تیرہ بیٹے اور بیٹیاں تھیں لیکن بقول بورنگ "اسے عورتوں سے شیفقتگی نہیں تھی۔"

اس کی جفاکش، اعتدال پسند زندگی، پاکیزگی کی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی جو ایک مذہب کے دلدادہ مسلمان کی زندگی خیال کی جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ تسبیح رہتی جس سے عالمگیر کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔"

مصنف نے دراصل سلطان اور حرم سلطانی کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ ایک تحریر میں سلطان پر الزام لگاتا اور دوسری جگہ اس کی تعریف کرتا ہے۔
اس کے علاوہ ایک بات اور قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ مصنف نے اپنی پہلی تحریر میں لکھا ہے کہ "ایک روایت کے مطابق"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو یہ معلوم تھا کہ اس سلسلے میں "دوسری روایت" بھی موجود ہے جسے اس نے جان بوجھ کے بیان نہیں کیا۔
وہ دوسری روایت اس طرح ہے :

"کشن راؤ کی بیوی کے متعلق دوسری روایت جو مشہور ہے وہ یہ ہے کہ بیوی کو جب اپنے حرام خور شوہر کے بائیانہ خیالات معلوم ہوئے تو اس کو سخت نفرت ہوئی اور بخدا وراثی کی زبانی بیٹھو سلطان کی والدہ کو اپنے شوہر کی نامعقول حرکتوں کی اطلاع کرائی۔"

دراصل ہندو مصنف نے اس دوسری روایت کو اس لیے نہیں لکھا کہ اس سے سلطان کا دامن بالکل پاک ہو جاتا ہے۔ اگر خدا نخواستہ اس واقعہ میں کچھ بھی صداقت ہوتی تو مغرب کی حکمرانین قوم، جسے انگریز کہا جاتا ہے، وہ سلطان کو کیسے بخش دیتی؟ وہ تو اس بات کو اس قدر شہرت دیتے کہ ان کے حکم پر لکھی جانے والی ہر تاریخ میں اسے جلی حروف میں لکھا جاتا۔

یہاں پر اگر لفظ "حرم" کی تشریح نہ کی گئی تو قاری کا دماغ پھر بھی الجھا رہے گا۔
بدقسمتی سے آج کل "حرم" سے شاہی محل کی عورتیں جن میں کنبز ہیں بھی شامل ہوتی ہیں، مراد لی جاتی ہے درنہ "حرم" تو اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو مقدس ہو اور جہاں گناہ کرنا ممنوع ہو۔
اسی لیے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کو "حرمین" کہا جاتا ہے اور عرب کے بادشاہ شاہ حرمین شریفین کے لقب سے پکارے جاتے ہیں۔

یہ لفظ بعد میں گھروں کے "زنانہ حصوں" کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جس سے مقصود یہ تھا کہ اس جگہ عفت مآب عورتیں رہتی ہیں۔

پھر جب عیاشی سلطا اور نوابین نے جائز کے ساتھ ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی عورتوں کو بھی وہاں رکھنا شروع کر دیا تو "حرم" کا مفہوم کچھ اور ہو گیا اب ہندو اور مغربی مصنف حرم کو اسی معنی میں سمجھتے اور لکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں مقامی طور پر جو بات مشہور ہے وہ یہ ہے کہ کشن راؤ کی بیوی نے اپنے شوہر کے کزنوتوں سے سلطان کی والدہ ملکہ زمان کو مطلع کیا تھا۔ اس لیے کشن راؤ کے رشتے دار کشن راؤ کی بیوی کے خلاف ہو گئے تھے اور اُسے بے جاننگ کرتے رہتے تھے جس سے بیوہ ہو کر اس نے مادر ملکہ سے پناہ کی درخواست کی اور مادر ملکہ نے اسے پناہ دینے کے خیال سے محل کے اندر رہنے کی اجازت دے دی۔

سلطان کی والدہ چونکہ محل کے زنانہ حصے یعنی "حرم" میں رہتی تھیں اس لیے کرمانی نے بجا طور پر "حرم" کا لفظ استعمال کیا لیکن میسور گزیٹر کے مصنف کو تعصب نے اس درجہ بہکا دیا کہ اس نے "حرم" کو کچھ اور ہی معنوں میں سمجھنے کی کوشش کی اور اپنی تحریر میں "خاص" اور "بجبر" کے الفاظ کرمانی کا نام لے کر شامل کر دیے۔



میسور پر حملہ کرنے والی حیدر آبادی فوج دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک حصہ کاماندار فرید الدین مؤید الدولہ تھا اور دوسری کی کمان عیسیٰ خان کے ہاتھ میں تھی اور یہ دونوں وہیں سلطنت خداداد کے مختلف علاقوں کو تاخت و تاراج کرتی پھر رہی تھیں۔
عیسیٰ خان نے کبھی گوٹہ، ٹاٹا پتری اور تارٹری پر قبضہ کر لیا تھا جبکہ مؤید الدولہ نے فہر گئی کا محاصرہ کیا تھا لیکن قطب الدین خاں دولت زئی نے اس کی سخت مزاحمت کی۔
ب مؤید الدولہ نے دیکھا کہ قلعہ پر قبضہ ممکن نہیں تو وہ محاصرہ اٹھا کر مضائقہ کو تباہ کرنا ہوا کر پتہ لافٹ چلا گیا۔

مؤید الدولہ نے کر پتہ پر قبضہ کیا۔ پھر قلعہ سدوٹ بھی بلا مزاحمت اس کے ہاتھ آ گیا۔ اب مانے آگے بڑھ کر ترم کٹہہ کا محاصرہ کر لیا۔

اُدھر مرہٹہ فوج جو پرشورام کی کمان میں تھی، نے دھاڑاڑا، انگوڑا، مرجان اور شاہنور پر قبضہ کر لیا اور وہاں سے پرشورام چٹلا رگ کے قلعہ پر پہنچا۔
سلطان کے قلعہ دار دولت خاں نے قلعہ بند ہو کر مرہٹوں کا دفاع کیا۔ مقابلہ طویل کھینچ گیا اور پرشورام نے دولت خاں کو دولت کا لالچ دیتے ہوئے چار لاکھ کے عوض قلعہ خالی کرنے کو کہا۔

یہ پیش کش پرشورام کے اس قاصد نے کی تھی جو مرہٹوں کی طرف سے صلح کی گفتگو کے لیے

قلعہ کے اندر بھیجا گیا تھا۔

دولت خاں، سلطان کے انتہائی وفادار سرداروں میں سے تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ میدان میں نکل کر مرہٹوں کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ زیادہ دنوں تک قلعہ کو دشمن سے غرا رکھ سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مرہٹوں سے جنگ کیے بغیر وہ قلعہ الٹا حوالے کر دے۔

وہ دیر تک قاصد سے ٹوٹی پھوٹی مرہٹی زبان میں گفتگو کرتا رہا۔ پھر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

آخر کار اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

”ہاں بھئی۔ اب تم بتاؤ تمہارے سپہ سالار پر سورام نے قلعہ حوالے کرنے کے عوض کتنا رقم کی پیشکش کی ہے؟“

قاصد نے جواب دیا:

”میں بتا تو چکا ہوں کہ اگر آپ لڑے بھڑے بغیر قلعہ ہمارے حوالے کر دیں تو ہم آپ چار لاکھ کی نقد رقم پیش کریں گے۔“

دولت خاں نے چونک کے قاصد کو دیکھا:

”کیا کہا تم نے۔ چار لاکھ۔ صرف چار لاکھ۔“

دولت خاں کے بچے میں صبرت در آئی:

”مگر پہلے تو تم نے چالیس لاکھ کہے تھے!“

”نہیں قلعدار۔“ قاصد بولا:

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے پہلے بھی چار لاکھ کہے تھے اور اب بھی چار لاکھ پیشکش آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔“

دولت خاں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ پھر سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر بہت دیر قاصد نے اسے چوکایا:

”قلعدار۔ آپ کس خیال میں گم ہیں۔ مجھے کچھ جواب دیجیے۔“

قلعدار دولت خاں نے ایک بار پھر ایک لمبی سانس لی اور اپنی آنکھیں پٹ پٹا

ہٹے کہا:

”دیکھو قاصد۔ بات تو سوچنے والی ہی ہے۔ میرے کانوں نے تو یہ سنا تھا کہ سالار پر سورام چالیس لاکھ دینے پر آمادہ ہیں مگر اب تم چار لاکھ کہہ رہے ہو۔ میں نے تو چالیس لاکھ کو سامنے رکھ کر کچھ فیصلہ کر لیا تھا۔ پر وہ سب تو گر بڑ ہو گیا۔ چار لاکھ اور چالیس لاکھ میں ایک اور دس کا فرق ہے۔ میں یہ

میں یہ نہیں کہتا کہ تم غلط کہہ رہے ہو۔ میں تمہیں کوئی الزام نہیں دیتا۔ میں مرہٹی زبان کم کم جانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔“

”تو پھر اب کیا فیصلہ کیا آپ نے؟“ قاصد نے تنگ آ کے کہا۔

”میں نے فیصلہ تو کر لیا ہے لیکن وہ فیصلہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔“

دولت خاں نے بڑے اعتماد سے کہا:

”ابھی ایک گھنٹے کے اندر چالیس لاکھ کے چار لاکھ ہو گئے۔ اس سے میں کیا بچوں؟“

قاصد چڑ کر غصہ سے بولا:

”آپ کچھ بھی سمجھے مگر مجھے جواب دیجیے۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔“

”بسم اللہ۔“

دولت خاں نے فوراً کہا:

”آپ جاسکتے ہیں۔ آپ کو کوئی نہیں روک سکتا۔ رہا چار اور چالیس کا معاملہ تو میں خود

سالار پر سورام کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور ان سے منہ در منہ بات کر کے معاملہ نپٹاؤں

گا تاکہ بعد میں جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہو۔“

”آپ کب آئیں گے ہمارے لشکر میں؟“ قاصد کا لہجہ گھڑا اور سخت ہو گیا۔

”میں آج ہی جواب دینے حاضر ہوں گا۔“

دولت خاں نے جواب دیا:

”بس ذرا اجاب سے بات کر لوں۔ پھر پہنچتا ہوں آپ کے پاس۔ سالار پر سورام کی

خدمت میں مسیحا سلام پیش کیجیے گا اور میری طرف سے کہیے گا کہ میں آج رات ان کی خدمت

میں حاضر ہو کر بالمشافہ گفتگو کر دوں گا۔ آپ مطمئن رہیے۔ اس میں کوئی خرقہ نہ ہو گا۔“

لہجہ ان کی پیشیں برآمد ہوئیں۔
دور سے دیکھنے والوں کو یہی دکھائی دے رہا تھا کہ پانچ چھ سوار گھوڑے بڑھائے چلے
آ رہے ہیں۔

ایک تورات اندھیری تھی۔ دوسرے یہ کہ دولت خاں نے نوجوانوں کی پلٹن کو سیاہ لباس
پہنا دیے تھے اس لیے وہ دُور سے نظر نہ آتے تھے۔

جب دولت خاں اپنے پانچ سواروں کے ساتھ مرہٹہ لشکر کے قریب پہنچا تو پرسورام کے
منسوبے کے مطابق چند آدمی دولت خاں کے استقبال کے لیے آگے بڑھے۔
ان کے آگے بڑھتے ہی دولت خاں نے راسیں کھینچ لیں اور وہ اور اس کے ساتھ
پانچ سوار رک گئے۔

استقبال کو آنے والے ان کے بالکل قریب پہنچ گئے۔
اسی لمحے دولت خاں کے ساتھی سواروں نے چیخ چیخ کے ایک نئی زبان میں کچھ کمنا شروع
کیا۔ یہ نئی زبان اور نئے الفاظ دراصل وہ اشارے تھے جو دولت خاں نے اپنے سواروں کے
دستوں اور نوجوانوں کی پلٹنوں کو سمجھا دیے تھے اور ان اشاروں کا مطلب تھا کہ مرہٹہ لشکر گاہ
پر عام حملہ کر دیا جائے۔

پھر
دیکھتے ہی دیکھتے میدان میں ہزاروں شعلے بھڑک اٹھے۔ دولت خاں کے سوار دستوں
اور پیادوں کے پاس شب خون مارنے کا سامان تھا۔ انہوں نے فوراً لکڑیوں میں لپٹے ہوئے
کپڑوں میں آگ لگا کر شعلے بھڑکائے اور آگ کے شعلے بھڑکائے اور آگ کے شعلے بھڑکائے
لڑ پڑے۔

مرہٹے یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جس دولت خاں کو گرفتار کرنے کے لیے انہوں نے
بال بچایا تھا وہ ان کو یوں مات دے گا۔

دولت خاں نے مرہٹوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اس کے سواروں اور پیادوں
نے ایک طرف تو مرہٹہ جیوں میں شعلے بھڑکائے اور دوسری طرف جگمگنے والوں کو گاجرمولی کی
طرح کا تپا شروع کر دیا۔

پوری خیمہ گاہ میں قیامت کا سماں تھا۔ مرہٹہ لشکر کی جو خوشی خوشی گھوم پھر رہے تھے

پرسورام کے قاصد نے واپس جا کے اسے تمام گفتگو سے آگاہ کیا۔ پرسورام نے
قاصد سے کہا:

”یہ مسئلہ ہر قیمت پر طے کرنا ہے۔ مصلحت تو یہ تھی کہ دولت خاں نے چارہ کے بدلے
چالیس کسے تھے تو تم نے اسی وقت ”ہاں“ کہہ دی ہوتی ررتم مجھے دینا ہے اور دولت خاں
کو لینا ہے اور یہاں آ کے میرے لشکر کے اندر۔ سمجھے کہ نہیں!“

قاصد مسکرا دیا:
”اب تو غلطی ہو گئی۔ حکم ہو تو پھر جاؤں اور چالیس لاکھ پر معاملہ طے کر آؤں!“
”نہیں۔“ پرسورام نے کہا:

”اس کی ضرورت نہیں۔ اب اسے آنے دو۔“
پرسورام کو اطمینان ہو گیا کہ اب قلعہ چتلا رگ پر اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس
حکم دیا کہ رات کو جب قلعہ دار دولت خاں آئے تو اس کا شاندار استقبال کیا جائے۔ بظاہر
اس نے یہ اعلان کیا۔ لیکن — اپنے خاص دستے کو حکم دیا کہ جب دولت خاں اس
گفتگو کو آئے تو اس کے خیمے کو گھیر لیا جائے اور جب وہ اشارہ کرے تو دولت خاں
کو گرفتار کر لیا جائے۔

شاید اس وجہ سے مثل مشہور ہے کہ محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہے۔
پرسورام نے یہ انتظام تو کر لیا کہ وہ دولت خاں کو واپس نہیں جانے دے گا مگر اس
اس پر غور نہیں کیا کہ دولت خاں بھی آخر ایک پرانا اور گھاگ قلعہ دار ہے۔ جب وہ دشمن کی
خیمہ گاہ میں جا رہا ہے تو اس نے اپنی حفاظت کا بھی کوئی انتظام کیا ہو گا۔
چنانچہ —

رات ہوتے ہی پرسورام کی خیمہ گاہ میں دولت خاں کے استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں
دوسری طرف دولت خاں اندھیرے میں قلعہ کا دروازہ کھول کے باہر نکلا۔

دولت خاں قلعے سے نکلا تو اس کے ساتھ صرف پانچ سوار تھے لیکن جب وہ قلعہ سے
دُور آگے چلا گیا تو قلعہ سے سواروں کے دو رسالے اور ان کے پیچھے ایک ہزار جبیدہ جیہ

تہا دوبر باد ڈالتے۔
 کمری گٹھ تک پہنچتے پہنچتے انگریزی فوج پر دس بارہ جھلے اور شب خون مارے جا چکے تھے
 سپہ سالار قمر الدین نے اس مسئلہ میں ایک بڑی دلچسپ حرکت کی تھی۔
 اس نے اپنے لشکر میں اعلان کر دیا تھا کہ:
 جو لشکر کسی انگریز کی ناک اور کان کاٹ کے لائے گا اسے ایک طلائی ہون
 انعام میں دیا جائے گا۔
 انگریزوں سے لدا ہوا بیل پکڑ کے لائے گا تو پانچ طلائی ہون انعام میں دیے
 جائیں گے۔

اور اگر گھوڑا لائے گا تو اسے دس طلائی ہون انعام میں ملیں گے!
 قمر الدین کے اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ انگریزوں کے کٹے ہوئے کانوں اور ناکوں
 کا روزانہ ایک ڈھیر لگ جاتا تھا اور انگریزی فوج اس قدر دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ ان کا
 کوئی سپاہی لشکر سے پانچ گز دور جانے کی بھی ہمت نہ کرتا تھا۔
 چنانچہ جب انگریزی فوج کمری گٹھ پہنچی تو ناک کان کٹے سینکڑوں انگریزوں کا الگ
 ایک دستہ بن چکا تھا اور فوج کے پاس سامان رسد تقریباً ختم ہو گیا تھا۔
 ۱۴ مئی ۱۸۹۱ء کو نصف شب کے قریب انگریزوں نے سرنگا پٹم پر حملہ کیا۔ حملہ میں
 حصہ لینے والے لشکر میں انگریزوں کی چھ بٹالین فوج، ہندوستانیوں کی بارہ بٹالین اور ایک
 ہزار سوار اور ۳۶ توپیں شامل تھیں۔
 کارنوالس کی بدقسمتی یا سلطان کی خوش نصیبی تھی کہ اس رات شدید قسم کا طوفان باد و باران
 آیا۔ طوفان اس قدر شدید تھا کہ انگریز کا نڈر کو حملہ کا حکم واپس لینا پڑا۔ اور ان کے لشکر کو صبح
 تک تاریکی اور بارش دیکھ کر میں ٹامک ٹوٹیاں مارتے رہے۔

صبح کو جب مطلع صاف ہوا تو انگریزوں نے دیکھا کہ کمری گٹھ کی پہاڑیوں پر سلطان کا سپہ سالار
 سید حمید قاضی ہے۔ ان پہاڑیوں پر سید حمید نے رات کے طوفان باد و باران کے دوران قلعہ
 کیا تھا۔

بیٹھے آپس میں خوش گپیں کر رہے تھے۔ ان پر حملہ ہوا تو وہ بدحواس ہو گئے اور جس کا جھرمٹا اٹھا
 وہ بھاگ اٹھا کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔
 چشم زدن میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔
 پر شورام ایسا گھبراہٹ سے سر پر رکھ کر صوبہ مرا کی طرف بھاگا۔ کچھ لشکر اس کے ساتھ
 ہو رہے۔ باقی کوئی ادھر گیا کوئی اُدھر گیا۔
 پر سورج کا پورا لشکر تباہ ہو گیا۔ وہ صوبہ مرا میں بھی نہیں ٹھہرا اور جتنے لشکر اس تک
 پہنچ سکے انہیں ساتھ لے کے انگریزوں سے جا ملا۔

لارڈ کارنوالس نے دو ہفتے تیار یوں میں صرف کیے۔ پھر مئی کے پہلے ہفتہ (۱۸۹۱ء) میں
 پینڈا پٹن کے راستے سرنگا پٹم روانہ ہوا۔
 درہلے کا دیری میں ان دنوں پانی خشک تھا اس لیے انگریزی فوج کو دریا پار کرنے میں
 کوئی پریشانی نہ ہوئی اور وہ اگلے ہفتے سرنگا پٹم سے ۹ میل دور کمری گٹھ پہنچ گئی لیکن اس ہفتہ
 میں صفر کے دوران اس انگریزی فوج نے جو ادھم چایا اسے سوچ کے ای روٹے ٹکڑے
 ہو جاتے ہیں۔
 انگریز۔ جو خود کو مذہب قوم کہتے ہیں، ان کی فوج نے کارنوالس کے حکم کے تحت راستے
 میں پڑنے والی ہر بستی اور آبادی کو لوٹ لیا۔ پھر اس میں آگ لگا کر خاکستر کر دیا۔
 تہذیب کے ان ٹھیکیداروں نے انسان تو انسان آبادی کے جانوروں تک کو مار ڈالا اور
 جو کام کے تھے انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔
 قدرت ظالم کو ڈھیل ہمت دیتی ہے لیکن عبرت کے لیے کبھی کبھی اس کو خوفناک سزا
 بھی دیتی ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ سلطان نے سید صاحب کو سرنگا پٹم بھیجا تھا اور قمر الدین کو سپہ سالار
 بنا کر اسے انگریزوں پر حملے اور شب خون مارنے کا حکم دیا تھا۔
 چنانچہ جب انگریزی لشکر کسی بستی کو تباہ کر کے دم لینا تو قمر الدین کے چھاپہ مار
 دیتے اس پر بلائے گئے ان کو لوٹ پڑے اور قتل و غارت کے ساتھ ساتھ سامان رسد کو

وہ کارنوالس کے پاس آیا۔

کارنوالس اس سے بہت خوش ہوا اور اس کے فوجیوں نے ایک عرصہ کے بعد پیٹ بھر کھانا کھایا۔

اسی اثنا میں کرنل ریڈ نے بنگلہ سے اٹھ، اچھی، شراب، روٹیوں، بطخوں، بکریوں، گائوں اور بیلوں کے ریوڑ کے ریوڑ انگریزی لشکر کو بھجوا دیے۔

کارنوالس اس سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے کرنل ریڈ کو بنگلہ، بھنگور، بھنگور، کولار اور ہسور کی تحصیلداری کے ساتھ ساتھ اس کے علاقہ کے پالیگادوں کی وکالت کا عہدہ بھی بخش دیا۔ پھر جب فوج کا پیٹ بھر تو اس کے دل میں سرنگاپٹم کی تیسرے خیال پھر سے کھلنے لگا۔

اس وقت نظام دکن کی فوجیں کڑپہ اور گرم کٹھ کے عوام پر ظلم دھارہاں تھیں اور گھاٹونی قسم کی لوٹ مار میں مصروف تھیں۔

نظام کی فوجوں کا اب تک سلطانی فوجوں سے کوئی معرکہ نہیں ہوا تھا۔ شاید وہ برہہ راست سلطان سے ٹکرانا نہیں چاہتا تھا یا پھر وہ یہ سب کچھ کسی خاص منصوبے کے تحت کر رہا تھا۔

جنوبی ہند میں ستمبر کا مہینہ، برسات کا مہینہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے کارنوالس نے موسمِ برسات بنگلہ میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور فوجوں کی تنظیم نو میں لگ گیا۔

گوشہ دونوں اسے سامانِ رسد کے مسئلے میں جو دشواریاں پیش آئی تھیں ان کے پیش نظر کارنوالس نے فوجی رسد پر خاص توجہ دی تاکہ سرنگاپٹم پر دوبارہ حملہ کے دوران اسے کوئی دقت نہ ہو۔

پھر اسی ستمبر کے مہینہ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے انگریزوں کو نندی درگ کے قلعہ پر حملہ کے لیے جانا پڑا۔

نندی درگ کا قلعہ سلطان پٹنہ نے اپنے ایک بہادر سردار اٹل علی بیگ کو بطور جاگیر عطا کیا تھا۔ مگر یہ سردار جاگیر پاتے ہی تشویش و سناں کے بجائے جنگ و رہاں اور مجبورواؤں کی زلفوں کا اسیر ہو کر رہ گیا۔

اس نے قلعہ داری کے فرائض تو اپنے ایک ہم مشرب اور ہم بیالہ و ہم نوالہ سلطان خاں کو سونپ دیے اور خود حسن و جمال کے افانوں کا مہربن کر رہ گیا۔

جاگیردار اٹل علی خاں کے عیش و عشرت کے افانے جب عاک ہوئے اور لوگوں کو یہ

سپہ دار سید حمید کو پاڑیوں سے ہٹانے کے لیے جبراً میڈوز نے زبردست حملہ کیا مگر اس نے زبردست شکست کھائی اور ہزاروں سپاہیوں کی جانیں تلف کرانے کے بعد اسے واپس ہونا پڑا۔

کرنل میکسٹون اور فلائیڈ بھی حملے کے لیے نکلے مگر سپہ سالار قمر الدین کے ہاتھوں شکست کھا کر پسپا ہو گئے۔

لارڈ کارنوالس ۲۸ گھنٹے بھی وہاں نہ ٹھہر سکا اور اس نے واپسی کا ارادہ کر لیا مگر اس دوران لشکر میں سامانِ رسد بالکل ختم ہو چکا تھا اور ہر طرف بھوک، بھوک کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ چیزوں کی قیمت آسمان تک پہنچ گئی تھی۔ چاول، گھی، خشک نشا کا آٹا یا تو ناپید ہو گئے تھے یا اس قدر تنگ ہو گئے تھے کہ انہیں خریدنا ممکن نہ رہا تھا۔

جب فوج بھوکوں مرنے لگی تو اس نے تدبیریں کھینچنے والے بیلوں کو کاٹ کاٹ کر کھانا شروع کر دیا۔

جب رسد کا کوئی انتظام نہ ہو سکا اور حالات بد سے بدتر ہو گئے تو کارنوالس نے واپسی کا اعلان کر دیا۔

اس نے بڑی بڑی زمینیں میں دفن کر دیں اور کھڑی کے تمام بھاری سامان میں آگ لگا دی۔

سلطان نے جب انگریزی لشکر کی بد حالی کے بارے میں سنا تو اس نے خفاک دتر میووں کے تحائف بھیجے اور ساتھ میں کارنوالس کو دوستی کا ایک خط لکھا۔

مگر کارنوالس نے شرافت کا ثبوت نہ دیا۔ اس نے میو سے واپس بھجوا دیے اور سلطان کے خط کا کوئی جواب نہ دیا۔

کارنوالس وہاں سے پسپا ہو کر اتری درگ پہنچ گیا۔ سلطانی لشکر کی طرف سے اس کی مزاحمت نہ ہو رہی تھی اس لیے اس نے آسانی سے اتری درگ پر قبضہ کر لیا۔

کارنوالس کو وہاں کثیر تعداد میں سامانِ رسد حاصل ہوا۔ بھوک کی فوج کو کچا پکا جو کچھ ملا وہ کھا گئی اور اسے بدھتی ہو گئی۔

پرمورام کی نصف سے زیادہ فوج دولت خاں کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔ وہ اپنی بچی بچی فوج کے ساتھ انگریزوں کے لیے سامانِ رسد اکٹھا کرتا پھرا۔ پھر بہت سا سامانِ رسد لے کر

معلوم ہوا کہ قلعہ نندی درگ کی حرم سرا سے عفت سب خواتین نور خضت ہو چکی ہیں اور اب وہ حرم لہا ایک بہت بڑے عشرت کدے میں تبدیل ہو چکی ہے تو غنچہ دوں، بد معاشوں اور پلے لٹنگے اٹھائی گئیں کی بن آئی۔ انہوں نے ناچنے گانے والی در باؤں کے ذریعے جاگیر دار لطف علی بیگ تک رسائی حاصل کر لی اور اسے ناچ گانے کے ساتھ ساتھ عیش و عشرت اور شراب و شباب کا ایسا چمکے لگا دیا کہ اس نے محل سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔

سلطان خاں اگرچہ لطف علی بیگ کا پرانا ساتھی اور گہرا دوست تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ لطف علی بیگ کو سمجھاتا کہ وہ قلعہ داری ہو کہ جاگیر داری، ان دونوں عہدوں پر صرف وہ لوگ قابض رہ سکتے ہیں جو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں اور جن کا ہاتھ ہر وقت قبضہ شمشیر پر رہتا ہو۔ مگر اسے کیا پڑی تھی کہ وہ بیگ کو اس خوابِ خوش کو شے سے جگانا۔ اس نے جان بوجھ کے بیگ کو گناہوں کی دلدل میں دھکیل دیا اور خود قلعہ داری کے ساتھ ساتھ اس نے جاگیر داری بھی سنبھال لی۔

سلطان خاں نے جاگیر دار لطف علی بیگ کو ہمہ وقت عیش و عشرت میں غرق رکھنے کے لیے کچھ ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کر لی تھیں جو، نوجوان عورتوں کی خیر و فخر و خست کا کام کرتے تھے۔

سلطان خاں ان کے ذریعے ہمراہ نندی درگ اور اس کے ارد گرد کے علاقوں سے جوان اور نوجوان عورتوں کو منگواتا اور انہیں بھاری رقم دے کر جاگیر داری کی خدمت کے لیے خرید لیتا۔ اس طرح ہر ماہ شاہی حرم سرا (جاگیر دار کے محل) میں دس پندرہ نئی عورتوں کا اضافہ ہو جاتا۔ اور اب تو یہ حال ہو چکا تھا کہ عورتوں کی کثرت کی وجہ سے سلطان خاں کو ان کی رہائش کے لیے ایک اور محل مخصوص کرنا پڑا تھا۔

اس طرح کا ایک قافلہ اور درگ سے گزرا جہاں کارنوالس کا لشکر ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ اس قافلے میں بیس مرد اور بیس خوبصورت عورتیں تھیں۔

کارنوالس کے لشکر میں جو ہندوستانی پلٹیں تھیں انہوں نے جوان عورتوں کو دیکھا تو رال ٹیک پڑی اور انہوں نے ان سے پھر پھر شہاد شروع کر دی۔ عورتوں کے ساتھ جو مرد تھے وہ سب مسلح تھے۔ انہوں نے عورتوں کی حفاظت کے لیے تلواریں کھینچ لیں۔ دوسری طرف انگریزی فوج کے لشکر بھی تھے۔ انہیں بھلا بیس آدمیوں کی کیا فکر ہوتی۔

وہی تلواریں سونت کر سب سے آگے اور ایک چھوٹا سا معرکہ ہو گیا مگر کہاں آزمودہ کار شکاری اور کہاں عورتوں کے تاجر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دس تاجر اس معرکے میں کام آئے اور باقیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

لشکریوں نے انہیں پکڑ لیا اور انہیں عورتوں کے ساتھ لے کر اپنی خیمہ گاہ میں پہنچے۔

دوسرے لشکریوں نے عورتوں کو دیکھا تو انہوں نے بھی ان سے پھر پھر شروع کر دی۔ اس بات پر لشکریوں میں آپس میں ٹھن گئی اور وہ گتھم گتھا ہو گئے۔ اس ہنگامے کی خبر اسی وقت کارنوالس کو پہنچائی گئی۔ اس نے چند انگریز سوار بھیج کے سب کو پکڑ لیا۔

جب کارنوالس نے ان سے پوچھ گچھ کی تو اسے معلوم ہوا کہ ان خوبصورت عورتوں کو نندی درگ کے جاگیر دار لطف علی بیگ کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ اس انکشاف پر اس شخصے ذہن میں فوراً ایک جنگی چال آئی۔ اس نے عورتوں کے محافظوں کو زائد کر دیا جنہیں اس کے لشکر کی پکڑ لائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے حکم دیا:

"ان سب کو اچھے سے اچھا کھانا دیا جائے اور انہیں آرام سے رکھا جائے۔" دوسرے دن کارنوالس نے پانچ مردوں اور پانچ عورتوں کو اپنے پاس بلا کر ان کے سامنے ایک خوبصورت پیش کش رکھی۔ کارنوالس نے ان سے کہا:

"تمہارے دس آدمی اس لڑائی میں مارے گئے ہیں۔ اگر تم اس بات پر تیار ہو جاؤ کہ اپنے ان دس آدمیوں کے بدلے تم اپنے ساتھ ہمارے دس آدمی قلعہ نندی درگ میں لے جاؤ گے تو ہم تمہاری زندگیوں کی حفاظت دینے کو تیار ہیں۔" ان کی سمجھ میں کارنوالس کی بات نہ آئی کیونکہ وہ ٹوٹی چھوٹی اردو بول رہا تھا اور یہ مرد اور عورتیں اس انگریز کو دیکھ کر ڈر گئے تھے۔

ان میں سے ایک آدمی نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"مگر سے صاحب۔ ہماری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آتی۔ کسی ہندوستانی کو حکم دیکھیں کہ

گھروں کو آگ لگا دیں مگر وہ انہیں اناج کا ایک دانہ نہیں دیں گے۔
گاؤں والوں کی اس جھگڑ اور خلوص کے مقابلہ میں جوان عورتوں کی تجارت کرنے والے
ان لوگوں کے دل بھی اپنے وطن اور اپنی قوم کی محبت سے مرشار تھے۔

جب انہیں معلوم ہوا کہ انگریز بندی درگ کے قلعہ پر قبضہ کرنے کے لیے اپنے آدمی
اندراجھج کر جنگی چال چلانا چاہتا ہے تو ان کے کان فوراً کھڑے ہوئے۔
وہ طبیعت کے کتنے ہی کینے اور ذلیل سہی مگر ان کے دل ملک اور قوم کے خلاف انگریزوں
کی کوئی مدد کرنے پر آمادہ نہ تھے مگر وہ کھلے الفاظ میں انکار کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔

ان میں سے ایک نے لاوڈ کارنوالس سے سوال کیا:
"صاحب۔ آپ قلعہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں مگر یہ دس بارہ آدمی قلعہ کی فوج کو کس طرح
مار سکتے ہیں۔ وہاں تو بے انتہا فوج ہے۔"

ملکار کارنوالس کا ماتھا ٹھنکا۔

اس نے سوال کرنے والے کو گھور کر دیکھا:
"مجھے اس سے کیا مطلب کہ ہمارے آدمی وہاں کیا کر سکتے ہیں۔ تجھے تو بس ہمارے
آدمیوں کو اپنے ساتھ اندر لے جانا ہے۔ تو اس کا جواب دے۔ اگر تو ہمارے کام کو دے تو
ہم تجھے مالاً مال کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے صاحب جی۔"

وہ فوراً رضامند ہو گیا مگر منہ بنا کر بولا:

"صاحب۔ میں تو راضی ہوں مگر میرے پانچ ساتھی اور عورتیں جو باہر ہیں، اگر وہ نہ
لے تو کیا ہو گا؟"

کارنوالس اس کے سوال پر چکر اگیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد عورتوں کا وہ
دلائل خود ہی بول پڑا:

"صاحب۔ آپ مجھے ایک گھنٹے کا وقت دیں۔ اس دوران میں سب کو راضی کر لوں گا۔
پھر آپ کو بتاؤں گا۔"

کارنوالس جیسے مشکل حل ہو گئی۔ اس نے جھٹ سے کہا:

"اگر آپ ٹھیک ہے۔ تم سب کو جا کے راضی کر دو۔"

آپ کی بات سمجھائے۔
چنانچہ کارنوالس نے ایک ہندوستانی کے ذریعے ان کو اپنی بات سمجھائی اور اس میں
اضافہ کر دیا کہ:

"اگر قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو تمہیں بہت انعام دیا جائے گا۔"

عورتوں کو انوار کے یا بھلا بھلا کے لانے والے ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھنے
ہیں جنہیں کوئی بھی شریف آدمی ابھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ایسے لوگ جب لگی کوچوں سے گزرتے
ہیں تو ان کو دتے، شندے اور بروکے ناموں سے پکارا جاتا ہے مگر ایک بات ہم سب
مانتے ہیں۔ وہ یہ کہ "محبت" کا جذبہ اللہ کی دین ہے۔ وہ جسے چاہے عطا کر دے۔ محبت کہ
معنی ہرگز نہیں کہ مرد، خوبصورت عورت اور عورت، وجہ و شکیل مرد سے محبت کرے۔
محبت کسی کو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ کسی کو تعلیم سے محبت ہوتی ہے تو وہ عالم فاضل ہو جاتا،
کسی کو دین سے محبت ہوتی ہے تو وہ دین کے لیے شہادت بھی قبول کر لیتا ہے۔

ایسی ہی ایک محبت وہ ہے جو ایک انسان کو اپنی قوم اور ملک سے ہوتی ہے۔
پچھلے صفحات میں ہم لکھ چکے ہیں کہ انگریزوں کے لشکر میں اناج کی اس قدر قلت ہو چکی تھی
ان کے لشکر کے بھوکوں مرنے لگے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انگریز فوج جس طرف سے گزرتی
تھی وہاں بھی اناج کی کمی تھی حقیقت یہ تھی کہ انگریز راستے میں پڑنے والی تمام آبادیوں کو
خاکستر کر دیتے تھے اور یہ خبر جنگ کی آگ کی طرح پوری سلطنتِ خدا داد میں پھیل چکی تھی۔
اس لیے ایسی آبادیوں کے باشندے انگریزوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے اپنے اناج کے
ذخیرے اس طرح چھپا دیتے تھے کہ انگریزوں کی کوششیں بے سود باوجود انہیں ایک دانہ،
مل پاتا۔ جب گاؤں والوں سے اناج کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو وہ منہ بسورنے
ہوئے جواب دیتے:

"صاحب۔ ہم تو مہینوں سے فاقے کر رہے ہیں۔"

ان کے اس جواب پر کوئی کیا کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ آبادی میں آگ لگا دے
سب کچھ بھونک دے۔

گاؤں والوں کے اس انکار میں دراصل ان کے دلوں میں اپنے وطن اور ملک کی چھپی
ہوئی محبت تھی۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ خواہ انگریز انہیں قتل کر دیں یا ان کے

کارنوالس سے اجازت ملنے پر وہ شخص اپنے ساتھیوں کے ساتھ دہاں سے اڑکے باہر آگیا۔

جب وہ کارنوالس کے پاس اندر گیا تھا تو اسے اپنی جان کی فکر تھی اور اپنے منہ کا خیال تھا مگر جب وہ مکار کارنوالس سے مل کر باہر آیا تو اس کا ذہن اچانک روشن ہو گیا اور یہ ملک و قوم سے محبت کی روشنی تھی۔

اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ کارنوالس اپنے آدمیوں کو قلعہ کے اندر اس لیے بھیجا چاہتا ہے تاکہ وہ دہاں پہنچ کے جاگیردار کو قتل کر دیں اور پھر انگریز فوج قلعہ پر قبضہ کر لے۔ پس —

جب وہ اپنے باقی ساتھیوں اور مظلوم عورتوں کے پاس واپس آیا تو اس کا انداز بدل گیا۔

”بھائیو! ہماری ذات دنیا کے بدترین لوگوں میں شمار ہوتی ہے لیکن آج ہیں خدا نے ایک ایسا موقع دیا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اپنے گناہوں سے توبہ کر کے بھلے لوگوں میں شامل ہو سکتے ہیں۔“

سب سے پہلے تو میں خود توبہ کرنا ہوں اور اعلان کرنا ہوں کہ انگریزی فوج کو قلعہ بندی درگ پر قبضہ نہیں کرنے دوں گا خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اس کے ساتھیوں نے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر ایک نے پوچھا: ”تیری بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ انگریز اور انگریزی فوج سے تو ہم سب کو نفرت ہے مگر تو قلعہ کیسے بچا سکتا ہے۔ انگریزوں کے پاس لشکر ہے۔ قلعہ بندی درگ میں بھی فوج موجود ہے۔ وہ ایک دوسرے سے جنگ کریں گے۔ تو باہم انگریزوں کو قلعہ پر قبضہ کرنے سے کیسے روک سکتے ہیں؟“

”روک سکتے ہیں۔ ضرور روک سکتے ہیں۔“

اس نے زور دے کے کہا:

”انگریز لاٹھیاں سے ساتھ اپنے دس پندرہ آدمی قلعہ کے اندر بھیجا چاہتا ہے اور وہی دس پندرہ آدمی قلعہ میں کوئی گڑبڑ کر کے انگریزوں کا قبضہ کر ادیں گے۔“

”مگر تم کہو گے کیا؟“ پہلے نے پوچھا۔

”میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔“ اس نے کہا:

”اے! اگر تم سب میرا ساتھ دو تو میں ان آدمیوں کو جو انگریز لاٹھیاں میرے ساتھ بھیجا رہا ہے، قلعہ کے اندر پہنچنے ہی ختم کر دوں گا اور قلعہ والوں کو بتاؤں گا کہ یہ لوگ انگریزوں کے جاسوس تھے اور قلعہ کو تباہ کرنے آئے تھے۔“

پہلا فوراً جواب میں بولا:

”جہاں تک ان گورے بندروں کا سوال ہے تو ہم سب ان سے نفرت کرتے ہیں اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ وہ قلعہ پر قبضہ کر لیں۔ بہر حال ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جیسا تم کہو گے ہم ایسا ہی کریں گے۔“

اپنے ساتھیوں کی طرف سے جن میں جوان عورتیں بھی شامل تھیں، اطمینان کرنے کے بعد وہ آدمی پھر کارنوالس کے پاس پہنچا اور اسے اطلاع دی:

”صاحب ہادر۔ ہم تیار ہیں۔ آپ جتنے آدمی چاہیں ہمارے ساتھ بھیج سکتے ہیں۔“

کارنوالس خوش ہو گیا۔ اس نے پندرہ آدمیوں کی بات کی تھی مگر اب اس کے برخلاف ان لوگوں کے ساتھ اپنے پندرہ آدمی روانہ کر دیے۔

انگریزی فوج قلعہ بندی درگ پہنچ گئی تھی۔ قلعہ والوں کو اس کے آگے کی پہلے ہی خبر مل چکی تھی اس لیے انہوں نے قلعہ کے تمام دروازے بند کر دیے تھے اور قلعہ کے بڑوں پر چار توپیں چڑھا کر مکمل دفاعی تدابیر اختیار کر لی تھیں۔

جاگیردار لطف علی بیگ کو بھی شاید کچھ خوف خدا پیدا ہو گیا تھا اس لیے وہ شراب و شباب سے الگ ہو کر قلعہ دار سلطان خان کے ساتھ دفاعی تیار رہی میں حصہ لے رہا تھا۔

انگریزوں کے منصوبہ کے مطابق ایک صبح جو بصورت عورتوں اور ان کے محافظوں کا ایک قافلہ جس میں پندرہ آدمی کارنوالس کے بھی شامل تھے، قلعہ بندی درگ کے صدر دروازے کی طرف چلا۔

قلعہ والوں کو ہر وقت انگریزوں کے حملہ کا ارکان رہتا تھا اس لیے انہوں نے چوکی پرہ سخت کر دیا تھا۔ انہوں نے جو تیس چالیس افراد کا گروہ قلعہ کی طرف آتے دیکھا تو سب تیار

لوگ پچاس گز دور ہو جائیں۔
 جھنڈے والے نے اپنے ساتھیوں کو جلدی بلدی کچھ ہدایات دیں۔ سب لوگ پیچھے ہٹ کر
 کھڑے ہو گئے اور جھنڈے والا صدر دروازے کی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔
 قلعہ کے دروازوں میں فوری ضرورت کے لیے اس قسم کی کھڑکیاں بنائی جاتی تھیں۔ یہ
 دراصل چھوٹے دروازے ہی ہوتے تھے جن میں جھک کے داخل ہوا جاتا تھا۔
 جھنڈے والے کے لیے کھڑکی کھل گئی اور جونہی وہ اندر داخل ہوا کھڑکی پھر بند ہو گئی۔
 اسے پریداروں کے سردار کے سامنے پیش کیا گیا۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ قلعہ دار سلطان خاں اس وقت گشت کرتا ہوا صدر دروازے پر
 پہنچ گیا۔ اسے پریداروں نے سب کچھ بتا دیا تھا اور اسی کے حکم پر صرف جھنڈے والے
 کو اندر بلا یا گیا تھا۔

جھنڈے والے کو جیسے ہی قلعہ دار سلطان خاں کے سامنے پیش کیا گیا اس نے فوراً اسے
 پہچان لیا۔ سلطان خاں کو بھی اس دلال کو پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔
 ”اوبد بخت تارا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ انگریزی فوج نے قلعہ کو گھیر رکھا ہے اور تو پھر بھی
 عورتوں کو لے کے آیا ہے؟“

اس جھنڈے والے (دلال) کا نام تارا تھا۔ وہ ہندی درگ لال نے والی عورتوں کا سودا سلاطین
 خاں ہی سے کرتا تھا۔ اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے کے رازدار تھے۔
 تارا کو تعجب ہو رہا تھا کہ خود قلعہ دار نے ہی اس سے عورتیں منگوائی ہیں اور اب خود
 ہی اسے ڈانٹ رہا ہے۔

”تارا کے دل میں حب الوطنی کی جوت جاگ پڑی تھی اس لیے اس نے تمام خیالوں کو ذہن
 سے جھٹک دیا اور بولا:

”قلعہ دار بہادر۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت قلعہ والوں کو خود بصورت عورتوں کی ضرورت نہیں۔
 اور نہ میں عورتوں کا سودا گرہن کہ آیا ہوں۔ میں اس وقت کسی اور جذبہ کے تحت اپنی جان
 جتیلی پر رکھ کے یہاں تک پہنچا ہوں۔“

سلطان خاں چونکہ ثابت ہو چکا تھا اس لیے وہ تارا کے جواب پر چڑ گیا:
 ”تیرا اور کون سا جذبہ ہو سکتا ہے۔ عورتوں کی خرید و فروخت کرنے والے سے نہ اسے

ہو گئے

پھر جب ان کی نظر ایک سفید جھنڈے پر پڑی تو انہیں کچھ اطمینان ہوا کہ یہ صلح کا دندا
 آ رہا ہے۔ پھر بھی وہ چوکس رہے۔

یہ مختصر قافلہ جس کے آگے آگے سفید جھنڈا لے کر چلنے والا دی عورتوں کا سودا گر تھا
 جس نے کارنوالس سے گفتگو کی تھی صدر دروازے کے قریب پہنچا تو دروازے کے ادھر
 کی ایک برجی سے کسی شخص نے گردن نکال کر سوال کیا:

”کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟“

جھنڈے والے آدمی نے پوری آواز سے جپٹتے ہوئے کہا:

”ہم سودا گر ہیں اور سلطان خاں قلعہ دار نے جو سامان منگایا تھا وہ لے کر آئے ہیں۔“

”کیا سامان منگایا تھا قلعہ دار نے؟“

جھنڈے والا گھبرا گیا۔

اب وہ کیسے کہتا کہ سلطان خاں نے جاگیردار لطف علی بیگ کے لیے خوبصورت اور جوان
 عورتیں منگوائی تھیں۔

اس خراس نے گردہ میں سے عورتوں کو الگ کھڑا کر دیا۔ پھر عورتوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ
 کرتے ہوئے بولا:

”یہ سامان منگایا تھا سلطان خاں نے۔ وہ جاگیردار صاحب کو تحفہ دینا چاہتے ہیں۔ میں
 انہیں لے کے آیا ہوں۔“

قلعہ کی برجی میں کچھ دیر خاموشی رہی۔

دراصل صدر دروازے کے محافظ عورتوں کو دیکھ کے پریشان ہو گئے تھے۔ انہیں یہ تو
 معلوم تھا کہ جاگیردار لطف علی بیگ کے لیے روز ہی کسی نہ کسی دلال کے ذریعے خوبصورت
 عورتیں آیا کرتی ہیں لیکن جب سے ہندی درگ میں یہ افواہ پھیلی تھی کہ انگریزی فوج ادھر آ رہی
 ہے، تب سے قلعہ کے دروازے نہ صرف بند رہتے تھے بلکہ باہر سے اندر آنے والے کے
 بارے میں بڑی سخت تحقیقات ہوتی۔ پھر اسے اندر آنے کی اجازت ملتی۔

آخر برجی سے پھر آواز ابھری:

”جس آدمی کے ہاتھ میں جھنڈا ہے صرف وہ دروازے کی کھڑکی کے پاس آئے باقی تمام

برائی اور گناہ کے کسی نیکی کی توقع تو نہیں کی جاسکتی۔
 "تارا کو بھی غصہ آگیا۔ اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔
 "قلعدار بہادر۔ میں آپ سے انعام لینے یا عورتوں کی قیمت وصول کرنے نہیں آیا بلکہ یہ
 بنانے آیا ہوں کہ میرے ساتھ انگریزی فوج کے پندرہ جاسوس آئے ہیں اور انگریز نہ کمانڈر
 نے اس سلسلے میں مجھے بھاری رشوت کی پیشکش کی ہے۔"
 قلعہ دار سلطان خاں کا سارا غصہ کا فور ہو گیا۔ وہ اٹھ کے جلدی سے تارا کے پاس آیا اور
 بڑی محنت سے بولا:

"تارا۔ کیا تو سچ کہہ رہا ہے۔ تیرے ساتھ دشمن کے جاسوس آئے ہیں؟"

"ہاں ہاں۔" تارا نے زور دے کر کہا:

"اور اگر ان جاسوسوں کو گرفتار نہ کیا گیا تو یہ پندرہ آدمی قلعہ کے اندر آ کر خدا معلوم
 کیا نصب ڈھائیں گے۔"

قلعدار اور گھبرا گیا:

"کہاں ہیں وہ جاسوس۔ مجھے بتا۔ تجھے دکھانا۔"

قلعدار صاحب نے تارا نے کہا:

"آپ آرام سے بیٹھ کر مبری بات سنیے۔ اس طرح گھبرانے سے کچھ نہیں بنے گا۔"
 قلعہ دار واپس جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا:

"ہاں تارا۔ اب بتا۔"

"تارا نے دوسرے آدمیوں کو ہٹوا کے اپنی پیدی کہانی قلعہ دار کو سنادی۔ قلعہ دار کی عقل
 دنگ رہ گئی۔ اس نے تارا سے پوچھا:

"اب بتا۔ تیری کیا رائے ہے ان جاسوسوں کے بارے میں؟"

"میری رائے تو یہ ہے قلعہ دار صاحب۔"

"تارا کے لیے میں نفرت در آئی:

"ان تمام جاسوسوں کو قلعہ میں داخل ہوتے ہی قتل کر دیا جائے۔ نہ دسے گا بانس۔ نہ
 بچے گی بانسری۔"

"ٹھیک ہے۔" قلعہ دار نے اس کی رائے کی تائید کی:

"مگر تم کہتے ہو کہ ان جاسوسوں کے ساتھ تمہارے اپنے آدمی بھی ہیں۔ انہیں کس طرح
 پہچانا جائے گا۔"

تارا نے قلعہ دار کو اطمینان دلایا:

"ان کی آپ فکر نہ کریں۔ میں نے اپنے آدمیوں کو سمجھا دیا ہے کہ وہ قلعہ میں داخل ہوتے
 وقت اپنے سرخ رومال اپنے ہاتھ میں پکڑ لیں۔ پس جن لوگوں کے ہاتھوں میں سرخ رومال ہوں
 انہیں چھوڑ کے باقی سب کو فوراً قتل کر دیا جائے۔"

قلعدار سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا:

"تمہارا کمانا میں مانتا ہوں مگر اس سلسلے میں مجھے جاگیر دار لطف علی بیگ سے گفتگو
 کرنا ہوگی۔"

تارا کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموش رہا۔

قلعدار اسے ساتھ لے کے باہر آیا۔ اس نے حکم دیا کہ صدر دروازے کے سامنے
 اندر کی طرف ننگی تلواریں لے کر لشکری دو قطاروں میں کھڑے ہو کر ایک راستہ بنالیں۔ اس
 راستے سے باہر سے آنے والے مرد اور عورتوں کو گزرا جائے گا۔ عورتوں سے کوئی تعزین نہ
 کیا جائے اور جن مردوں کے ہاتھ میں لال رومال ہوں ان کو بھی نہ روکا جائے البتہ جن افراد
 کے ہاتھ میں لال رومال نہ ہوں انہیں گرفتار کر لیا جائے اور اگر وہ مزاحمت کریں تو انہیں فوراً
 قتل کر دیا جائے۔

چنانچہ اس حکم پر عمل کیا گیا۔

قلعدار نے تارا کو قلعہ سے باہر بھیج دیا تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کو اندر لے آئے۔ تارا نے
 سب عورتوں کو قلعہ کی کھڑکی سے اندر بھیجا۔ ان کے بعد آدمیوں کو اندر بھیجنا شروع کیا۔ وہ اپنے
 آدمیوں اور انگریزوں کے جاسوسوں کو الگ الگ نہ کر سکا۔ اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش
 کرتا تو جاسوسوں کو شبہ ہو سکتا تھا۔

جب تمام آدمی قلعہ کے اندر جا چکے تو آخر میں تارا خود اندر گیا۔

اس نے دیکھا کہ اس کے سب ساتھی ہاتھوں میں لال رومال پکڑے کھڑے تھے اور
 جاسوسوں کو گرفتار کر کے پایہ زنجیر کر دیا گیا تھا۔

روایت ہے کہ اندر آنے والے جاسوسوں سے جب سختی سے پوچھا گیا اور ان سے کہا گیا

کہ اگر وہ اقبالِ جرم کر لیں تو ان کی جان بخشی کر دی جائے گی تو اس پیش کش کا بہت اچھا اثر ہوا۔

جاسوسوں نے بتایا کہ ان میں سات آدمیوں کو قلعہ دار کے قتل اور آٹھ آدمیوں کو جاگیر دار کے قتل پر مامور کیا گیا تھا اور انہیں حکم تھا کہ وہ ایک ہی وقت میں دونوں کو قتل کریں۔ پھر تفصیل پر چڑھ کے سیاہ رومال ہلائیں تاکہ محاصرہ کرنے والا لشکر فوراً قلعہ پر حملہ کر دے۔

ملطف علی بیگ نے جاسوسوں کی جان بخشی کر دی اور قسم کھائی کہ وہ آخری وقت تک قلعہ کو بچانے کی کوشش کرے گا اور انگریزوں کے ساتھ کسی قسم کی صلح کی بات چیت نہ ہوگی۔ اس نے اُن تمام عورتوں کو آزاد کر دیا جو اُس کے لیے خرید کے لائی گئی تھیں۔ اس نے تمام لڑکیوں اور عورتوں سے وعدہ کیا کہ جنگ کے بعد وہ انہیں ان کے گھروں تک پہنچائے گا۔ وہ پوری طرح تائب ہو گیا تھا۔

لیکن۔

ملطف علی بیگ کو اپنی بات پوری کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ انگریزوں نے ایک ہفتہ انتظار کرنے کے بعد قلعہ نندی درگ پر زبردست حملہ کر دیا۔ اس حملہ کی مدافعت بھی زبردست طریقے سے کی گئی۔ دو ہفتوں تک قلعہ پر حملے ہوتے رہے مگر قلعہ و دہ نے حملہ آوروں کو قلعہ سے دُور ہی رکھا۔ پھر اٹھارہویں دن مسلسل گولہ باری سے قلعہ کی تفصیل میں سوراخ ہو گیا اور انگریزی فوج کو قلعہ میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔

مندے درگے پر قبضہ کے سلسلے میں ایک مورخ کا بیان اس طرح

ہے کہ:

”میجر گوڈی نے آگے بڑھ کر قلعہ پر حملہ کیا اور مسلسل اٹھارہ روز کی جدوجہد کے بعد قلعہ کی دیوار منہدم کر دینے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے بعد ایک رات جہل بیدوز نے آکر مورچوں میں قیام کیا اور سپاہیوں کو لالچ دیا کہ وہ قلعہ پر قبضہ کر کے ہر قسم کی لوٹ مار اور جو چاہے وہ کر سکتے ہیں۔

اس لالچ میں آکر فوجیوں نے نہایت بے بالکانہ قلعہ پر حملہ کیا اور جلد ہی قلعہ پر قبضہ کر کے بڑی بے دردی سے بلا تخصیص لوگوں کا قتل عام کیا۔ انہوں نے بچوں کو بخشانہ بوڑھوں کو۔ خواتین کے ساتھ انہوں نے جو سلوک کیا، اس کے تصور ہی سے گردن جھک جاتی ہے۔ لوٹ مار کا وہ بازار گرم کیا کہ پورے قلعہ میں ایک دمڑی اور ایک چھلہ بجھنے لگا۔

یہ سلوک ہے اس قوم کا جو خود کو یورپ کی محذب ترین قوم سمجھتی ہے۔ سامی مؤرخ

نے لطف علی بیگ کو قلعہ دار در سلطان خاں کو بخش دیا۔

قلعہ پر قبضہ کے بعد لطف علی بیگ اور سلطان خاں دست بدست جنگ کرتے ہوئے شدید زخمی ہو گئے تھے۔ ان دونوں کو زخمی حالت میں بیڑیاں پہنا کر جہز میڈوز کے سامنے پیش کیا گیا۔ دونوں زخموں سے پُور ہو رہے تھے۔ جہز میڈوز نے دریافت کیا:

”تم دونوں میں لطف علی بیگ قلعہ دار کون ہے؟“

لطف علی بیگ کے جواب دینے سے پہلے سلطان خاں بول پڑا:

”قلعہ دار میں ہوں۔“

لطف علی بیگ جو زیادہ خون بہ جانے کی وجہ سے نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ اس نے سر کو تھکادے کر آنکھیں کھولیں اور بولا:

”اس کی بات کا اعتبار نہ کرنا یہ میرا ملازم ہے اور مجھے بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ لطف علی بیگ میرا نام ہے اور میں قلعہ بندی درگ کا حکمران ہوں۔“

جہز میڈوز نے حیران نظروں سے دونوں کو دیکھا:

”بلاشبہ تم دونوں بہادر ہو۔“

”اور بلاشبہ تم اور تمہارا لشکر بزدل ہے جس نے بچوں اور بوڑھوں کو بھی نہیں بخشا اور خواہش کی وہ بے حرمتی کی ہے کہ تاریخ میں جب بھی اس کا ذکر آئے گا تمہاری قوم شرم سے سر نہ اٹھا سکے گی۔“

جہز میڈوز کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

وہ دیر تک خاموش رہا پھر اس نے سراٹھا کر کہا:

”تم نے ہمارا مقابلہ بہادری سے کیا۔ ہم تم سے خوش ہوئے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اگر ہم تمہیں آزاد کر دیں تو تم کیا کر دو گے؟“

لطف علی بیگ نے سلطان خاں کی طرف دیکھا مگر اس کا سر زمین سے جا لگا تھا۔ شاید وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

تب۔ لطف علی بیگ نے کہا:

”پہلے یہ بتاؤ تم میں کارنوالس کون ہے؟“

”وہ یہاں نہیں ہیں۔“ جہز میڈوز نے جواب دیا:

”اپنے خیمے میں ہیں۔“

لطف علی بیگ کا چھیکا چہرہ کچھ اور چھیکا پڑ گیا۔ اس نے سر جھکایا۔

جہز میڈوز نے اسے پھر پھر پڑا:

”تم نے ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”کارنوالس نہیں ہے۔ اب کیا جواب دوں میں؟“

”اگر کارنوالس موجود ہوتے تو تمہارا جواب کیا ہوتا؟“

”پھر میرا جواب کچھ اس طرح ہوتا۔“

لطف علی بیگ زخموں سے زیادہ خون بہ جانے کی وجہ سے مضطرب ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے زور لگا کر اپنی قوت جمع کی اور کہا:

”اگر میں آزاد ہوتا اور کارنوالس بھی یہیں ہوتا تو میں تم سے تلوار چھین کر اُس پر حملہ کرتا اور اس وقت تک اس سے لڑتا رہتا جب تک دونوں میں سے ایک کا خاتمہ نہ ہو جاتا۔“

لطف علی بیگ کے اس جواب پر جہز میڈوز کا نرل میکسٹول اور دیگر انگریز افسروں کی آنکھیں حیرت و استعجاب سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

مرنگا پٹم پر پہلے حملہ میں ناکامی کے بعد کارنوالس پسپا ہو کر بنگلور پہنچا تھا۔ بنگلور میں سستانے اور دوبارہ تیاری کرنے کے بعد اب پھر وہ مرنگا پٹم پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

یہ بات قابل غور تھی کہ سلطان اس وقت تک براہ راست کارنوالس کے مقابلے پر نہیں آیا تھا۔ یہ دراصل سلطان کی ایک اعلیٰ جنگی چال تھی اور اس کی تہ تک آخر کارنوالس پہنچ گیا تھا۔

کارنوالس کو یقین ہو گیا تھا کہ سلطان اسے چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں الجھا کر اس کی طاقت کو کمزور کرنا چاہتا ہے تاکہ جب وہ پلٹ کر جوابی حملہ کرے تو کارنوالس کی کمزور طاقت اس کی تاب نہ لا سکے۔ انگریز جرنیل، سلطان کی اس چال کا بہر صورت جواب دینا چاہتے تھے۔

کو فتح کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ پالا گھاٹ کے قریب ہونے کی وجہ سے کوئٹہ تورا کے قلعہ کا بہت اہمیت تھی۔

کوئٹہ میں انگریز لیفٹیننٹ چارلس اور فرانسس کمانڈر ڈی لاکو بیس موجود تھے۔ لاکو بیس کے زیرِ کمان ٹراونکور کے آصف جاہ کی فوج تھی۔

میر قمر الدین نے دہاں پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور قاصد کے ذریعے انگریزوں اور فرانسس کو پیغام دیا کہ وہ قلعہ خالی کر کے جدھر جانا چاہیں جاسکتے ہیں مگر چارلس اور لاکو بیس نے جواب دینے کے بجائے قاصد کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔

میر قمر الدین نے تمام دن اور پوری رات قاصد کی واپسی کا انتظار کیا۔ پھر قمر الدین خود قاصد بن کے اور سفید جھنڈا لپکڑ کر قلعہ کے صدر دروازے پر جا پہنچا۔

اس نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا تو فصیل اور برجیوں پر لشکر ہی لشکر دکھائی دیے۔ میر نے منہ اوپر کر کے زور سے کہا:

”میں سلطانِ لشکر کے سالار میر قمر الدین کا قاصد ہوں۔ مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں یہ معلوم کروں کہ کل جو ہمارا قاصد آیا تھا اس پر کیا گزری؟ وہ واپس کیوں نہیں گیا؟ کیا اسے گرفتار کر لیا گیا ہے؟“

انگو ایسا ہے تو یہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے اور قاصد کو گرفتار کرنا اپنی کمزوری کو چھپانے کے مترادف ہوتا ہے۔“

اوپر سے کوئی جواب نہ آیا۔
تھوڑی دیر انتظار کے بعد قمر الدین نے پھر کہا:

”میں دیکھ رہا ہوں کہ فصیل اور دروازے کے اوپر لشکر ہی موجود ہیں مگر کسی کے منہ میں زبان نہیں کہ میرے سوال کا جواب دے۔ کیا اوپر موجود تھا لوگ گونجے اور ہرے میں؟“

اس وقت کسی نے اوپر سے سر نکال کر جواب دیا:

”ہمارے پاس کوئی قاصد نہیں آیا۔ اگر تم ہم سے گفتگو کرنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں اندر آنے کی اجازت دے سکتے ہیں!“

جب انگریزی فوج مرنگا پٹم پر ناکام ہو کر واپس چلی گئی تو سلطان نے اپنے بڑے بیٹے فتح حیدر کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ گرم کٹہہ کی طرف روانہ کیا۔

گرم کٹہہ کو دشمن فوجیں محاصرے میں لیے ہوئے تھیں۔ فتح حیدر کے ساتھ جانے والی فوجوں کے حوصلے بلند رکھنے کے لیے سلطان نے فوجیوں کو سال بھر کی تنخواہ پیشگی ادا کر دی تھی۔

خاموشی کہ اس سے فوج میں اپنے سردار اور سلطان کے لیے کسی قدر اچھے جذبات پیدا ہوئے ہوں گے اور انہوں نے ان معرکوں میں جوش و خروش سے حصہ لیا ہو گا۔

شہزادہ فتح حیدر تہ کیر کے راستے صوبہ سرائے کی طرف روانہ ہوا اور عین اُس وقت جب کارنوالس جنگور میں دم لے رہا تھا، شہزادہ فتح حیدر ماگل داڑی (ماگل پور) کے جنگل میں پہنچا۔ اس نے اپنے لشکر کو تو ماگل داڑی میں بھجوا دیا اور چیدہ چیدہ سواروں کے چند دستوں کے ساتھ گرم کٹہہ پہنچا اور حملہ آوروں پر قہر خداوندی بن کے ٹوٹ پڑا۔

گرم کٹہہ کا محاصرہ کرنے والی حیدر آبادی فوج کا سردار حافظ مؤید الدولہ تھا۔ شہزادہ فتح کے اس طوفانی حملہ میں مؤید الدولہ مارا گیا اور شہزادے نے اس کا سر نیزے سے چڑھا کر بلند کر دیا۔

حیدر آبادی لشکر نے جب اپنے سردار کا یہ حال دیکھا تو وہ منتشر اور پرانگندہ ہو کر میدان چھوڑ کر ٹپڑ کی طرف بھاگ نکلا۔

شہزادہ فتح حیدر گرم کٹہہ میں کامیاب ہونے کے بعد لشکر لے کر موہن پٹی اور دھنباڑی کی طرف روانہ ہوا۔ دہاں نواب دکن کے بیٹے سکندر جاہ اور مشیر الملک کی فوجیں پڑاؤ ڈالے پڑی تھیں۔ انہیں مؤید الدولہ کے مارے جلنے کی خبر مل چکی تھی راب جو انہیں معلوم ہوا کہ شہزادہ ان کی طرف آ رہا ہے تو وہ اپنی فوجیں لے کر سنگل پالیہ کی طرف بھاگ نکلا۔ شہزادہ دہاں پہنچا تو میدان صاف تھا۔ پھر وہ مدگیری ہوتا ہوا مرنگا پٹم واپس چلا گیا۔

سلطان ٹپڑ کی اب بھی ہی کو شش اور پالیسی تھی کہ انگریزوں کے ساتھ براہِ راست مقابلہ کرنے کے بجائے ان کی فوجوں کو اذہر اذہرا لٹھا کے ان کی طاقت کو توڑ جائے اور وہ اس کو شش میں کامیاب بھی نہ ہو سکیں۔ چنانچہ اس نے انگریزوں کو ہراساں کرنے اور ان کی توجہ دوسری طرف مبذول کرانے کے لیے میر قمر الدین کو آٹھ ہزار باقاعدہ فوج کے ساتھ کوئٹہ

اس جنگ کے دوران سلطان، انگریزوں سے صلح کی مسلسل کوشش کرتا رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کے اپنے قریبی امرا اور دزرا کی مفاد پرستی اور ملک و قوم اور سلطان سے غداری تھی۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے ان غداروں کی صورتیں پہچان لی تھیں مگر وہ اس قدر زور آور ہو چکے تھے کہ ان پر ہاتھ ڈالنا، سلطنتِ خداداد کے جلد زوال پذیر ہونے کا سبب بن سکتا تھا۔ اس لیے سلطان، انگریزوں سے جس صورت جلد زوال صلح کر لینا چاہتا تھا۔ سلطان نے صلح اور دوستی کے سلسلے میں جرنل میڈوز کو دو سال پہلے ایک خط لکھا تھا جس میں اس نے یہ پیش کش کی تھی کہ دونوں طرف کے وکیل باہم مل کر مسائل کو حل کریں مگر اس کا جواب میڈوز نے جس حقارت سے دیا اس کا ذکر ہم نے پہلے ہو چکا ہے۔

اُس وقت کارنوالس کو یہ چاہیے تھا کہ وہ معاملہ کو طول دینے کے بجائے گفت و شنید کا آغاز کرنا مگر اس کے سر پر تو سرنگا پٹم کی فوج کا بھوت سوار تھا۔

چنانچہ — انگریزوں کے اس صاحبِ اقتدار لارڈ کارنوالس نے جرنل میڈوز کو سلطان کے بارے میں جو زہر آلود خط لکھا اس سے ظاہر ہو گیا کہ کارنوالس، سلطان جیسے ذہین، جرأت مند اور حریت پسند حکمران کو سلطنتِ خداداد کے تحت و تاج سے محروم کر کے میسور کے سابق راجہ کو تخت پر بٹھانا چاہتا ہے۔ اس نے جرنل میڈوز کو یہ اختیار دیدیا کہ اگر سلطان اس کی خواہش کے ثبوت پر مندرجہ ذیل شرائط کو تسلیم کر لے تو اس سے گفتگو کی جاسکتی ہے:

۱۔ ہذا بذاتِ خود ہتھیار ڈال دے۔

۲۔ سرنگا پٹم حوالے کر دے۔

۳۔ یا اپنے بڑے بیٹے کو بنگلور کے قلعہ کے ساتھ تھاری تحویل میں

بطور یرغمال دیدے۔

اس کے علاوہ:

۱۔ انگریز قیدیوں کو رہا کرے۔

۲۔ تدارین جنگ ادا کرے جس میں اس نے جوں اور زخا کو براہِ رحمہ

ہلے گا۔

یہ سن کے میر قمر الدین نے ایک قلعہ لگایا اور جواب دیا: "تم کہتے ہو کہ اندرا کہ تم سے گفتگو کروں تاکہ تم مجھے بھی گرفتار کر کے اسی جگہ بھیجو جہاں میر سے پہلے ساتھی کو بھیجا ہے۔ یاد رکھو کہ:

آزمودہ را آزمودن جہل است

(آزمائے ہونے کو آزمائے دقتی ہے)

اور یہ بھی یاد رکھو کہ قاصد کو گرفتار کرنے والے کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔ تم لوگ انتقام سے نہ بچ سکو گے۔

اس کے ساتھ ہی میر قمر الدین نے اپنا گھوڑا تیزی سے موڑا۔ ادھر اُس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اُدھر فصیل اور برجوں سے اس پر تیردیں اور گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ مگر قمر الدین کا گھوڑا، ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ تیر اور گولیاں اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکیں۔

میر قمر الدین واپس پہنچا تو اس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ آٹھ ہزار فوجی اور تو بچا نہ بھی تھا۔

اس نے فوراً حکم دیا:

"قلعہ پر بغیر کسی وقفہ کے مسلسل گولہ باری کی جائے۔"

حکم کی دیر تھی کہ تو بچا نہ نے چاروں طرف سے قلعہ پر آگ برسنا شروع کر دیا۔ ایک بیان کے مطابق قلعہ کو بمبوتور پر تین ہفتے تک گولہ باری ہوئی تو اس کی فصیلیں تو الگ رہیں، پورا قلعہ پیوند خاک ہو گیا۔

انگریز بیفٹینٹ چارمس اور فرانسس کمانڈر ڈی لاکو بیس نے معہ اپنی فوج کے ہتھیار ڈال دیے اور ان سب کو گرفتار کر کے سرنگا پٹم بھیج دیا گیا۔

قمر الدین اس معرکے سے فارغ ہونے کے بعد کو بمبوتور کے فوجی اور انتظامی امور دست کرنے میں لگ گیا اور فروری ۱۷۹۲ء تک وہاں موجود رہا۔ پھر اسے سلطان کا ایک فرمان موصول ہوا جس میں اسے بدوڑ جانے کا حکم دیا گیا تھا تاکہ وہ بدوڑ سے مرہٹوں کو نکال باہر کرے۔ ایک عجیب بات یہ نظر آتی ہے کہ میر قمر الدین اس جوانمردی سے انگریزوں کے خلاف بندہ آزمار مگر اس کے بعد وہ انگریزوں کے خلاف کسی جنگ میں نظر نہیں آتا۔

آٹھ ہزار پیادہ سے اور دوسری طرف بیس ہزار کا مرہٹہ لشکر۔

ایسا دن پڑا کہ زمین و آسمان کانپ اٹھے۔ بنکی نواب چھلا دے کی طرح میدان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوڑا بھگاتے اچلتے کرتے اور اپنے سپاہیوں کے وصلے بڑھاتے اڑتے پھرتے رہے تھے۔

مرہٹوں نے بہت دباؤ ڈالا کہ بنکی نواب اور ان کے پیارے میدان چھوڑ جائیں یا پسپا ہو جائیں مگر وہ سب تو آہنی دیوار بن گئے تھے۔ جو سپاہی جاں کھڑا تھا دلوں سے ایک دم پیچھے نہیں ہٹا اور اس نے وہی (ڑتے) (ڑتے) شہادت پائی۔

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی مگر بنکی نواب نے میدان نہیں چھوڑا۔ پھر وہ شدید زخمی ہو کے گرنے لگے تو ایک دفا دار اچک کر ان کے پیچھے گھوٹے پر بیٹھا اور انہیں میدان سے نکال لے گیا۔

مردار کے میدان سے جانے کے بعد سپاہیوں کے حوصلے ٹوٹ گئے اور وہ بھی سردار کے پیچھے سموگا سے نکل گئے۔ اور مرہٹوں کا سموگا پر قبضہ ہو گیا۔

پرسورام سموگا پر قبضے کے بعد بد نور کی طرف چلا۔ بنکی نواب کو شکست دے کر اس کی فوج کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے۔ وہ اس خیال سے بد نور کی طرف گیا تھا کہ وہاں انگریز کمانڈر ایبر کرومبی بھی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ پرسورام چاہتا تھا کہ ایبر کرومبی کے ساتھ مل کر وہ بد نور پر حملہ کرے اور اس پر قبضہ کر لے۔

مگر جب وہ ایبر کرومبی سے پڑاؤ کے قریب پہنچا تو اسے ایک تیز رفتار سوار اُنا دکھائی دیا۔

پرسورام نے حکم دیا:

"اس ہمارے دو کا جلتے۔"

پس دس مرہٹہ سوار آنے والے کا راستہ روک کے کھڑے ہو گئے۔ سوار کو مجبوراً رکنا پڑا۔ مرہٹے اسے پکڑ کر پرسورام کے سامنے لے گئے۔

پرسورام نے سوار سے پوچھا:

"تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"موت کی وادی سے۔" سوار نے جواب دیا۔

۲۔ مکلی طور پر معاہدہ ہونے تک ہر ماہ خراج ادا کرنا رہے۔

قیدیوں کے بتا دے کے سلسلے میں سلطان نے ایک اور خط کارنوالس کو بھیجا جس میں پیش کش کی کہ وہ اپنا ایک معتمد امن کی گفت و شنید کے لیے بھیجنے کا خواہش مند ہے مگر مکار کارنوالس نے اس کے جواب میں کڑی شرطیں لگا دیں اور شہزادے کو یہ خیال بنانے پر زور دیا۔

پھر جب کارنوالس سرنگاپٹم پر حملہ میں ناکام ہوا اور محاصرہ اٹھا کر بنگلور واپس چلا گیا تو اس کے ردیے میں کچھ چمک پیدا ہو گئی کہ اس کی فوج بھوکوں مر رہی تھی اور اسے کسی طرف سے مدد نہ مل رہی تھی۔ یہاں تک کہ فوجی توپ خانہ کھینچنے والے گھوڑوں کو بھی ذبح کر کے کھا گئے تھے۔

ان مصائب میں اس نے صلح کا ارادہ کیا مگر بنگلور میں مرہٹہ فوج پہنچ گئی۔ اس کے پاس سامانِ رسد وافر مقدار میں موجود تھا۔ چنانچہ جب اس کو اور اس کے فوجیوں کو پیٹ بھر کھانا ملا تو اس کا دماغ پھر الٹ گیا۔

اس نے پیو سلطان کے خط کے جواب میں لکھا کہ:

"صلح کی گفت گو صرف مرہٹوں اور نظام کی موجودگی ہی میں ہو سکتی ہے۔"

حالانکہ سلطان امن کا اتنا خواہش مند تھا کہ اس نے جنرل میڈرز کے پاس خط کے ساتھ خشک اور تر مہود کی پیٹلیوں کی پیٹیاں بھیج دی تھیں۔

بنگلور سے مرہٹہ فوج پرسورام کی سپہ سالاری میں صوبہ سرکاری طرف روانہ ہوئی تاکہ اس پر قبضہ کر سکے مگر صوبہ سرکار پیچھے سے پہلے ہی مرہٹہ فوج کا بنکی نواب کی فوج سے مقابلہ ہو گیا۔ بنکی نواب کا اصل نام محمد رضا تھا اور یہ سلطان کے ایک مشہور جرنیل تھے۔

محمد رضا مالابار کے جنگلوں میں آگ لگانے کی وجہ سے بنکی نواب کے نام سے مشہور ہو گئے تھے اور ان دنوں قصبہ سموگا میں اپنے آٹھ ہزار سپاہیوں سمیت موجود تھے۔

بنکی نواب کو مرہٹہ لشکر کے آنے کی خبر ملی تو وہ آٹھ ہزار پیادوں کے ساتھ مرہٹوں کے سامنے خیمہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔

پرسورام کے ساتھ بیس ہزار مرہٹہ لشکر تھا جس میں کئی ہزار سوار بھی تھے۔ ایک طرف

بارہ آدمی کے حساب سے تھی اور جانور جن میں ہانسی، گھوڑے، بیل، اونٹ اور گدھے شامل تھے وہ سپاہیوں سے پندرہ لاکھ زیادہ تھے۔

ایک اندازے کے مطابق یکمپ میں تین لاکھ بیس ہزار بغلہ دار باربرداری کے لیے اور چار لاکھ اسی ہزار جانوروں کے لیے موجود تھے۔ انگریزوں اور نظام کی فوج ان کے علاوہ تھی۔
انخادیوں کی یہ فوج جب کوچ کرتی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے "ناحدنظر انسانوں اور جانوروں کا سیلاب آیا ہوا ہے۔"
اسی کتاب میں سلطانی فوج کے بارے میں لکھا ہے:
"سلطانی فوج کی تعداد قلعہ میں چالیس ہزار سپاہی اور پانچ ہزار سوار ہوں گے۔"

انخادیوں کی ساری فوج نئی دہلی میں بلبوس تھی۔ جموں پر چمکدار ہتھیار سجے تھے اور بیڑا بچے بخانی فوج یوں رواں دواں تھی جیسے امیروں رئیسوں کی بارات چڑھتی ہے۔ نظام دکن کا بیٹا سکندر جاہ، مرہٹہ سردار ہری پنٹھ، پٹھانوں پر سوار لینے اپنے رسالوں کے آگے آگے چل رہے تھے مگر دوانگی کے دوسرے دن ان کی تمام شان و شوکت دھری رہ گئی۔
دوسرا دن چڑھتے ہی انگریزی لشکر کے ہراول دستے کا ایک سوار گھوڑا اٹا کا رنوالس کے پاس پہنچا۔

وہ گھوڑے سے اترا اور گھبراٹے ہوئے اپنے میں عرض کیا:
"سلطان کا لشکر اس طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے صاحب بہادر۔"

کارنوالس بھی گھبرا گیا۔ اس نے پوچھا:
"لشکر کی تعداد کتنی ہے؟"

سوار نے جواب دیا:

"صاحب بہادر! اگر دلتی اٹھ رہی ہے کہ تعداد کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ بہت بڑا لشکر ہے۔"

"تم نے لشکر آج آنکھوں سے دیکھا تھا؟"

"جی صاحب بہادر۔"

ہراول دستے کے سوار نے جواب دیا:

"میں نے خود دیکھا تھا۔ پورے ہراول دستے نے دیکھا تھا۔ جی تو سردار نے مجھے آپ کی جانب سے کہہ دیا ہے کہ ہشیا رہ جائیں۔"

اس سے زیادہ نہ سوار بتا سکا اور نہ کارنوالس معلوم کر سکا کہ یہ تو ٹھیک تھا کہ ہراول دستہ و درپر گرداڑی ہوئی دیکھی تھی۔ پھر انہیں کچھ سوار بھی آتے دکھائی دیے تھے۔ پس ہراول دستہ سردار نے ایک سوار کارنوالس کو اطلاع دینے کے لیے دوڑا دیا تھا۔

کارنوالس نے فوراً الرٹ ہونے کا حکم دیا اور دوسرے ہی لمحے ساری فوج حالت جنگ میں آئی۔ بیڈ باجے بند کر دیے گئے۔ سپاہیوں نے زرعی برقی سنسے لباس اتار کر عام وردیاں ناہیں۔ صفیں ترتیب دی گئیں اور سمینہ میسرہ درست کیا گیا۔
اس عالم میں چار گھنٹے گزر گئے۔

مگر — سلطانی لشکر کو نہ آتا تھا نہ آیا۔

یہ اور اس طرح کی دوسری کئی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان اور سلطانی لشکر کی فوجوں پر کس قدر دہشت جاری تھی مگر ہندوؤں اور ایمان فروشوں کی آنکھیں نہ کھل رہی تھیں۔ وہ خود اپنی اور اپنے وطن کی آزادی کی راہ میں کانٹے بڑے چلے جا رہے تھے۔ سلطان عالی مقام لہندا پرستوں نے اس طرح گھبراہٹ کیا تھا کہ انہیں قلعہ سرنگا پٹم سے باہر کی قطعی کوئی خبر نہ تھی اور یہی تو صرف اس طرح کی:

"مالی جاہ۔ انگریزوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ وہ اب سرنگا پٹم کا رخ نہیں کر سکتے۔"

یہ کس قدر غضب کی بات تھی کہ انخادی فوجیں سرنگا پٹم کی فصیل کے باہر پہنچ گئیں اور

وہیں کسی کو خبر تک نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ دشمن کی فوجوں نے اس فصیل سے صرف چار میل کے اندر پر اپنا کیمپ قائم کر لیا مگر قلعہ میں موجود ایک سو بھاری توپوں اور تین سو ہلکی توپوں میں سے ایک بھی گولہ نہ چلا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا کہ دریا کے کاہری کے اس نا پوس جسے سرنگا پٹم کہا جاتا ہے اسی میں سلطان بیٹھا اپنے چالیس ہزار پیادوں اور پانچ ہزار آہن پوش سواروں کی میت موجود ہے۔

سلطنت خداداد کا دارالسلطنت مرزا کا پیم دریا سے کاویری میں ایک ٹاپو پر واقع تھا کی شرقاً غرباً لمبائی ساڑھے تین میل اور شمالاً جنوباً چوڑائی ڈیڑھ میل تھی۔ یہ مزید تین حصوں میں تقسیم تھا:

۱۔ مغربی حصہ میں پرانا شہر تھا اور اسے قلعہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

۲۔ درمیان میں سلطان کا آباد کردہ شہر گنجام تھا

۳۔ مشرق میں لال باغ تھا۔

قلعہ اور گنجام کے درمیان دولت باغ تھا شہر کے باہر کی طرف ایک گہری خندق تھی جس دریا سے کاویری کا پانی آتا تھا۔

مرزا کا پیم سات گڑھیاں (چھوٹے قلعے) بھی تعمیر کی گئی تھیں۔ ان میں ایک اہم گڑھ عید گاہ کے نام سے مشہور تھی۔ یہ شہر کے شمالی کونے پر تھی۔ شہر کے اندر تین گڑھیاں تھیں جن کے نام یہ تھے:

۱۔ لالی

۲۔ محمد

۳۔ سلطان

سلطان شیو کا خیمہ آخری گڑھ جس کا نام بھی "سلطان" تھا اس کے قریب تھا۔ اس ٹاپو کے چاروں طرف ۲۵۰ گنز (۵۰ فیٹ) چوڑا دریا سے کاویری کا آب زبردست حفاظتی بند خندق کے مانند بنتا تھا۔

مرزا کا پیم میں داخل ہونے کے لیے صرف ایک پل تھا جسے اس وقت توڑ دیا گیا کارنوالس گڑھیوں پر سے گزر کر جزیرے میں داخل ہونا چاہتا تھا مگر جس کے لیے وہ ٹوٹا ہوا تھا۔

یہ بات ۶۔ فروری ۱۸۹۲ء کی ہے۔

کارنوالس نے جنرل میڈوز، کرنل میکسویل اور کرنل آر تھرسٹون کے ساتھ مل کر کھڑا جائزہ لیا اور اسی شام فوجوں کو حکم دیا گیا کہ شہر پر تین اطراف سے حملہ آور ہوں۔

۱۔ جزیرہ

جنرل میڈوز کو حکم ہوا کہ وہ دو ہزار تین سو سپاہیوں کے ساتھ عید گاہ اور گڑھی لالی پر مارے۔

دستی حصہ میں خود کارنوالس، اسٹوارٹ کے ساتھ سلطان شیو کے کیمپ پر حملہ کرے اور یمن طرف سے ۱۷۰۰۔ سپاہیوں کو لے کر کرنل میکسویل کی گڑھ کی پہاڑیوں پر چڑھے۔ پھر تینوں مل کر دشمن کو پسپا کرتی ہوئی جزیرے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔

اُس رات آٹھ بجے جنرل میڈوز نے حرکت کی۔ وہ اپنے دستے کے ساتھ چلتا ہوا بغیر کسی اجازت کے (یہ کسی قدر حیرت انگیز بات ہے) عید گاہ کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت بھی لڑائی نہ ہوئی اور ایک گولی تک نہ چلی۔

کارنوالس کے منصوبے کے مطابق جنرل میڈوز کو عید گاہ پر حملہ کیے بغیر وہاں سے مشرقی جانب مڑ جانا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ کارنوالس کو یقین دلایا گیا تھا کہ عید گاہ میں موجود سلطان سے بغیر کسی مزاحمت کے جنرل میڈوز کے دستوں کو مشرق کی سمت چلا جانے دیں گے۔

مگر۔

اس منصوبہ کا علم شاید جنرل میڈوز کے ساتھ آنے والے لیفٹیننٹ کرنل ہلٹ کو نہیں تھا۔ ان نے موقع گنونا پلندہ نہ کیا اور گڑھی پر حملہ کر دیا۔

اور یہ بھی شاید اتفاق ہی تھا کہ اس اہم گڑھ کے اندر سید حمید سپہ دار، موسیو ہلی اور کانڈر دگی کو صرف ۳۶۰ سپاہیوں کے ساتھ تعینات کیا گیا تھا۔

سید حمید سپہ دار سلطان کا انتہائی وفادار شخص تھا۔ اس غریب کو بھی دھوکے میں رکھا گیا اور صرف ۳۶۰ سپاہیوں کے ساتھ اس اہم موقع پر بٹھا دیا گیا۔

سید حمید کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس پر اس وقت اچانک حملہ ہو جائے گا۔ حملہ ہوتے ہی وہ تلوار تھینچ کے سینہ سپر ہو گیا۔

ایک طرف سید حمید کے ۳۶۰ اور دوسری طرف جنرل میڈوز کے تیس سو۔ یعنی سپہ دار سید حمید کے ایک سپاہی کے مقابلہ میں جنرل میڈوز کے دس سے زیادہ سپاہی آتے تھے مگر وہ جوانمرد اور اسی نے سپاہی جاننا زنی سے لڑتے رہے اور کٹ کٹ کے گرتے رہے۔ ہزار تک کہ سید حمید نے لڑتے لڑتے جان جان آفری کے سپرد کر دی۔

اس کے مرتے ہی گڑھی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

کے نہیں بلکہ تو پختانہ کے پرے دار ہوں۔
انگریزی فوج کا تیسرا گروہ جس کا سردار کپٹن ہنٹر تھا، وہ دریا پار کر کے یابیوں کے گھریلو
کہ دریا میں پکنک مناتے دریا پار اترا اور دولت باغ کی طرف بڑھا۔ اس کے راستے میں
بھی کوئی رکاوٹ نہ تھی لیکن دروازہ کھلا پانے کے باوجود یہ گروہ دولت باغ میں داخل
نہیں ہوا بلکہ خوف کھا کے اٹھ پیروں واپس چلا گیا۔

اس گروہ والوں کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ دولت باغ میں پھنس کے نہ رہ جائیں
اور دشمنی پھیلنے پر سلطانی توپ خانہ ان کے پرچے نہ اڑا دے۔
جنرل اسٹوارٹ کا دستہ جو کارنوالس کے ساتھ تھا، وہ الگ ہو کر سیدھا گڑھی سلطان
کی طرف بڑھا مگر اسے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ پس وہ گڑھی کے اوپر سے چکر لگا
کر مشرق میں پہنچا جہاں وہ میکسویل سے جاملے۔

کارنوالس ابھی تک اپنے دستوں کے ساتھ گڑھی سلطان کے قریب ٹھہرا ہوا تھا۔ رات
کا ایک پہر باقی تھا کہ سلطانی دستوں کو اس کی موجودگی کا علم ہو گیا اور انہوں نے کارنوالس پر
شدید حملہ کر دیا۔
انگریزی فوج جم کے لڑی۔ کارنوالس کو جنرل میڈوز کی ملک کی امید تھی مگر سامنے سے
ہنٹر واپس آتا دکھائی دیا۔

سلطانی دستوں کا حملہ اس قدر سخت تھا کہ کارنوالس، ہنٹر کی مدد کے باوجود حملہ کی تاب
نہ لاسکا اور مشرق کی طرف پسپا ہو گیا جہاں اسے جنرل میڈوز اور اس کا ناکام دستہ ملا۔ اس
معرکہ میں کارنوالس کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔

اس وقت میکسویل کمری گڑھی کی پہاڑیوں پر قبضہ کر چکا تھا اور سلطانی کیمپ پر حملہ کے لیے
منزب کی طرف بڑھ رہا تھا۔
راستے میں اسے اسٹوارٹ مل گیا جو شکست کھا کر واپس آ رہا تھا۔ ان دونوں نے وہیں
سے دریا پار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسٹوارٹ کا نائب جو ۸۰، ۱۰۰ میں سرنگاٹم میں قید رہ چکا تھا، وہ سب سے پہلے دریا پار
پہنچا۔ اس کے بعد اسٹوارٹ اور میکسویل چلے۔

اس وقت سلطانی توپ خانہ آگ برسانے لگا۔ یہ دونوں بچتے بچتے اور بہترین سپاہیوں

گڑھی عید گاہ پر قبضہ کے بعد اب جنرل میڈوز کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ جزیرے کا
طرف بڑھے یا مشرق کی سمت کارنوالس کے پاس پہنچے۔ آخر اس نے مشرق کا راستہ اختیار
کیا اور کمری گڑھی کی پہاڑیوں پر پہنچ گیا۔
دوسری طرف کارنوالس نے سب سے آگے کرنل نوکس کو چلنے کا حکم دیا۔ اس کے پیچھے
اسٹوارٹ اور خود سب سے پیچھے رہا۔

ان سب نے آگے پیچھے چلتے ہوئے سلطانی فوج کے طلب میں پہنچنے کی کوشش کی یہاں
تھوڑی سی مزاحمت ہوئی مگر انہوں نے سلطانی پرے داروں کو مار بھگا دیا۔ یہ پرے دار جاکر
کے سلطان کے حضور پہنچے اور انگریزوں کے شب خون مارنے کی خبر دی۔
چونکہ یہاں پر ایک معمولی سی جھڑپ ہوئی تھی۔ کچھ آدمی مارے گئے اور کچھ جاکر کھڑے
ہوئے تھے اس لیے کارنوالس کو سلطانی توپ خانے کا خطرہ محسوس ہوا مگر وہ خود یہ دیکھ کر حیران
رہ گیا کہ دریا کے اوپری تنگ اس کی راہ کسی نے نہ روکی۔

اس وقت انگریزی فوج کے رجمنٹ ۵۲، ۱۱ اور ۴ کے کچھ سپاہی دریا پار کر کے
پرانے شہر کے قریب پہنچ گئے اور وہاں دشمن فوج کے ان سپاہیوں نے تنگ تراسی، غدار
ایمان فروشی اور ملک فروشی کا ایک ایسا منظر دیکھا کہ وہ حیران رہ گئے۔
ان کے سامنے شہر کا مشرقی دروازہ ان کے استقبال کے لیے کھلا ہوا تھا۔
یہ ملک فروشی اور غدار کا ایک ایسا بھیاں ملک لمحہ تھا جس کے تصور سے بھی رد نگئے کھٹے
ہو جاتے ہیں۔

اس غلیظ منصوبہ میں سرنگاٹم کے صرف ہندو ہی شریک نہ تھے بلکہ سلطانی فوج اور سلطنت
کے اہم امیروں اور وزیروں نے بھی اس میں بھرپور حصہ لیا تھا۔

رجمنٹ کے سپاہیوں نے شہر کا دروازہ کھلا دیکھا تو پہلے وہ مکرانے پھر اپنے پیچھے
لے گئے والوں کو "سب ٹھیک ہے" یعنی "اوکے" کا سگنل دیدیا۔

کرنل نوکس اپنی رجمنٹ نمبر ۱ اور ۴ کے ساتھ گننام شہر کی طرف بڑھا۔ اسے کوئی
روکنے والا نہ تھا۔ دروازے کے پرے دار نہ معلوم کہاں جا ہوئے تھے یا انہیں ابدی قید
سلا دیا گیا تھا۔

سلطان کا محافظ دستہ شمالی ساحل کی طرف تو بچا نہ کے قریب پہنچا ہوا تھا جیسے وہ سلا

اور کینٹن اسبائلڈ مارا گیا۔

اب سلطان کا بورپی رسالہ آگے بڑھا۔ اس کی کمان دگی کر رہا تھا۔ شام چار بجے کے قریب انگریزوں کا آخری زبردست حملہ ہوا۔

اس دن بھری لڑائی میں سلطان کے ایک سوجوان شہید ہوئے اور انگریزوں کے ۵۲۵ سپاہی مارے گئے اور ۳۴۲ زخمی ہوئے۔

کارنوالس کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا لیکن یہ ضرور ہوا کہ اس کا یہ حملہ مرنگا پٹم کے محاصرے کی صورت اختیار کر گیا تاہم یہ محاصرہ چاروں طرف سے مکمل نہ ہو سکا۔

قلعہ مرنگا پٹم میں اگر ایک طرف مہدی علی خاں ناٹھ جیسے عذار موجود تھے تو دوسری طرف سید غفار اور سید حمید جیسے وفادار بھی تھے جنہوں نے اپنی بہادری سے مرنگا پٹم کی جنگ کی انت تاریخ لکھی۔

وفادار فوجی افسروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ سلطان کو عذاروں اور ایمان فروشوں نے گھیر رکھا ہے اور غلط مشورے دے رہے ہیں اس لیے چھوٹے سردار اور بعض قلعہ داروں نے اپنے طور پر حملہ آوروں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ مرنگا پٹم ایک نامکمل محاصرے میں آچکا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطان وفادار سواروں کا ایک دستہ محاصرہ توڑ کر جنوب کی طرف نکل گیا اور دو دن کا طویل چکر لگانے کے بعد یہ دستہ کارنوالس کے عقب میں پہنچا اور کمری گٹھ پر اتنا اچانک اور زبردست حملہ کیا کہ انگریزی فوج بوکھلا گئی۔ اس میں ایسا انتشار پیدا ہوا کہ سپاہیوں کو افسروں اور افسروں کو سپاہیوں کی کوئی خبر نہ رہی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی فوج افزائیزی اور نفسانسی کے عالم میں محاصرہ اٹھا کر پسا ہو گئی۔

یہ صرف ایک سوار دستہ کا کارنامہ تھا۔

اس کے دو دن بعد کرنل ایبرکروسی مغربی گھاٹ سے چھ ہزار تازہ دم فوج کی کمک لے کر آگیا اور انگریزوں کے اکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے۔

اگلے دن کرنل کروسی اور سلطان کے بڑے بیٹے فتح حیدر کے سوار دستوں میں زبردست معرکہ ہوا اور دن بھر جنگ ہوتی رہی۔

کو گنوانے آخر لالہ بلنگ کے قریب آ پہنچے۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟

اگر اسے ہونا تھا تو بھی اس قدر آسانی سے کیوں ہوا؟

انگریزوں کو جزیرے تک پہنچنے سے کیوں نہ روکا گیا؟

نیز یہ کہ سلطان کو ان باتوں کی خبر کیوں نہ ہوئی؟

ان باتوں سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ سلطان کے گرد سازشوں کا زبردست جال پھیلا دیا گیا تھا جس وقت کارنوالس کی فوج سرنگا پٹم پر تین اطراف سے حملہ آور ہوئی سلطان اس وقت اپنے کیمپ میں دسترخوان پر بیٹھا تھا اور تمام سازشی امرا اس کے گرد جمع تھے۔

سلطان کو انگریزوں کے حملہ کی خبر اس وقت ہوئی جب دشمن دیا پار کے جزیرے پر پہنچ چکا تھا۔

اس وقت سلطان کیا کرتا؟ سوائے اس کے کہ وہ جزیرے میں سمٹ کر قلعہ بند ہو گیا۔ اسے شبہ تو ہو گیا تھا کہ اس کے خلاف بہت بڑی سازش چھٹی ہے مگر وہ مجبور تھا۔ کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اب تک دوست اور دشمن کی شناخت بھی نہ کر سکا تھا۔

سلطان نے بڑی بے چینی کے عالم میں رات کاٹی۔ صبح ہوئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے احمدی رسالے کے دس ہزار جوان سرنگا پٹم سے کورگ کی طرف فرار ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کی فوج مختلف اطراف میں کبھر چکی ہے اور اس کے کئی یورپین ماہرین انگریزوں سے مل گئے ہیں۔ ان حالات میں سلطان کو بہت سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا تھا۔ پس۔

اس نے قلعہ کے ہر مورچے، برج اور فصیل پر پختہ پختہ اور توپیں نصب کرادیں۔

انگریزوں کی طرف سے سب سے پہلا حملہ کینٹن اسبائلڈ نے کیا مگر شکست کھا کر اسے پسپا ہونا پڑا۔

پھر اسبائلڈ کو کمک کے طور پر دو ہزار کا ایک دستہ بھیجا گیا مگر سلطان ہمدردوں نے ان کا جو انفرادی سے مقابلہ کیا اور سوار اپنے گھوڑوں سے اتر کر دست بدست جنگ میں شریک ہو گئے۔

قلعہ بینی کا قلعہ سید غفار تھا۔

جنرل میڈوز نے اپنے طور پر قلعہ پر زبردست حملہ کیا اور وہ اپنی فتح کے لیے بہت پر امید تھا لیکن سید غفار نے اس کے حملہ کا جس جرات اور پامردی سے مقابلہ کیا اس سے اس معز و جنرل کو غور و غریب ہی دیر بعد بھاگنا پڑا۔
دو گھنٹے بعد جنرل میڈوز نے دوسرا حملہ کیا۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ سید غفار کو پسپا ہونا پڑا۔ مگر اس حملے کی اطلاع فاضل خاں اور سید حمید جیسے بہادروں کو پہنچ گئی۔ وہ فوراً لگ لے گئے پیچھے اور جس مقام سے سید غفار پسپا ہوا تھا اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ پھر ایسا جوابی حملہ کیا کہ جنرل میڈوز دو ہزار سپاہی ہٹوانے کے بعد منہ پٹیتا ہوا واپس چلا گیا۔

کارنوالس نے جنگ کا رنگ دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ اس موقع پر جنگ جیتنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اس لیے سلطان سے بہتر سے بہتر شرائط پر صلح کر لی جائے۔
جنرل میڈوز بھی منہ کی کھاکے خاموش ہو گیا تھا۔ لہذا کارنوالس نے سلطان کے خط کا جواب بھجوا دیا جس میں اس نے تجویز پیش کی کہ دونوں طرف کے دیل گفتگو کے ذریعے صلح کی شرائط طے کریں۔
دیکھو کی ملاقات کے لیے کارنوالس نے اپنے خیمے کے قریب ہی ایک مقام خود ہی تجویز کیا۔

وسط جنوری ۱۸۹۲ء میں دیکھل مقررہ مقام پر جمع ہوئے۔ سلطانی سفارت غلام علی سنگھ نے اور علی رضا خاں پر مشتمل تھی جبکہ انگریزوں کی طرف سے سر جان کینو نے وفالت کی۔
حیدر آباد کی طرف سے میر عالم اور مرہٹوں کی وفالت گووند راؤ کال اور باچا جھمبھال نے کی۔

مگر اصل گفتگو کینو سے ہی کرتا رہا۔ صلح کی گفتگو ایک ماہ سے زیادہ دنوں تک ہوتی رہی۔ گفتگو کے دو دور ہوئے اور درمیان میں کچھ وقفہ رہا۔
سلطان تک متحدہ دشمنوں کی شرائط پیش چلی تھیں۔ یہ شرائط انتہائی سخت اور تحقیر آمیز تھیں لیکن سلطان نے سمجھ لیا تھا کہ سازشوں اور غداروں کے اس جال سے بچنے کے لیے اور

فتح حیدر کے سواروں سے ناکام ہونے کے بعد کہ نہ کہ وہی نے قلعہ کی تفصیل پر حملہ کیا مگر اسے اس میں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

غرض کہ انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کا یہ متحدہ لشکر بار بار ناکام ہوتا رہا۔ سلطانی لشکر بڑی بے جگری سے مدافعت میں مصروف تھا اور دشمن کے حملوں کو ناکام بناتا رہا مگر وہ ناکام ہونے کے بعد بھی سرنگا پٹم کے گرد دیا رہنے کھڑے تھے اور خطرہ ہر دم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
اور یہ خطرہ متحدہ لشکر سے زیادہ غداروں کی طرف سے تھا۔

متحدہ فوج کے تینوں سربراہ بھی یہ جانتے تھے کہ سلطان کی ذاتی شجاعت و جرات اور وفادار فوجوں کی کوشش سرنگا پٹم کی دیواروں کو آسانی سے ٹوٹنے نہ دے گی۔

ان کا یہ بھی خیال تھا اور ٹھیک خیال تھا کہ یہ محاصرہ کافی طویل کھینچے گا اور یہ بھرپور ہر مصرعہ جاری رہیں گی۔ اس عرصہ کے لیے کثیر تعداد میں رسد کی ضرورت ہوگی اور کافی جانوں کی قربانی دینا ہوگی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسی ترکیب نکالی جائے کہ مقصد بھی حل ہو جائے اور سلطان کا سر بھی بچکا دیا جائے۔

جہاں تک سلطان کا تعلق تھا تو اس نے بھی یہ اندازہ لگایا تھا کہ اندرونی سازشیں اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ ان کی موجودگی میں تین متحدہ طاقتوں سے جنگ کرنا کوئی عقلمندی نہیں ہے اس لیے مصلحت، وقت اور حالات کا تقاضہ ہے کہ دشمن سے صلح کر لی جائے۔ چنانچہ سلطان نے ایک بار پھر کارنوالس کو صلح کے لیے خط لکھا۔

سلطان کے گزشتہ خطوط کا جواب انگریزوں کی طرف سے یا تو انتہائی تحقیر آمیز اور گستاخانہ دیا جاتا تھا یا پھر انگریز جنرل جواب دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے تھے مگر سلطان کے اس خط نے جیسے کارنوالس کو خوشی کا پیغام دیا اور وہ فوراً صلح پر آمادہ ہو گیا مگر بیچ میں جنرل میڈوز

اس نے صلح کی سخت مخالفت کی۔ کارنوالس نے اسے اونچے نیچے سمجھائی۔ وہ راضی تو ہوا مگر ایک شرط پر۔

جنرل میڈوز نے کارنوالس سے کہا: ”مجھے قلعہ بینی پر حملہ کی اجازت دی جائے۔ اگر میں اس قلعہ پر قبضہ کر لوں تو صلح نہ کی جائے اور اگر ناکام رہوں تو پھر صلح ہو سکتی ہے۔“

ملک کو تباہی سے بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ جو شرائط پیش کی گئی ہیں انہیں خاموشی سے تسلیم کر لیا جائے۔

کارنوالس کی شرائط یہ تھیں:

۱۔ سلطان اپنے اتنے علاقے سے دستبردار ہو جائے جو تین کروڑ روپیہ سالانہ حاصل ادا کرتا ہو۔

۲۔ آٹھ کروڑ روپیہ نقد بطور تادان ادا کیا جائے۔

۳۔ اس رقم کی ادائیگی تک سلطان اپنے دو بیٹے بطور ریغال انگریزوں کے قبضے میں دیدے۔

سلطان کی طرف سے ایک وکیل غلام علی خاں ننگر پور سے مفاد پرست، لالچی اور غدار تھا۔ سلطان نے جو وفد مصر اور ترکی بھیجے تھے ان میں بھی یہ شخص شامل تھا اور اس نے انگریز سفیروں سے رقم لے کر انہیں اپنی سفارت کے مقاصد سے آگاہ کر دیا تھا۔

دوسرے یہ کہ وہاں جو تحائف سلطان کو بھیجے گئے تھے ان میں سے آدھے سے بھی زیادہ یہ بد بخت اپنے گھر لے گیا تھا مگر سلطان نے اسے پھر بھی معاف کر دیا تھا۔ اس سفارت میں بھی اس نے اپنی غدارانہ ذہنیت کا اظہار کیا اور جیسے ہی اس کے سامنے شرائط پیش کی گئیں اس نے فوراً تسلیم کر لیں۔

سلطان کے دوسرے وکیل علی رضا خاں نے ان شرائط کی مخالفت کی اور یہ دلیل پیش کی کہ سلطان خزانہ میں اس قدر رقم موجود نہیں کہ آٹھ کروڑ نقد ادا کیے جا سکیں۔

علی رضا خاں نے اس سلسلے میں پیش کش کی کہ انگریز وکیل یا کوئی اور آدمی خود جا کر خزانہ کی جانچ پڑتال کر سکتا ہے۔

چنانچہ کارنوالس نے ایک معقول وجہ اور پیش کش کے پیش نظر نقد رقم آٹھ کروڑ کے بجائے چھ کروڑ کر دی اور یہ رعایت بھی دی کہ تین کروڑ نقد ادا کیا جائے اور تین کروڑ سالانہ کا علاقہ دے دیا جائے۔

اس موقع پر مرہٹہ وکیلوں نے کینو سے پرزور دیا کہ سلطان سے مصافحہ دربار کے لیے ساٹھ لاکھ روپے کا مرید مطالبہ کیا جائے۔

ہری پنڈت نے اس مطالبے کا یہ جواز پیش کیا کہ ایسے موقعوں پر اس نام سے اُن سول

عہدیداروں کے لیے کچھ رقم وصول کی جاتی ہے جو جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔ آخر علی رضا خاں کے اعتراض پر یہ رقم ۶۰ لاکھ سے گھٹا کر ۲۰ لاکھ کر دی گئی۔

سلطان کو ہر امیر اور وزیر کے دل کا حال بخوبی معلوم تھا۔ پھر بھی اس نے رسماً تمام امرا اور وزرا کو مرزا گاہم کی مسجد میں جمع کیا اور ان کے سامنے اتحادیوں کی پیش کردہ شرائط بیان کیں۔

سلطان نے یہ قدم اس احتیاط کے تحت اٹھایا کہ امرا اور وزراء بعد میں یہ شکوہ نہ کریں کہ صلح نامہ سے قبل انہیں اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ پھر یہ کہ شرائط کے مطابق ایک کروڑ ۶۵ لاکھ فوری طور پر ادا کرنا تھا جبکہ باقی رقم تین تین ماہ کی قسطوں میں ادا کرنا تھی اور ملکی معیشت یہ بار نہیں اٹھا سکتی تھی۔

خزانہ کا حال سب کو معلوم تھا کیونکہ پورنا وزیر خزانہ تھا اور وہ سازشیوں کا ایک اہم رکن تھا۔ چاہے تو یہ تھا کہ اس وقت وہ امیر اور وزیر جو خزانہ لوٹ کر کھا رہے تھے سلطان کی مدد کرتے اور انگریزوں کی طلب کردہ رقم حصہ ڈال کر پوری کر دیتے مگر اس مکتبہ پر توجہ کرنے کے بجائے انہوں نے صلح کی شرائط کو قبول کرنے پر زور دینا شروع کر دیا۔ یہ ان کی غلامی اور خباثت کا کھلا ہوا ثبوت تھا۔

سلطان کے وفادار امرا دم بخود تھے۔ ان کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے۔ ان بے چاروں نے بے ایمانی سے مال بھی نہیں جمع کیا تھا کہ اس وقت سلطان کی مدد کرتے رھو گئے خاموش رہنے کے ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

سلطان کو غداروں کے جواب اور ان کی خواہشوں کا پہلے ہی علم تھا مگر اس نے یہ رسم بھی ادا کر دی۔ اس نے مزید دو روز اور توقف کیا کہ شاید امرا کے تاریک دلوں میں روشنی کی کوئی کرن چھوٹے مگر اللہ تو منافقوں کے دلوں پر تالے ڈال دیتا ہے۔ ان دو دنوں کی تاخیر سے ناواقبت اندیشوں کو اپنے مستقبل کے اندیشے ستانے لگے کہ کہیں ان کے سارے کیے کراٹے پر پانی نہ پھر جائے۔

انہیں سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی بیرونی طاقت سلطان کی مدد کو پہنچ جائے اور وہ اپنے اُن انگریزوں سے وہ مراعات حاصل کرنے سے محروم ہو جائیں جن کے لیے انہوں نے ملت، ملک اور ایمان تک داؤ پر لگا دیے تھے۔

آخر سلطان نے مقتدر امرائے بگڑے ہوئے بتور دیکھ کر زہر کا یہ گھونٹ بھی حلق سے اتار دیا۔ اور اس نے اس ذلت آمیز صلح نامہ پر ۲۳ فروری ۱۷۹۲ء کو دستخط کر دیے۔

جس وقت دستخط شدہ صلح نامہ باہر آتا تو ایمان فروشوں کے چہرے دمک اٹھے اور وفادار امرائے آنکھوں میں اٹھتے ہوئے سیلاب کے بند ٹوٹ گئے۔ وہ اس قدر بھوٹ کر روئے کہ شاہی دربار کے بام و در بھی جیسے روتا اٹھے۔

نہ قلم میں طاقت ہے اور نہ الفاظ میں زور کہ وہ اس دردناک اور رقت انگیز منظر کو بیان کر سکے جب سلطان کے دونوں چھوٹے بیٹوں کو والدین سے جدا کر کے دشمنوں کے ہمان خانہ کی طرف بھیجا جا رہا تھا۔

سلطان کے بڑے صاحبزادے شہزادہ فتح حیدر کی عمر اٹھارہ سال تھی اور اب بطور یرغمال بھیجے جانے والے شہزادوں عبدالغنی اور معزالدین کی عمریں دس اور آٹھ سال تھیں۔ دونوں شہزادے جس وقت ممنا بھری ماں اور شفقت و محبت بھری دادی اور دوسری عزیزہ خوانین سے رخصت ہوئے، اس وقت کا حال نہ تو لکھا جاسکتا ہے اور نہ بیان ہو سکتا ہے اس کے لیے تو صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ گزرا تھا وہ گزری۔ اور اس طرح گزری کہ سبکیوں آہوں، چیخوں اور اشکوں کا ایک سیلاب تھا جس میں محلات شاہی اور ان کے مکین لرزتے اور ہچکولے کھلتے محسوس ہوتے تھے۔

اس کے سوا کچھ اور کہنے کی طاقت نہیں! آپ اس منظر کو مرثیہ تصور کی آنکھوں سے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ وہ قیامت کا سماں تھا یا کہ بلا کا ایک ہلکا سا عکس تھا۔

شہزادہ عبدالغنی اور معزالدین کی رخصتی کے مغرم جلوس کی ترتیب اس طرح تھی کہ سب سے آگے چند اونٹ سوار چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے سات علمبردار مہر پرچم سنبھالے آ رہے تھے۔ ان کے عقب میں ایک سو پادے چاندی کے پترے لیے چل رہے تھے۔ ان کے بعد دو ہاتھی تھے جن پر چاندی کے ہودوں میں ایک ایک شہزادے کی نشست تھی۔ دوسرے ہاتھیوں پر سلطان کے وکیل سوار تھے۔

جب یہ جلوس سلطان اور مصاحبین کے پاس سے گزرا تو گھنٹی بھئی آہوں اور اشکبار آنکھوں نے حاضرین پر موت جیسا سکوت طاری کر دیا۔

یہ خاموش قافلہ یا سلطنت خداداد کے اقتدار کے دو جنازے انگریزی کیمپ کے قریب پہنچے تو مکار کارنوالس نے جس کا سینہ خوشی سے پھٹکا رہا تھا، آگے بڑھ کر بنگال رجمنٹ کی ایک بٹالین کے ساتھ مسکراتے ہوئے شہزادوں کا استقبال کیا۔ جب شہزادوں کو عماریوں سے اتارا گیا تو وہ خود ان کا ہاتھ پکڑ کر خیمے میں لے گیا۔

غدار اور نیک حرام غلام علی خاں لنگرے نے اس وقت کارنوالس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی مسرت بھری مکاری سے کہا:

”یہ دونوں شہزادے آج صبح تک میرے آقا کے بیٹے تھے لیکن میری درخواست ہے کہ اب آپ انہیں شفقت پداری عطا فرمائیے۔“

شہزادے ملل کے کڑتے زیب تن کیے ہوئے تھے اور بڑی سنجیدگی اور منانت سے خود کو اس اجنبی ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

ان کی ذہانت اس بات کی غماز تھی کہ سلطان نے ان کی کس اعلیٰ درجہ کا تہ بیت اور تہذیب کی ہے۔

اس وقت چھوٹا شہزادہ معزالدین باوقار اور خوش گفتار دکھائی دے رہا تھا جبکہ شہزادہ عبدالغنی خاموش خاموش تھا۔

دونوں شہزادے تھوڑی دیر کارنوالس کے خیمے میں رہے۔ پتہ نہیں اس نے ان سے کیا گفتگو کی۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ شہزادوں کو باہر لے آیا اور انہیں عاریوں میں بٹھا کے ان خیموں کی طرف بھیج دیا جو ان کے لیے مخصوص کیے گئے تھے۔

دوسرے دن شہزادوں اور کارنوالس کی ایک اور ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات نسبتاً دوستانہ اور بے تکلفانہ تھی۔ اس ملاقات میں بھی غدار ملک و قوم غلام علی لنگر اموجود تھا۔ غلام علی لنگرے نے شہزادوں اور کارنوالس (جو فارسی کا ایک لفظ نہ جانتا تھا) کو فارسی کے بہت سے چٹکلے اور لطیفے سنائے۔

چھوٹے شہزادے معزالدین نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے خواجہ حافظ شیرازی کی ایک غزل سنائی۔ پھر کلام پاک کے ایک پورے سے سپارے کی تلاوت کی۔ ظاہر ہے

اس وقت شہزادے کے پاس کلام پاک نہیں تھا اور جو کچھ تلاوت کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہزادہ معز الدین آٹھ سال کی عمر میں کلام پاک یا اس کے کچھ حصوں کو حفظ کر چکا تھا۔ غلام علی ننگر سے کہ شہزادے کی یاقوت اور علیت پر بڑی حیرانی ہوئی۔ وہ خود بھی پڑھا لکھا تھا مگر علم انسانی عقل کو جلا ضرور بخشتا ہے اس کی راہیں متعین نہیں کرتا۔ عالم جو راہ چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ غلام علی ننگر اگر اہل ہو گیا تھا اور وطن فروشی اور نمک حرامی کے راستے پر چل پڑا تھا۔

دو شہزادے بطور برغال انگریزوں کی تحویل میں پہنچ چکے تھے۔

اس کے فوراً بعد سلطان نے ایک کروڑ ۶۵ لاکھ کی پہلی قسط بھی ادا کر دی تھی۔ اب سوال انگریزوں کو سلطنت خداداد کا اتنا علاقہ دینا تھا جو سالانہ تین کروڑ حاصل ادا کرتا ہو۔ سلطان نے اپنے طور پر اندازہ لگایا تو معلوم ہوا کہ اتنی رقم تو اس کی نصف سلطنت بھی مشکل سے ادا کر سکے گی، یعنی سلطان کو اپنی آدھی سلطنت انگریزوں کے حوالے کرنا پڑے گی۔

اس معاملہ پر جب گفتگو شروع ہوئی تو اس میں ایک ہینہ لگ گیا۔

آخر شرائط کے مطابق سلطنت خداداد کو تقسیم کیا گیا۔

بارہ محل، سلیم، انورا نکری، سنگی درگ، ڈنڈیگل اور کالی کٹ کے علاقے انگریزوں کو دیے گئے۔

دریاٹے تنگ بھدرا کا شمالی علاقہ مرہٹوں کے پاس گیا۔

اور تار پتری، پارسری، بلاری وغیرہ نظام کے حوالے کیے گئے۔

قسط کی ادائیگی اور سلطنت کی تقسیم کے بعد انگریزوں کا پتہ بھاری ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس ذلیل قوم کی فطری طبیعت میں ایک بار پھر فتور آ گیا۔

سلطان نے صلح نامے کی شرط کے مطابق محاصرہ اٹھانے کا مطالبہ کیا۔ سلطان کے دیکر نے کارنوالس کے سامنے جب یہ مطالبہ پیش کیا تو اس "دیانت دار" شخص نے بڑی ہی بے نرمی سے جواب دیا:

کورگ کا علاقہ بھی ہمیں دیا جائے۔ تب محاصرہ اٹھانے کا سوال پیدا ہوگا۔ صلح نامے میں یہ شرط ضرور نہیں تھی سلطان کا وکیل حیران رہ گیا۔ اس نے جواب دیئے کے بجائے یہ نیا مطالبہ واپس جا کر سلطان کے سامنے رکھ دیا۔ سلطان کو انگریزوں کی ذہنیت پر بڑا افسوس ہوا۔ اس نے وکیل ہی کے ذریعے کارنوالس کو پیغام بھیجا:

"اس نئے مطالبے کا جواز سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کی وضاحت کی جاوے کہ جب تک شہزادے اور تاوان کی رقم نہیں پہنچی تھی اس

علاقہ کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ اب ایسا کیوں کیا جا رہا ہے؟"

مگر سلطان کا احتجاج بیکار ثابت ہوا۔ کارنوالس کو یقین تھا کہ شہزادوں کی خاطر سلطان دوبارہ جنگ سے باز رہے گا۔

آخر سلطان کو کورگ بھی انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا۔ اسے کہتے ہیں زبردست کاہنہ سر پر یاز بردست مارے اور رونے لگی نہ دے!

سلطان نے کورگ کے مسئلے میں اس لیے بات آگے نہیں بڑھائی کہ یہ علاقہ اگرچہ سلطنت خداداد سے قریب اور انگریزوں کی عمارتوں سے دور تھا مگر دیاں ہمیشہ سازشیں اور فتنے پیدا ہوتے رہتے تھے اور سلطان کو ان کی سرکوبی کے لیے تعزیری میں بھیجنا پڑتی تھیں۔

کورگ کے بالا بار سے متصل ہونے کی وجہ سے انگریزوں کی نظر میں بہت پہلے سے اس پر لگی ہوئی تھیں۔

کورگ بالا گھاٹ کے اوپر ایک جگہ واقع تھا جہاں سے سلطنت خداداد کا دارالسلطنت اور دوسرے علاقے اس کی زد میں آجاتے تھے اور اسی لیے انگریز کورگ پر مدت سے دانت لگائے بیٹھے تھے۔

کارنوالس نے سلطان سے کورگ کے مطالبہ کی ذلیل حرکت پر نہ کی بلکہ اس نے اپنی جگہ دے دیا مگر اس نے کورگ حوالے نہ کیا تو دوبارہ جنگ شروع ہو کر دی جاوے گی۔ چنانچہ سلطان نے دستخط شدہ کاغذات لے کر جن میں کورگ کی شمولیت بھی تحریر کر دی گئی تھی کارنوالس کو بھجوا دیے۔

کارنوالس نے اپنی کیبگی کا ایک اور مظاہرہ کیا۔

اس نے شہزادوں کو ذلیل کرنے کے لیے ان سے کہا کہ اس معاہدہ کی وہ اپنے ہاتھ سے دو نقلیں کر کے ایک نظام کے وکیل اور دوسری مرہٹہ وکیل کو دیں۔ شاہی خون جوش میں آ گیا۔

شہزادوں نے معاہدہ اٹھا کر پھینک دیا اور اس کی نقل کرنے سے صاف انکار کیا۔ شہزادوں کو برہم دیکھ کر کارنوالس گھبرا گیا۔ اور اس نے سوچا کہ ایسا نہ ہو، لینے کے دینے پڑ جائیں۔ سو اس نے معاہدے کی نقلیں خود ہی اتروائیں اور اپنے حلیفوں کو بھجوا دیں۔ سلطان کی اس شکست اور ذلت آمیز صلح نامے پر دستخط پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نہیں، کئی ہندو مؤرخین کہتے ہیں:

سلطنتِ خداداد کا، کارنوالس کے ہاتھوں بالکل خاتمہ ہو جاتا۔ جس شخص نے اس کو بھایا وہ نانا فرزوں سے تھا جو پیشوائے پونا کا وزیر اعظم تھا۔ اس کی دور بین نظر میں دیکھ رہی تھیں کہ کس طرح انگریز ملک پر حاوی ہو رہے ہیں۔

ہندو مؤرخین کے اس طرح کے بیانات کو سوائے ”بڑے پھیپھوں پھوٹنے“ کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا اور یہ مسلمانوں پر خواہ مخواہ زبانی اہسان جتانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ دراصل سلطان کی بڑھتی ہوئی طاقت مرہٹوں کے لیے فنا کا پیغام بن گئی تھی۔ اس نے انگریزوں سے اتحاد اسی لیے کیا تھا کہ سلطنتِ خداداد کا خاتمہ کر دیا جاسکے۔

نانا فرزوں نے تو عجب وطن تھا اور نہ دور اندیش۔ اس نے سلطنتِ خداداد کا خاتمہ کرنے کے لیے ہر امکانی کوشش کی تھی۔ سلطان کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیتے ہوئے وہ یہ بھول گیا تھا کہ ان انگریزوں نے نارائن راؤ اور رگھو باکو کو کس طرح لڑا دیا تھا۔ اس کو یہ یاد نہ آیا کہ انگریزوں نے بنگال کے نواب مرہاج الدولہ کو کن سازشوں کا نشانہ بنا کر ختم کیا تھا۔ یہاں جنوبی ہند میں بھی اسی کارنوالس نے والا جاہ نواب محمد علی کو کرناٹک سے کس طرح بے دخل کر رکھا تھا۔

کرناٹک کا پورا لشکر انگریز کمانڈروں کے ماتحت تھا اور حکومت کا انتظام و انصرام بھی انگریز ہی کرتے تھے اور نواب ان کی رڈٹیوں پر بڑا تھا۔ اس صلح نامے کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی تھا کہ یہ جنگ رٹاؤنکر کے راجہ کے نام پر

شروع ہوئی تھی مگر اس صلح نامے میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا۔ بلکہ مدراس واپسی پر اٹا انگریزوں نے راجہ سے جنگ کے افواہات کی بد میں نصف ماحصل طلب کر لیے تھے۔ جس وقت اس صلح نامے کی خبر انگلستان پہنچی تو مسٹر نکسن نے واضح الفاظ میں پارلیمنٹ میں کہا:

”کارنوالس نے لیٹروں کا ایک جتھا تیار کیا ہے اور اس کے ذریعے وہ حقداروں کا حق لوٹ رہا ہے۔“

برطانوی عوام نے یہ محسوس کیا تھا کہ سلطان نے اپنا کردار بڑی بہادری سے ادا کیا ہے اور کارنوالس کا سلطان کے بچوں کو ریخمال بنا کر رکھنا ایک غیر انسانی فعل ہے۔ یہاں تک کہ مدراس کے گورنر کے ایڈیٹر نے ”سلطان سے معافی“ کے عنوان سے ایک ادارہ بھی سکھا جس میں انگریز قوم کے سلطان کے ساتھ اس سلوک کو سلطان کی برسرِ عام توہین قرار دیا گیا۔ انگلستان کی بد احساس پارلیمنٹ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس نے کارنوالس کی اس رقی حرکت کو ایک کارنامہ قرار دیتے ہوئے اس کا رتبہ بڑھا دیا اور اسے ”مارکوئیس“ کا خطاب دیا گیا۔

کارنوالس کا میرمنشی جو اس جنگ میں شریک تھا اپنی تاریخ میں کارنوالس کی حکمت عملی کے متعلق لکھا ہے:

”جب ہماری (انگریزوں کی) فوج موضع کرار میں تھی اس دن عزم کا چاند نظر آیا۔ کارنوالس نے عشرہ محرم کے دوران دس دن تک کیپ ڈالنے کا حکم دیا کیونکہ ہندوستان کے تمام سپاہی محرم کی دس تاریخ تک ردپ اور سوانگ بھر کر تعزیر اور علم بنا کر دنگل وغیرہ قائم کرتے ہیں۔“

اس قسم کی تمام رسومات سلطنتِ خداداد میں سلطان کے حکم سے بد کر دی گئی تھیں۔ کارنوالس نے ان رسومات کو جاری کر دیا اور سپاہیوں کو دس دن کی چھٹی دیدی کہ محرم منائیں۔ اس کے ساتھ ہی کارنوالس نے حکم دیا کہ سوانگ بھرنے والے اس کے خیمے کے سامنے سے گزریں کیونکہ وہ انہیں دیکھنا چاہتا ہے

اقت تک پہنچے ہوئے ہیں جب تک انگریزوں کو سلطان کا خطرہ ہے ورنہ سلطان کے انگریز ہیں کب چھوڑیں گے۔

اور آئندہ چل کے ان کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا نہ صرف نظام ہمیشہ کے لیے انگریزوں کا ہو گیا بلکہ مرہٹوں کا وجود بھی انگریزوں کے رحم و کرم پر رہ گیا۔

کارنوالس تو چاہتا تھا کہ سلطان کی طاقت کو پورے طور سے ختم کر دیا جائے مگر حالات اسے صلح کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے میسوری رائیوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ سلطان سے منت چھین کے ان کے حوالے کر دے گا لیکن کسی وقت وہ یہ سوچ کے گھبرا اٹھا کہ کہیں نہ ہو کہ ان کے جانشین سلطان سے بھی زیادہ خطرناک نکلیں۔

شہزادہ عبداللہی اور شہزادہ معزالدین مدد اس پہنچ چکے تھے۔ ان کے اتالیق علی رضا خاں میر غلام علی خاں مقرر کیے گئے تھے۔ کرنل ڈیوٹن کو شہزادوں کی میزبانی کے فرائض سونپے گئے۔ شہزادوں کے عزیزوں اور ملازمین کو ان سے ملنے کی اجازت تھی۔

ایک روایت کے مطابق والا جاہ محمد علی برائے نام حکمران کرناٹک نے انگریزوں سے مارش کی تھی کہ شہزادوں کی عزت و وقار آرام و آسائش اور کسی حد تک ناز برداریوں کا خیال رکھا جائے۔

ان شہزادوں کی داپسی اب باقی افساط کی ادائیگی پر منحصر تھی مگر جس طور سلطنت کے حصے بنے ہوئے تھے اور تباہی مچی تھی اس کے بعد اتنی بھاری قسطوں کا ادا کرنا دشوار نظر آتا تھا۔ لاکھوں کے لیے بڑی جرات، ہمت اور جفاکشی کی ضرورت تھی لیکن حوصلہ مند سلطان جس کے بلوں کو اس وقت بھی مفاد پرست اور نمک حرام گھن کی طرح چاٹ رہے تھے اس نے ہمت مردانہ سے تمام مشکلات پر نہ صرف قابو پایا بلکہ اس کا وقار بھی دوبارہ بحال ہو گیا اور انگریزوں کی بقیہ افساط ادا کرنے کے قابل ہو گیا۔

اسی دوران یورپ میں انگلستان اور فرانس کے درمیان جنگ پھڑک اٹھی۔ چنانچہ اس کا اثر یورپی ممالک میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مقبوضات پر بھی پڑا۔ انگریزوں نے فرانس سے زیادہ مضبوط مرکز پر قبضہ کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

اور اسے اپنی سعادت سمجھتا ہے۔

چنانچہ سات محرم سے دس محرم تک علم، تعزیے اور سوانگ بھرنے والے لوگ کارنوالس کے خیمے کے سامنے سے گزرتے رہے۔

کارنوالس خیمے کے باہر کرسی پر بیٹھ جاتا اور جب کوئی علم یا تعزیہ نظر آتا تو وہ اس کے احترام میں کھڑا ہو جاتا اور دو تین قدم پیچھے ہٹ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ پھر جب علم یا تعزیہ آگے بڑھنے لگتا تو کارنوالس اپنے سیکرٹری مٹر جری کو حکم دیتا کہ نذر گزاری جائے اسی وقت چاندی کے طباق میں روپے رکھ کر نذر دی جاتی۔

کارنوالس تین دن تک یہ مکاری کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں طرف یہ خبر پھیل گئی کہ جن انگریزوں کو کافر کہا جاتا ہے وہ حسن سلوک اور اعتقاد میں مسلمان بادشاہوں سے اچھے ہیں۔

کارنوالس نے درگاہوں پر پیروں کو نذرانے لینے کی پھر سے اجازت دے دی۔

اتحادیوں کا مقصد پورا ہو گیا تھا اس لیے کارنوالس نے سرنگا پٹم میں مزید قیام مناسب سمجھا کیونکہ خشک مصالحوں سے تیار کردہ سامان بے کار ہو چکا تھا۔ بیکار پڑے رہنے والے فوجیوں میں طرح طرح کی بیماریاں پھیل گئی تھیں۔ پس کارنوالس نے شہزادوں کو کرناٹک کی طرف روانہ کر دیا اور محاصرہ اٹھا کر روانگی کے لیے سامان باندھا جانے لگا۔

اپریل مہینے آغاز میں اتحادی سرنگا پٹم چھوڑ کے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس طرح رخصت ہوئے جیسے ان میں باہم کوئی اتحاد کبھی تھا ہی نہیں اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ انہوں نے یہ اتحاد تو سلطان کی طاقت کو کم کرنے کے لیے کیا تھا۔ سوائے کارنوالس کے انھوں نے یہ نہیں چاہا تھا کہ سلطان کی طاقت کو کم کر دیا جائے۔ جس طرح انہیں سلطان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے یہ خطرہ تھا کہ یہ آتش فشاں انہیں جلا کر خاک نہ کر دے اسی طرح انہیں بھی خوب جانتے تھے کہ انگریز بھی سلطان سے کم طاقتور نہیں اور وہ انگریزوں کے شہ

جب باپ بیٹوں کا سامنا ہوا تو دونوں طرف خاموشی طاری تھی صرف آنکھیں غناک تھیں۔ نہ بات نہ سکوت تھا۔

شہزادوں نے جھک کر اپنے ذی شان باپ کے قدم چھوئے اور باپ نے محبت سے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا مگر صبر و استقلال کا یہ عالم تھا کہ کیا مجال جو باپ یا بیٹوں کی آنکھوں سے ایک لہر اشک بھی پڑ سکا ہو۔

شہزادوں کی آمد کی خوشی میں ایک جشن طرب منعقد ہوا۔ اس جشن میں سلطان نے امور مملکت کو ننانوے (۹۹) عکوں میں تقسیم کیا اور ہر عہدہ کا نام اسم الہی پر رکھا مثلاً رحمان کچہری، ہم کچہری، ستار کچہری، غفار کچہری وغیرہ۔

سلطان نے تمام سرداروں پر نوازشات خیرہ و انہ کیوں اور سید غفار کو میر میران اول کا خطاب دیا گیا۔

سلطان اگرچہ اہل ناٹھ سے خوش نہ تھا مگر اس نے ان کے دلداری کے لیے پھر بھی ان کے لمبی لوگوں کو اور سیدزادوں کو میر میران کے خطاب عطا کیے۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ سید غفار وہی جوان فرد ہے جس کے سپرد "قلعہ بینی" کی حفاظت کی گئی تھی۔ جب انگریز اپنی تمام تر کوشش کے باوجود سلطان کو شکست نہ دے سکے اور صلح پر مجبور ہو گئے تو جنرل میڈوز نے اس صلح کی شدید مخالفت کی تھی۔

کارنوالس نے میڈوز کو سمجھایا تھا کہ اس وقت سلطان کو شکست دے کر سرنگاپٹم پر قبضہ کرنا قطعی ناممکن ہے مگر میڈوز کسی طرح نہ مانتا تھا۔ آخر اس نے یہ شرط رکھی کہ اسے قلعہ بینی پر حملہ کی اجازت دی جائے۔ اگر وہ قلعہ بینی پر قبضہ کر لے تو جنگ جاری رکھی جائے اور اگر وہ ناکام رہے تو صلح کر لی جائے۔

کارنوالس نے مجبور ہو کر میڈوز کو قلعہ بینی پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی چنانچہ اس نے قلعہ بینی پر شدید حملہ کیا۔

مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ قلعہ کا محافظ سید غفار ہے۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں میڈوز کے حملہ کو ناکام بنادیا اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

میڈوز نے اس ناکامی کے بعد فوراً ہی سنبھل کر دوبارہ حملہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے دو ہزار سپاہیوں کی بھینٹ دے کر شرمندہ ہو کر واپس آنا پڑا۔ سلطان نے سید غفار کی سنی

کارنوالس ان دنوں لکھنؤ میں تھا۔ وہ فوراً مدراس آیا۔ یہاں پہنچ کے اس نے کرنل دلائی کو خوشنکی کے ذریعے اور اپنے بھائی کوڈور کارنوالس کو سمندر کے راستے پانڈچہری پر حملہ غرض سے روانہ کیا۔ پھر وہ خود اگست ۱۸۹۳ء میں انگلستان چلا گیا۔

کارنوالس کے انگلستان جانے سے پہلے اس کی جانشینی کا مسئلہ اٹھا جسے کارنوالس نے خود اس طرح طے کر دیا تھا کہ اس نے اپنی جگہ جنرل میڈوز کو نامزد کر دیا مگر جنرل میڈوز اس کی پالیسیوں کے خلاف تھا۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ میڈوز نے صلح نامے پر دستخط کے موقع پر ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے خود کشی کی کوشش بھی کی تھی۔ اب پتہ نہیں یہ واقعی احتجاجاً خودکشی تھی یا محض ایک ڈھونگ۔ کیونکہ بیان یہ کیا گیا ہے کہ گولی اس نے سر میں مارنے کی کوشش کی مگر وہ پیٹ کے پار ہو گئی۔

یہ بات کسی طرح بھی قابل یقین نہیں!

کارنوالس اپنے جانے سے پہلے سلطان کی اشک، شوقی کے لیے اس کے بیٹوں کو واپس کر دینا چاہتا تھا لیکن نظام دکن کے ساتھ چند وہیات کی ملکیت کا جھگڑا کھڑا ہو گیا اس لیے شہزادوں کی واپسی کا معاملہ معطل ہو گیا اور یہ کام اس کے جانے کے بعد ہوا۔

سلطان کے دونوں بیٹے عبدالغنی اور شہزادہ معز الدین اگرچہ مدراس میں بہت آرام سے تھے مگر انہیں اس سونے کے بچے میں بند ہوئے دو سال کا عرصہ ہو رہا تھا اور وہ اپنے والدین اور دیگر اعزہ سے ملنے کے لیے بہت بے چین بلکہ پریشان ہو رہے تھے۔

آخر مارچ ۱۸۹۴ء میں کارنوالس کے جانشین سر جان شور نے انہیں مدراس سے جانے کی اجازت دے دی۔

شہزادے اپنے میزبان ڈیوٹن اور دونوں اتالیقیوں علی رضا خاں اور غلام علی خاں ننگر کے ہمراہ مدھاس سے میسور کی طرف روانہ ہوئے۔

شہزادوں کی روانگی ۱۸ مارچ ۱۸۹۴ء کو ہوئی اور یہ مختصر قافلہ بارہ دن کے بعد مدھاس پہنچا تھا۔

سلطان اس وقت اپنے پیدائشی شہر دیوبند میں مقیم تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شہزادوں کا استقبال کیا۔ یہ ایک غناک خوشی کا موقع تھا۔

ہمدردی کے اعتراف میں اسے "میر میران اول" کا خطاب دیا تھا۔

پہلے بنایا جا چکا ہے کہ سلطان نے ایک شاہی تخت تیار کر لیا تھا اس کا نام "تخت ہما" رکھا گیا تھا۔ چونکہ سلطان خود شیر تھا۔ اسے شیروں سے اس قدر لگاؤ تھا کہ زور آسانی کے لیے اس نے شیر پال رکھے تھے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے سلطان نے اس تخت کو شیروں کے پاؤں پر رکھا تھا۔

اسے اس تخت پر بیٹھنے کی بڑی آرزو تھی لیکن اس تخت پر جلوس کے لیے ایک خاص رسم ادا کی جاتی تھی جس کا نام "ٹیکہ" تھا۔

"ٹیکہ" کی رسم مغلیہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں رائج ہوئی تھی جب اکبر نے تمام راجپوت راجاؤں کو شکست دے کر تخت شاہی پر جلوس کیا تھا تو اودے پور کے راجہ جسونت راؤ کی بیٹی "ٹیکہ" لے کر آئی تھی اور اس نے اکبر کے ملحقے پر ٹیکہ لگایا تھا۔

اس وقت سے خاندان و سلطنت مغلیہ میں رسم پڑ گئی تھی کہ جب کوئی بادشاہ تخت نشین ہوتا تو اودے پور کی راجکاری اس کے ٹیکہ لگانے آیا کرتی تھی۔

سلطان بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کے جلوس کے موقع پر کسی ہندو راجہ کی بیٹی اس کے ٹیکہ لگائے۔

چنانچہ اس نے اس سلسلہ میں "کچھ کے راجہ" کو کچی لاکھ کے تحفے تحائف بھیج کر اس پر راضی کیا تھا کہ اس کی لڑکی سلطان کو ٹیکہ لگانے آئے گی لیکن مسلسل جنگوں نے سلطان کو اتنا سکون ہی نہ لینے دیا کہ وہ اس رسم کو ادا کر کے "تخت ہما" پر جلوس نہ لگائے۔

۱۷۹۵ء میں سلطان نے جدید زمان سے تیسری شادی کی۔

خوشی کے اس موقع پر سلطان نے ایک دسترخوان عام بچپوایا ادا اس پر ہر چھوٹے بڑے کو بٹھایا گیا۔

سلطان نے ان سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بعد میں اس نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں اس نے کہا:

"اسلام نے ایک مسلمان کو دوسرے کا بھائی بنایا ہے اس لیے

چھوٹے بڑے کے امتیاز کو دل سے نکال دو۔ قبیلہ اور خاندان کے کمتر اور بہتر ہونے کے فرق کو مٹا دو۔ سب مل کر رہو اور خلا پر بھر دے رکھو۔

سب مل کے کافروں کے خلاف جہاد کرو اور شہادت کے لیے ہر دم تیار رہو۔

پھر سلطان نے تمام حاضرین میں خلعتیں تقسیم کیں۔ یہ تمام خلعتیں ایک کپڑے اور ایک ہی ڈیزائن کی بنی ہوئی تھیں۔ سب کا رنگ سرخ تھا۔ خلعتوں کی تقسیم کے بعد سلطان نے کہا:

"ان خلعتوں کو شہادت کا لباس سمجھو۔"

اس سے اگلے سال سلطان نے اپنے ایک بیٹے شہزادہ محمد الدین کی شادی محمد علی عرف جوج میاں کی بیٹی سے کی اور محمد الدین کی بڑی بہن کو جوج میاں کے بیٹے سے بیاہ دیا۔

اسی سال ایران کا شہزادہ جو سلطان کا مہمان تھا، اپنے ملک واپس گیا۔

اس ایرانی شہزادے کا قصہ یہ تھا کہ عالم غربت میں سلطان کے پاس سرنگا چم پہنچا سلطان نے اسے بڑے احترام سے ایک شاہی مہمان کی حیثیت دے کر اپنے پاس رکھا۔ اس کے رہنے کے لیے ایک حویلی دی اور نوکر چاکر مقرر کیے اور شہزادے کا دس ہزار روپے ماہانہ وظیفہ بھی جاری کیا۔ کئی سال تک سلطان کے پاس مہمان رہنے کے بعد اب وہ ایران اپنے ملک واپس جا رہا تھا۔

سلطان نے شہزادے کو عزت سے رخصت کیا اور فرمایا:

"شہزادے۔ آپ ایران پہنچ کے پہلے اپنی سلطنت کے معاملات درست کریں۔ پھر ہم آپ اور زماں شاہ والی کابل مل کر ہند اور دکن کے نظم و نسق کی طرف توجہ دیں گے۔"



صلح کے بعد انگلینڈ، مرہٹے اور نظام اپنی فوجوں کے ساتھ سرنگا چم سے رخصت ہو گئے مگر سلطان کی عزت اور وقار کو اس قدر داغدار کر گئے کہ عوام کے دلوں سے شاہ کی عزت و حریت

رخسنت ہو گئی۔ وہ اب سلطان کو ایک شکست خوردہ بادشاہ سے زیادہ درجہ نہ دیتے تھے مگر سلطان نے بے عزتی، بدنامی اور شکست کے اس داغ کو اپنی تقدیر نہیں بنایا بلکہ ایک نئے عزم کے ساتھ ملک کے استحکام میں لگ گیا۔

اب اسی کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ کسی طرح اتنی طاقت حاصل کر لے کہ انگریزوں سے اس ذلت کا انتقام لے سکے اور سلطنت کو پہلے جیسی سر بلندی اور سرخروئی کے درجہ پہ پہنچا دے۔

سلطان نے اپنی شکست کے اسباب معلوم کرنے کے لیے ایک فوجی کمیشن مقرر کیا مگر انگریزوں نے اپنی مصلحت کی بنا پر اس کمیشن کے کام میں طرح طرح کے روٹے بٹھوائے اور اسے کسی نتیجہ پر نہ پہنچنے دیا۔ بہر حال سلطان کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے آ گئی کہ اس ذلت آمیز شکست کے لیے سلطنت کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا افسر انگریزوں کے ساتھ سازش میں شریک تھا۔ سلطان کے ہمدرد اور وفادار یا تو لڑتے لڑتے شہید ہو گئے تھے یا پھر دربار پر سازشیوں کا دور دورہ دیکھ کر خاموشی سے اگک ہو گئے تھے۔

ان حالات میں سلطان کسی کو مزا نہیں دے سکتا تھا کہ ہر دوسرا آدمی چور، مفاد پرست یا غدار تھا۔

پس سلطان نے اس وقت وہی کیا جو اس کے بس میں تھا۔ اس نے تمام مسلمان

وزیروں اور افسروں کو مسجدِ اقصیٰ میں جمع کیا اور کہا:

”یہ سلطنتِ خداوندی خاص میری نہیں بلکہ عوام کی ہے۔ اس کی بقا

مسلمانوں کی بقا اور اس کی آزادی مسلمانوں کی آزادی ہے۔

ہم سے نادانی میں جو کچھ ہوا اس پر خاک ڈالو اور بھول جاؤ اور

اب نئے سرے سے اس کی سر بلندی کا عہد کرو۔“

اس کے بعد سلطان نے ہر ایک سے حلف اٹھوایا اور سب نے حلف اٹھایا۔ سلطان کے مسلمان افسروں خاص کر میر صادق نے اس وقت جس قسم کا عہد اور حلف اٹھایا تھا، اس عہد اور حلف

یہ وہی مسجد ہے جسے سلطان نے اس وعدے کے مطابق تعمیر کرایا تھا جو اسی نے یمن میں ایک درویش سے کیا تھا۔

کی ایک نقل کتاب نارٹن میسور کے صفحہ ۷۲ پر دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ عہد نامہ اس طرح لکھا ہوا ہے:

عہد نامہ میر صادق

میں میر صادق نیک خوار ملازم سلطنتِ خدا داد اپنے پروردگار اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور کلام اللہ کو حاضر ناظر اور شاہد سمجھ کر اور خدا کی قسم کھاتے ہوئے صدقِ دل سے اقرار کرتا ہوں کہ میں نہایت وفاداری سے اپنے آقا سلطان کی اطاعت کروں گا اور اس کے حکم کو ہر چیز پر مقدم رکھوں گا۔ میرا دل کبھی اس کی اطاعت سے منحرف نہ ہو گا۔ میری زبان اس کے خلاف کبھی ایک لفظ نہیں کہے گی۔ میری آنکھ اس کی بھائی نہ دیکھ سکے گی۔ میرے کان کبھی اس کے خلاف نہ سن سکیں گے۔ میرے ہاتھ ہمیشہ اس کی برتری اور بھلائی کے لیے کوشاں رہیں گے۔

اور میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ اس کے خلاف میں جو کچھ دیکھوں گا یا سنوں گا تو اسی وقت حضوری میں بیان کر دوں گا۔

اگر مجھ سے خلا غماستہ ان مذکورہ بالا شرائط کی کبھی خلاف ورزی ہو جائے یا میری اطاعت میں فرق آجائے تو میں خدا سے برتر اور توانا کو جس کا دوسرا نام منتقم بھی ہے، حاضر و ناظر سمجھ کے کہتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے غضب میں پکڑے اور مجھے تباہ کر دے۔“

میر صادق کے اس عہد نامے پر صاحب ”نشانِ حیدری“ نے کیا خوب تبصرہ فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”لیکن وہ تو دور ہی پلٹ چکا تھا اور وہ سیاہ دل، قوی زندگی آزادی یا شہادت کو کیا جانتے تھے اس لیے سب زمانہ سازی کی باتیں کر کے واپس ہو گئے اور جو سپے، دیندار اور بچے وفادار تھے ان سے سلطان کو کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔“

مگر جاں نثار لوگ باقی کہاں تھے؟

دہ یاز شہادت کے درجہ پر فائز ہو چکے تھے یا دربار پر منکح اموں کا قبضہ دیکھ کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

سلطان کو ہر شخص پر اعتماد تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زمانہ نے سلطان کو ہر شخص پر اعتماد کرنے کا سبق سکھایا تھا کیونکہ مصلحت ہی یہی تھی۔ اس لیے سلطان نے اطمینان کا سانس لیا اور دوسرے امور سلطنت میں مشغول ہو گیا۔

سلطان نے اسباب شکست کے لیے جو کمیشی مقرر کیا تھا اس کو ذیل کرنے کے لیے انگریزوں نے اپنے گروں کے ذریعے اڑی چوٹی کا زور لگایا اور اس کی کارکردگی اگرچہ ناقص ہو کر رہ گئی اس لیے کہ ہر امیر مجرم تھا مگر اس کے خلاف کوئی شہادت نہ ملتی تھی۔ پھر بھی سلطان کے وزیر میر ہمدی خاں ہمدی ناٹھ گرفت میں آ گئے۔

ان پر یہ الزام ثابت ہو گیا کہ میسوری تیسری جنگ کے دوران میر ہمدی ناٹھ نے چند کرناٹکی ساہوکاروں اور دوسرے نمک حراموں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے سازش کی اور نظم و نسق کے تمام شعبوں میں ابتری پیدا کی۔

میر ہمدی ناٹھ پر یہ الزام بھی ثابت ہو گیا کہ اس نے سرنگا پٹم پر حملہ کے وقت سلطانی فوج کو ادھر ادھر منتشر کر دیا تھا۔ قلعوں کے دروازے کھلوا دیے تھے اور انگریزوں کو بے دھڑک گڑھیوں تک پہنچنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ عین لڑائی کے وقت ۶۹ توپوں کو مٹی اور ریت سے بھر دیا کہ بیکار کر دیا تھا۔

چنانچہ جتنے اشخاص بھی مجرم ثابت ہوئے انہیں سلطان کے حکم سے کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔

سلطان ٹیپو کو دورانہ لیش کہا جاتا ہے اور یہ ٹیپو بھی ہے کیونکہ اس نے ایران، ترکی، افغانستان اور دوسری مسلم سلطنتوں کی مدد سے ہند میں ایک عظیم مسلم مملکت بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن اس نے اپنے گرد موجود نمک حراموں کو اور غداروں کو مناسب مزانہ دے کر ان کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ میر ہمدی خاں ناٹھ کا جرم ثابت ہو گیا تھا مگر

اسے ٹوٹی پر چڑھانے کے بجائے صرف برطرف کیا گیا۔

پورنیا اور میر صادق پر قری شبہ ہونے کے باوجود انہیں ان کے عہدوں سے نہیں ہٹایا گیا اور پورنیا کو وزارت مال اور میر صادق کو دیوان یعنی وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رکھا گیا۔

سلطان کو فی الحال انگریزوں، مرہٹوں اور نظام سے کوئی خطرہ نہ تھا اس لیے اس نے اندرونی غداروں سے نمٹنے کے لیے فوجی معین روانہ کرنا شروع کیے۔

انہی دنوں بعض جاسوسوں نے اطلاع دی کہ شمالی علاقوں کے پالیگار بغاوت پر آمادہ ہیں۔ ایک شخص نے سپانائیک کا رشتہ دار ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس نے چار ہزار پیادے فراہم کر کے ہو جٹی درگ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے اور اب ہر پہلی پر دانت لگائے ہوئے ہے۔

اس اطلاع پر سلطان نے قمر الدین کو بھاری جمعیت کے ساتھ بغاوت فرو کرنے بھیجا۔ قمر الدین لشکر لے کر ہو جٹی درگ پہنچا اور قلعہ کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔ یہ سخت محاصرہ سات ماہ تک جاری رہا۔ پھر جب قلعہ پر قمر الدین کا قبضہ ہو گیا تو اس نے تمام باغیوں اور غداروں کے ہاتھ پیر ٹھوادیے۔ سپانائیک کے فرنی رشتہ دار اور اس کے ساتھیوں کو ٹوٹی پر چڑھا دیا۔

اس طرح چند ہی ماہ میں شمالی علاقوں کا امن و امان بحال ہو گیا۔ اس علاقے کا صوبدار بیرنگ تھا جو فوج کی کمی کی وجہ سے قلعہ چھوڑ کے جیش درگ میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ قمر الدین نے اسے بلا کر دوبارہ وہاں کا حاکم مقرر کیا۔ اسی طرح کا ایک آدمی بنگلی گورہ تھا۔ اس نے خود کو ایک پالیگار مرکیسی کی اولاد کا ظاہر کیا اور گورہ بندہ پر قابض ہو گیا۔

اس کی سرکوبی کے لیے سلطان نے سید حمید کو فوج دے کے روانہ کیا۔ سید حمید نے تین ماہ کی سخت جدوجہد کے بعد قلعہ گورہ بندہ فتح کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رتن گیری اور مد گیری کو بھی باغیوں سے چھین لیا۔ پھر باغیوں کے ناک کاٹ ٹھوادیے۔

اس کارکردگی کے صلہ میں سید حمید کو نوبت، عاری دار کا تختی اور نواب کا خطاب ملا اور سلطان نے اسے بد نور کا صوبہ دار مقرر کر دیا مگر اس کی عمر نے وفات کی اور وہ چند ماہ

بعد ہی انتقال کر گیا۔

روایت ہے کہ میر قمر الدین اپنی کارکردگی کے صلہ میں سلطان کی فرزند کا خواہش مند تھا اور اسی لیے ہر معرکہ میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا تھا مگر سلطان نے اس کی خواہش پر توجہ نہ دی بلکہ اس کی شادی اسی سال نائطہ خاندان کی ایک لڑکی سے کرادی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سلطان کا سخت مخالف ہو گیا۔

ان امور سے فارغ ہو کر سلطان نے ملکی نظم و نسق پر توجہ دی۔ لوگوں کی خطائیں معاف کیں۔ مزا کے طور پر جن کا تبادلہ کر دیا گیا تھا انہیں سزا کا پتہ نہ لگایا گیا۔ پھر سب کو عیدالاضحیٰ کے موقع پر لال باغ میں جمع کیا اور بعد نماز عید مسلمانوں نے قرآن پڑھا، برہمنوں نے راتوں پر اور دوسرے افسروں نے دودھ اور چاول پر حلف اٹھایا کہ وہ خزانہ کی ادائیگی میں غفلت نہیں برتیں گے۔ رشوت نہیں لیں گے۔ غبن نہیں کریں گے۔ رعیت کو تکلیف نہ پہنچائیں گے اور لٹا ہوں اور برا بیٹوں سے اجتناب کریں گے۔

سلطان نے اپنے طور پر سلطنت کے عاملوں کو مدھارنے کی بہت کوشش کی مگر وہ حقیقت میں اخلاقی طور پر دیوانہ ہو چکے تھے۔

سلطان نے دفتری زبان فارسی مقرر کی تھی اس سے برہمنوں کی اجارہ داری ختم ہو گئی۔ مگر وہ عامل جنہیں سلطان ان کی بہادری کے صلے میں جاگیر یا کہیں کی حکومت عطا کرتا وہ دہاں پہنچ کے انتقام برہمنوں کے ہاتھوں میں دیدیتے اور خود عیش و عشرت میں مشغول ہو جاتے۔ اس طرح یہ اخلاقی باختہ عامل حکومت اور درپردہ برہمن جنہیں میسر کے راجہ کے زمانے میں خوب مراعات حاصل تھیں، دونوں طبقے مل کر سلطنت کی بنیادوں کو دیک بن کر چاٹ رہے تھے اور سلطان کا اصلاحات کا سارا پردہ گرام اور یہ حلف نامے اور قہیں ان پر خاک اثر نہ کر فی تھیں۔

میر صادق اور غلام علی خاں لنگہ سے جیسے لوگ سلطان کے سامنے تو بھگی بلی بنے رہتے مگر رات کے اندھیرے میں ہمیشہ سلطان کا تختہ لٹنے کی سازشوں میں لگے رہتے تھے۔

اس سلسلے میں سلطان کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا اس لیے کہ اس نے ایک اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کے لیے ہر گاؤں اور موضع میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی جس میں ایک مؤذن ایک ملا اور ایک قاضی مقرر کیا گیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے مسلمان بچوں کی تعلیم دینے کے علاوہ

فامنی مقرر کر کے سلعانی انصاف ہر شخص کے گھر کے دروازے تک پہنچا دیتا تھا مگر بد قسمتی تو یہ تھی کہ سلطنت خداداد کے عہد سے دار اسلامی سلطنت کی بیخ کنی کرنے میں دن رات کوشاں رہتے تھے۔

اس حلف کے بعد سلطان نے ملکی طرز حکومت کو فرانس کے طرز پر جمہوری انداز میں ڈھال دیا۔ سلطان نے اپنے اختیارات وزیروں کے میر و صدور کو سوپ دیے عوام کو حکومت میں اختیارات دینے اور عوام کو عوام کی خدمت کرنے کے لیے ایک دیوان (پارلیمنٹ) بنایا جس کا نام 'زمرہ غم نہ باشد' رکھا گیا مگر یہ جمہوریت غلامانہ ذہن رکھنے والوں کو پاس نہ آئی۔ وزیروں کے ہاتھوں میں اختیارات آئے تو انہوں نے بد نظمی اور رشوت ستانی کا بازار گرم کر دیا اور رستم نگوں میں اتنی پھیل گئی۔

سلطنت خداداد کا دیوان یعنی وزیر اعظم یا میر صدور میر صادق تھا۔ اس نے مجلس وزراء کو کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیا اور تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں جمع ہو گئے۔ وہ جو چاہتا ہو کرتا تھا مگر سلطان کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی تھی۔

یہ بات بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھی کہ سلطان جیسا پڑ عزم اور مدبر حکمران میر صادق کے اشاروں پر چلنے لگا تھا۔ سول اور فوجی عہدے وارڈوں نے ہندوڑ کھلے الفاظ میں بارگاہ سلطان کو اس بات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ میر صادق اپنے دشمنوں (جو دراصل سلطنت خداداد کے وفادار تھے) کو ختم کرنے اور اختیارات کو زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر میں ہے مگر سلطان بجانے کیوں میر صادق کی حرکتوں کی پردہ پوشی کرتا یا اس سے صرف نظر کرتا تھا۔

سلطان نے اسی سال دار السلطنت مرنگا پٹم کی از سر نو تعمیر شروع کرائی۔ پرانی تفصیل کو منہدم کر دیا گیا اور اس کی جگہ دریائے کاویری کی طرف دو نئی فصیلیں، برج اور حصار کمری خندق کے ساتھ تعمیر کرائے۔ جنوب کی سمت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پانچ نئی گڑھیاں بنوائیں۔ اس طرح دریا دولت باغ جو حصار کے باہر تھا اب جو تھے حصار میں آ گیا۔ قلعہ کے مغرب کی جانب چار نئی گڑھیاں کی تعمیر شروع کرائی مگر ان میں سے صرف دو تعمیر ہوئیں۔

جلے عورت اور مقام آفسوس ہے کہ ان تمام عمارات میں پہلے سلعانی علی اور بارہ وری

ہم تھے۔
ناشتہ کے بعد سلطان کچری منعقد کرتا۔ دربار کی یہ نشست صبح دس بجے سے گہری رات تک جی رہتی تھی۔

ایک خواجہ سرا کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ ہر صبح دربار میں سفید چادریں اوقالین بچھوائے ان پر سلطان کے لیے قبلہ رخ ایک مسد لگاٹی جاتی جس میں تین سنہری تکیے رکھے جاتے تھے۔ سلطان کے دائیں جانب ایک خنجر، گنار، دود پستول اور منہرے رنگ کا شیر کے سر کی طرح کا بنا ہوا خود اور ایک بھولوں سے بھری ٹوکری رکھی جاتی تھی۔ بائیں طرف اگالک ہوتا تھا۔ سلطان کے سر پر سفید رنگ کی برہن پوری دستار ہوتی تھی جس میں پچاس گز کپڑا صرف ہوتا تھا۔

سلطان زیادہ تر سفید کپڑے پہنتا۔ اس کی جیب میں پوری طرز کی ایک گھڑی ہمیشہ رہتی۔ سلطان آخری ایام میں غری طرز کی مہر رنگ کی شلہ دار دستار پہننے لگا تھا۔ مسند پر بیٹھتے ہی سلطان خطوط کے جواب لکھواتا۔ پھر اپنے سامنے موجود وزراء کو حکمائے دیتا۔ یہ حکم نامے اس کے منشی مختلف زبانوں (فارسی، ہندی، کنیری، تلگو اور اردو) میں لکھتے تھے۔

اس کے بعد معمار یا چوب مازی، کتابداری، خانہ داری، نگسال اور چوب داری کے دو دواہرین پیش ہوتے۔ ان میں سے ایک کو دن اور ایک کو رات کی ذمے داریاں سونپی جاتی تھیں۔ اسی طرح کے اور ماہرین پیش ہوتے اور اپنے اپنے کام کے احکام سلطان سے حاصل کرتے۔

ان کے پیچھے کو تالی شہر حاضر ہوتا اور مختلف مقدمات کے سلسلے میں سلطان احکام سناتا تھا۔

دو پردہ دہجے کے قریب کھانے کا دسترخوان بچھا۔ دسترخوان پر شہزادے، امرا اور درزا حاضر ہوتے۔

سلطان خود صاحبِ علم تھا اس لیے اہل علم کی پوری قدر دانی کرتا تھا۔ اس لیے ادبا، شعرا اور میرت و تقاسیر کے علماء بھی ہر وقت ساتھ ہونے اور کھانے میں شرکت کرتے تھے البتہ بے ہودہ گوئی کا دربار میں کوئی گزرنہ ہوتا تھا۔

منہم کرائی گئی۔ پھر بنگلہ کا محل بھی ڈھا دیا گیا۔ اس کا تھوڑا سا حصہ باقی ہے۔

بنگلہ کی مسجد مراکش کے عربوں کے فنِ تعمیر کا پہلا نمونہ تھی۔ اس کا ایک ہی مینار تھا۔ اسے بھی شہید کر دیا گیا۔ بنگلہ کے عجائب گھر میں اس کی تصویر موجود ہے۔ یہ مسجد شہر گوی پرم کی پھاڑ پر تھی۔ وہاں اب ایک مندر ہے۔

بھارت کی سیکولر حکومت جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلاتی ہے اسے بھارت میں نہ تو کسی خطہ پر اسلامی حکومت پسند ہے اور نہ وہ اسلامی روایات، احکام سب سے اہم نشان "مسجد" ہوتا ہے، کو یہ سیکولر (غیر مذہبی) حکومت برداشت کرنے کو تیار ہے۔ یہ جہل بھارت میں باہری مسجد کو شہید کرنے کی کوششیں پورے عروج پر ہیں اور قبوضہ کشمیر میں ہتے مسلمانوں کا قتل عام جاری ہے۔

خیر یہ تو ایک جملہ محترمہ تھا جو جذباتی طور پر قلم سے ادا ہو گیا۔ اب میں ہر سلطان پٹو کے مرثیہ کی طرف آتا ہوں۔

جی ہاں۔ یہ بھی تو ایک مرثیہ ہے۔ جس طرح شامی لشکر جناب حسین بنی نواسہ رسول کو گیر کر میدانِ کربلا میں شہادت کے لیے لے گیا اسی طرح غدار اور نمک حرام عہدیدارانِ حکومت پٹو ایک چھوٹی کربلا پر پا کرنے میں کامیاب ہوئے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

سلطان کی عمر ۴۲ سال کی ہو چکی تھی۔ اس کے معمولات میں عبادت اور ریاضت کا زیادہ دخل ہو گیا تھا۔ اس شکست کے بعد سلطان نے قسم کھائی تھی کہ نہ تو وہ تخت پر بیٹھے گا اور نہ ہی چارپائی پر سوئے گا۔ اور نہ کھد ر کے سوا کسی اور گہڑے سے جسم کو ڈھلکے گا۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان نے زندگی کے بقیہ ایام چٹائی پر سو کر گزارے۔

سلطان کے صبح و شام کچھ ایسے گزرتے تھے:

صبح جلد اٹھتا۔ ہلکی سی ورزش کرنا۔ سارے بدن پر ماش کر دانا۔ پھر صبح کی نماز پڑھنے کے ایک گھنٹہ تلاوت میں مصروف رہنے کے بعد چل قدمی کے لیے نکل جانا۔

واپس آکر جواہرات کا معائنہ کرنا۔ پھر ہلکا سا ناشتہ کرنے کے بعد نجومیوں کو بلوانا جو روزانہ معمولات کے بارے میں سلطان کو ستاروں کی چابیں بتاتے تھے۔ اس کے بعد چند لکھے اور ایک بکر اصد قدینا۔ پھر دوپہر کے کھانے کے لیے مہزیوں کا انتخاب۔

نونہجے کے قریب عام ناشتہ کیا جاتا جس میں شہزادے، امرا اور درزا شریک دسترخوان

تین بیج کے قریب سلطان آرام گاہ میں چلا اور چند لمحے گزرنے پر فوج کے معائنہ روانہ ہو جاتا۔ نئے بھرتی ہونے والے سپاہیوں کو دیکھتا اور ان کی کارگزاری کا جائزہ لیتا۔ شام کی نماز اکثر وہیں پڑھتا۔

رات گئے محل میں واپس آتا۔ وہاں دسترخوان پر شہزادے اور امراء و وزراء اس کے منظر ہوتے۔ کھانے کے بعد ایک بار پھر تاریکی مباحث پھر جاتے۔ اس کے بعد سلطان خواب گاہ میں چلا جاتا اور دیر تک مطالعے میں مصروف رہتا۔

میسور کی تیسری جنگ کے بعد سلطان نے خواب گاہ سے پلنگ نکلا دیسے تھے اور صرف ایک چٹائی بچھالی تھی جس پر سلطان زیادہ وقت عبادت میں گزارتا تھا۔

سلطان کے حرم میں ۶۰۰ کے قریب عورتیں تھیں مگر سلطان کے ان سے کوئی تعلقات نہ تھے۔ اس کا حرم محض زنان خانہ تھا جہاں عورتیں رہتی تھیں اور ان کی خدمت پر خواجہ سرا مامور تھے۔ عورتوں کو اجازت تھی اگر وہ زنان خانہ سے جانا چاہیں تو جاسکتی تھیں۔ ان خواتین میں حیدر علی مرحوم کی ۲۸ کنیزیں بھی تھیں جنہیں برخاست نہیں کیا گیا تھا۔

سلطان نے صرف تین شادیاں کیں۔ دو تو بچپن ہی میں ہو گئی تھیں۔ تیسری شادی اس نے ۱۷۹۵ء میں سید صاحب کی بیٹی سے کی تھی۔ اس عظیم سے ایک بیٹی پیدا ہوئی جو سلطان کے بعد تک زندہ رہی۔

غیب بات تھی کہ سلطان ایک پکا عبادت گزار ہونے کے باوجود فحش پرست بھی تھا۔ خوابوں اور نجوم پر اس کا اعتقاد یقین کی حد تک پختہ تھا اس لیے وہ مولویوں سے زیادہ نجومیوں کی بات پر دھیان دیتا تھا اور ستاروں کی مدد پر بہت زیادہ یقین رکھتا تھا۔

سلطان کے علم نجوم پر یقین کے سلسلے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے اور وہ ہزارہاں یخ میں مذکور ہے۔ تادمین کی دلچسپی کے لیے یہاں بھی تحریر کیا جا رہا ہے۔

سلطان کے اکثر یزوں کے ساتھ اس ذلت آمیز صحنے سے تقریباً آٹھ سال پہلے ایک صبح سلطان سیر کو جا رہا تھا۔ اس وقت اس کا بدبہ ہندوستان سے نکل کر پوری دنیا پر چھا رہا تھا۔

سیر کے دوران سلطان کی نظر ایک فقیر پر پڑی جسے کچھ لوگ گھیرے ہوئے تھے۔ سلطان نے اپنے محافظ راجہ خاں سے پوچھا:

”راجہ خاں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟“

راجہ خاں نے جواب دیا:

”مالی جاہ ایک بخوی ہے جسے لوگ گھیرے ہوئے ہیں۔“

سلطان نے راجہ خاں سے دریافت کیا:

”راجہ خاں۔ تمہیں نجوم پر اعتقاد ہے؟“

راجہ خاں ایک نو مسلم نوجوان تھا وہ گھبرا گیا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ اسلام میں نجوم جیسی چیزوں کی کوئی وقعت نہیں پھر بھی اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا:

”مالی جاہ۔ نجوم ایک علم ہے اور اس کی حقیقت ان لوگوں کو معلوم ہے جو اس میں مہارت رکھتے ہیں۔“

سلطان کو راجہ خاں کے غیر ذمہ دارانہ جواب پر ہنسی آگئی۔ پھر اس نے حکم دیا:

”اچھا۔ اس بخوی کو محل میں پیش کیا جائے۔“

یہ کہہ کر سلطان محل میں چلا گیا۔

راجہ خاں بخوی کو لے کر محل میں پہنچا اور اسے ایک وسیع و عریض کمرے میں بٹھا دیا جس میں ایک خوبصورت قالین کا فرش تھا اور ایک نہایت آرام دہ صوف پڑا ہوا تھا۔

بخوی نہایت اطمینان سے قالین پر بیٹھ گیا اور راجہ خاں محل میں سلطان کو بخوی کی آمد کی اطلاع دینے چلا گیا۔

مختصری دیر کے بعد سلطان، راجہ خاں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ تمام خدام آداب بجا لے کر بخوی نے ذرا بھی حرکت نہ کی اور اسی طرح قالین پر نظریں بھکائے بیٹھ رہا۔

اس خوبصورت قالین پر ایک جھاڑی بنی تھی جس میں گلاب کے پھول کھلے تھے۔ اس کے

ایک طرف ایک عظیم الجثہ شیر آرام کر رہا تھا اور چھڑی کے پیچھے ایک شکاری بندوق تھیں۔ لیے شیر کو تاک رہا تھا۔ شیر، اس شکاری کی موجودگی سے بالکل لاپرواہ نظر آ رہا تھا۔ بخوی کمال حیرت سے ان نقش و نگار کو دیکھ رہا تھا۔

سلطان کے قریب آنے پر بخوی نے نظریں اٹھائیں اور بولا:

”آئیے۔ بیٹھے۔“

بخوی نے اس طرح کہا جیسے یہ عالی شان کمرہ خود اسی کا ہو۔

سلطان نے کھلا ہوا چاقو ہوا میں بلند کیا۔ طوطا جان کے خوف سے اور زور سے پھڑپھڑایا۔
چاقو پوری طاقت سے طوطے پر گرنا مگر اس کش مکش میں گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ طوطا ہاتھ سے
بھڑک کر اڑ گیا۔ چاقو سلطان کے ہاتھ پر لگا جس سے خون بہنے لگا۔
سلطان نے بڑے اطمینان سے اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا:
"کاغذا اٹھایا جائے۔"

راجہ خاں نے قدم بڑھا کے کاغذا اٹھایا اور سلطان کو دے دیا۔ سلطان نے کاغذ کھول
کے پڑھا۔ اس میں لکھا تھا:

"تم اس پرندے کی جان نہیں لے سکتے۔ خدا کی یہ مخلوق
بھی تمہاری طرح آزاد ہے۔ اس کے زخم نہیں آتے گا البتہ
تم نقصان اٹھاؤ گے۔"

یہ پڑھ کر سلطان سراپا حیرت بن گیا۔
اسی عالم میں اس نے بخوی کی طرف دیکھا۔ بخوی قایلین سے اٹھ کر دروازے کے قریب
پہنچ چکا تھا۔

سلطان صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پک کے بخوی کے پاس پہنچا اور بڑی منت سے کہا:
"کچھ میری قسمت کے بارے میں بتائیے۔"
بخوی پلٹا اور یہ کہہ کر باہر نکل گیا:
"سلطان کی قسمت اس قایلین پر نقش ہے۔"

بخوی کے جانے کے بعد سلطان نے قایلین کے نقش و نگار دیکھے۔ اس وقت تو غور
کرنے پر بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر جب انگریزوں سے اس کی جنگوں کا آغاز ہوا تو اس
قایلین کا نقش اس کے پردہ ذہن پر ثبت ہو کے رہ گیا اور اس کا اعتقاد علم بخوم پر روز بروز
بڑھتا گیا!



سلطان نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا:
"آپ نے سلطنت خداداد میں کیا دیکھا؟"
بخوی نے لا پرواہی سے جواب دیا:

"ہر طرف عدل و انصاف کا چرچا ہے۔ رعیت خوش حال ہے۔ ہندو مسلمان سب بھائی
کی طرح رہتے ہیں۔"

اب سلطان نے وہ سوال کیا جس کے لیے اس نے بخوی کو بلوایا تھا۔

"کچھ بخوم کے بارے میں فرمائیے۔ کیا یہ علم صحیح ہے؟"

بخوی نے پورے اعتماد سے جواب دیا:

"علم بالکل صحیح ہے لیکن صرف جاننے والے ہی جانتے ہیں۔ دھوکہ بازوں نے اس
علم کو بدنام کر رکھا ہے۔"

اس وقت سلطان نے راجہ خاں کو اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا اور چند لمحوں کے بعد واپس
آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بیجرہ تھا جس میں ایک طوطا تھا۔

راجہ کے پیچھے پیچھے ایک سپاہی آ رہا جس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ سلطان نے راجہ خاں
کے ہاتھ سے بیجرہ لیا۔ اسے کھولا اور طوطے کو ایک ہاتھ سے اس طرح پکڑا کہ اس کی دونوں
ٹانگیں سلطان کی تسبیح میں آگئیں اور پر کھل گئے۔ پھر سلطان نے سپاہی کے ہاتھ سے بیجرہ چا
لے لیا۔

اس وقت طوطا پھڑپھڑا رہا تھا۔

سلطان نے بخوی سے پوچھا:

"بتاؤ۔ اس طوطے کی قیمت میں کیلے ہے؟"

بخوی نے اسی لا پرواہی سے کہا:

"کاغذ اور قلم منگایا جائے۔"

سلطان کے حکم سے دونوں چیزیں حاضر کر دی گئیں۔ بخوی نے کاغذ پر کچھ لکھا اور پیٹ

کر دوسری جانب پھینک دیا۔

اب اس نے سلطان سے کہا:

"اب آپ جو چاہیں وہ کریں۔"

سلطان کے خواب نمبر ۲ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تختِ دہلی سے انگریزوں کا اثر دور کر کے
اپنی کسی تیوری شہزادے کو بٹھانے کا خواہش مند ہے۔ وہ خود تختِ دہلی پر بیٹھا نہیں چاہتا بلکہ اس
خاندان کے کسی لائقِ فرزند کو تخت پر بٹھا کر واپس دکن آ جاتا ہے۔

خواب نمبر ۳ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود بادشاہ بننا نہیں چاہتا بلکہ سکندر اور نبیلین کی طرح
ایک عظیم جرنیل بننے کا خواہشمند ہے اور وہ بزرگانِ دین اور کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو
اپنے سر پر دستار باندھتے دیکھتا ہے۔

خواب نمبر ۱۲ میں اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بشارت ملتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

”میں تمہارے بغیر جنت میں قدم نہیں رکھوں گا“۔

خواب نمبر ۲۵ سے سلطان کی اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے کہ نظام دکن کا ایک سردار اسد علی
خان جس نے انگریزوں کی طرف سے ۱۷۹۱ء کی جنگ میں حصہ لیا تھا، وہ نظام کو چھوڑ کر اس کی ملازمت
میں آ جائے۔

خواب نمبر ۲۷ سے اس کی یہ خواہش ظاہر ہوتی ہے کہ اسے دس ہزار غرائسی سپاہی
مل جائیں۔

خواب نمبر ۲۹ سے وہ شہنشاہِ چین سے مراسم پیدا کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے
کہ چینی شہنشاہ نے اسے سفید لٹنی کا تحفہ بھیجا ہے۔ یہ تحفہ شہنشاہِ چین نے سب سے پہلے
سکندر اعظم کو دیا تھا (یہ بات بحال نظر ہے)۔

سلطان کو ان دیسی لکڑیوں سے شدید نفرت تھی جو انگریز کے فریب میں مبتلا ہو کر اس سے
جنگ کرتے تھے۔ چنانچہ سلطان انہیں بزدل سمجھتا ہے اور خواب میں اسے وہ حکمران عورت کی صورت
میں نظر آتے ہیں اور کبھی وہ اسے ریکچوں کی شکل میں نظر آتے ہیں اور وہ ان کا شکار کرتا ہے
(خواب نمبر ۱۱-۱۳)۔

خواب نمبر ۱۹ سے سلطان کی اپنی رعیت کے ساتھ محبت اور اس کی صلاح و بہبود کا اظہار ہوتا
ہے۔ اسے اطلاع ملتی ہے کہ ایک بت خانہ میں آگ لگ گئی ہے تو اسے سب سے پہلے اپنی اس
رہایا کا خیال آتا ہے جن کے مکان بت خانہ سے متصل ہیں۔ سلطان فوراً آدمی دوڑاتا ہے تاکہ
ان لوگوں کی خیریت معلوم ہو۔



مشہور رہے کہ خواب زندگی کا عکس ہوتے ہیں۔

یہ قول سلطان شیو پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ اسے بھی اس بات پر یقین تھا اس لیے
وہ جو خواب دیکھتا اسے ایک بیانی میں ترتیب داریا کرتا تھا۔
خوابوں کو قلم بند کرنے کا سلسلہ شاید اس نے میسوری تیسری جنگ میں شکست کھانے کے
بعد شروع کیا تھا۔

اس کی وجہ اور خصوصیت یہ ہے کہ سلطان اپنے خوابوں میں یا تو خود کو انگریزوں، مرہٹوں
اور نظام سے لڑتے ہوئے دیکھتا ہے یا پھر اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی اور
بزرگانِ کرام خاص کہ حضرت خواجہ گیسو دماز دکھائی دیتے ہیں۔
اس لحاظ سے ہم سلطان کے خوابوں کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- ۱۔ ایک حصے میں مذہبی خواب
- ۲۔ دوسرے حصے میں جنگی خواب
- ۳۔ تیسرے حصے میں سیاسی خواب

ان خوابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو ہر دم وطن کی آزادی اور دین کے فروغ
کا خیال رہتا تھا۔ سلطان صرف دکن سے نہیں بلکہ دھوکہ باز اور مکار انگریزوں کو پورے ہند سے
نکال باہر کرنے کا آرزو مند تھا۔

مقصود یہ ہے کہ سلطان کے تمام خوابوں سے اس کی امنگوں، خواہشوں اور تجاویز کا اظہار ہوتا ہے لیکن بعض لوگوں نے سلطان کے خوابوں کا غلط مطلب نکالا ہے۔ ان کے خیال میں سلطان نے اپنے خوابوں میں انگریزوں سے اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے چنانچہ علمی زندگی میں بھی وہ انگریز قیدیوں کے ساتھ بڑا براسلوک کرتا اور انہیں معاش میں مبتلا رکھتا ہے۔

جہاں تک ہندوؤں کے ساتھ اس کے سلوک کا تعلق ہے تو اس کی بے تعصبی اور مذہبی رواداری کے بڑے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ سلطان نے اپنے عاملان کو حکم دے رکھا تھا کہ مندروں اور گوردواروں کی حفاظت کی جائے اور انہیں جملہ ضروریات بہم پہنچی جائیں۔

سلطان کی اعلیٰ ملازمتوں میں ہندو شامل تھے۔ پورنا سلطنت خداداد کا وزیر پالیات تھا۔ سلطان نے کشن راؤ کو اپنا محترم خاص بنایا تھا۔ پھر اسے سرنگاپٹم کا گورنر بنا کر بھیجا مگر اس تک حرام نے سلطان کے خلاف سازش کی اور گرفتار ہو کر کبیر گودار کو پہنچا۔

جہاں تک انگریز قیدیوں کے ساتھ سلطان کے سلوک کا تعلق ہے تو خود واقعات اس الزام کو غلط ثابت کرتے ہیں۔ سلطان انگریز قیدیوں کے ساتھ ان کے مرتبہ کے مطابق سلوک کرتا تھا۔ اگر کوئی انگریز بخوشی مسلمان ہو جاتا تو سلطان اسے احمدی رسالہ میں جگہ دیتا اور اس کے ساتھ مزید بہتر سلوک کرتا تھا۔

لنڈ سے اور اس کے ساتھیوں کو عام قیدیوں کے ساتھ نہیں رکھا گیا تھا بلکہ انہیں سرنگاپٹم کی ایک جوبلی میں رکھا گیا تھا جس کی لمبائی ۷ فٹ اور چوڑائی ۵ فٹ تھی۔ اس جوبلی میں بغیر کھڑکیوں کے چار کمرے بنے تھے۔ انہیں اپنے مشاغل میں آزادی تھی۔ ان کا روزانہ اخراجات کے لیے صوبہ خراج مقرر تھا۔ سامان منگوانے کے لیے انہیں ملازم دیے گئے تھے۔ لنڈ سے اور ہیرڈ جیسے جنرل خود کو چوب کاری اور سلاخی میں مصروف رکھتے تھے۔

سلطان کی قید میں لنڈ سے کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔

لنڈ سے نے کسی طرح قید خانہ کی ایک اینٹ کھسکائی تھی۔ وہ اینٹ ہٹا کر روزانہ دریا کے کنارے کا منظر دیکھتا تھا۔ کبھی اسے برہمن عورتیں دریا میں نہاتی دکھائی دیتی تھیں تو کبھی مسلمان بارات کا منظر دکھائی دیتا۔ اسی روز سے وہ سلطان کے فتح کے جشن بھی دیکھا کرتا تھا۔ ملازم کے آنے سے پہلے وہ اینٹ کو اس کی جگہ پر جمادیتا تھا۔ ملازم اس کے لیے چاول اور قورمر کی دافتر

مقدار لاتا تھا۔ یہ اس کا صرف دوپہر کا کھانا ہوتا تھا۔

جنگی قیدیوں کے فرار کی داستانیں تو ہر زمانہ میں دلچسپی کا باعث رہی ہیں۔ سرنگاپٹم کی جوبلی سے جنرل برسٹو اور اس کے ساتھیوں کا فرار بھی اسی طرح کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل سے قطع نظر کہتے ہوئے صرف اتنا کافی ہوگا کہ جس وقت کارنوالس نے سرنگاپٹم پر حملہ کیا تو اس وقت احمدی رسالہ کے بہت سے نو مسلم یورپین گورگ کی طرف بھاگ گئے تھے۔ جنرل برسٹو بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ برسٹو غیر سرنگاپٹم کی ایک جوبلی میں قید تھے۔ نومبر ۱۸۹۱ء میں انہوں نے اپنے ہاتھ پیر میٹر یوں سے آزاد کر لیے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے چاقو سے ایک آری بنائی تھی۔

انگریز قیدیوں نے بیس دن رات میں ایک سرنگاپٹم کو دی تھی۔ جانظوں کو کھدائی کی آواز سے بے خبر رکھنے کے لیے یہ لوگ زور و زور سے انگریزی گیت گاتے تھے۔ پھر ایک رات یہ سب قیدی اس سرنگاپٹم کے راستے سرنگاپٹم سے فرار ہوئے۔

برسٹو نے شمال مشرق کا راستہ اختیار کیا تاکہ وہ جلد از جلد مرہٹہ لشکر تک پہنچ جائے مگر وہ کپل کے قریب کرنل ریڈ کے گروہ تک پہنچ گیا اور اس نے ۱۸۹۲ء کی جنگ میں سلطان کے خلاف صدر بنا۔

سکرے نے اپنے فرار کی داستان میں کہا ہے کہ وہ چند رگ سے فرار ہوا اور اگست ۱۸۹۱ء میں بمبئی میں ڈاکٹر ٹل نے اسے پاس پہنچا۔

مگن ڈاکٹر ٹل نے سکرے کے جو واقعات بیان کیے ہیں وہ سکرے کے بیان سے مختلف ہیں۔ تاہم ان تمام واقعات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انگریزی قیدی سلطان کے ظلم کی وجہ سے میں بلکہ فخری تقاضوں کی وجہ سے فرار ہوئے تھے۔

سلطان کا میر صادق کو سلطنت خداداد کا وزیر اعظم بنانا ایک ایسا اقدام تھا جس سے سلطنت کے تمام ہی خواہ اور وفادار دل برداشتہ ہو گئے۔ ان میں سے بعض تو سرنگاپٹم چھوڑ گئے اور کچھ گوشہ نشین ہو گئے۔

میرصادق نے سب سے پہلے اہل دائرہ کا اثر و رسوخ کم کیا۔ اہل دائرہ یا ہندو یہ کی کمک چلا اور وفاداری مشہور تھی لیکن میرصادق کو سلطنت کے نہیں اپنے وفادار چاہیے تھے اس لیے اس نے اٹھ دن شکایات کے اہل دائرہ کو ملک بدر کر دیا۔

میرصادق نے تمام کلیدی اساسیوں پر اپنے آدمی مقرر کر دیے تھے۔ اس کا اثر و رسوخ اس درجہ بڑھ چکا تھا کہ سلطان کے محافظ خاص خادم اور جاسوس بھی سلطان سے کچھ کہنے کی ہمت نہ کرتے تھے۔

میرصادق سلطان کے نام آنے والی عرضیوں اور خطوط کو خود کھول کے پڑھتا اور سلطان کو اطلاع دے بغیر ان کے جوابات لکھا دیا کرتا تھا۔ میرصادق ہی کے کہنے پر سلطان نے دھونڈو جی داگیہ کو قید میں ڈال دیا تھا۔

دھونڈو جی داگیہ ایک بہت بڑا رہزن اور دیکھت تھا۔ جب سلطان نے سلطنت خداداد میں ایک اسلامی معاشرہ پیدا کرنے کے لیے ہر گاؤں اور موضع میں سکول اور قاضی مقرر کیے تو پوری سلطنت میں نماز روزے اور دینداری کا چرچا شروع ہو گیا۔

دھونڈو جی داگیہ، سلطان کے ان کاموں سے ایسا متاثر ہوا کہ وہ اپنے گروہ سمیت تاب بھوک سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

سلطان، داگیہ پر بہت خوش ہوا۔ اس نے اس کے ساتھیوں اور اس کے قیام کا خوب اچھا انتظام کر دیا تھا۔

داگیہ ہر دم سلطان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا اور سلطان کی خدمت ہی کو دین و دنیا کی ترغیب کا ذریعہ سمجھتا تھا۔

وہ سلطان کے قریب رہ کر جلد ہی مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلامی نام شیخ احمد رکھا گیا۔ سلطان نے اس کی دینی تعلیمات کے لیے ایک عالم دین کی خدمات حاصل کیں اور وہ چند ہی دنوں میں پابندی سے نماز پڑھنے لگا۔

شیخ احمد نے سلطان کی بے انتہا خدمت کی۔ سلطان نے اس کی خدمات سے خوش ہو کر کسے جہاں خاں کا خطاب دیا اور ایک قلعہ کی سرداری سونپنے کا ارادہ کیا۔

میرصادق کو معلوم ہوا تو اس نے شدید مخالفت کی۔ وہ تو یہ چاہتا ہی نہ تھا کہ سلطان کا کوئی وفادار بانی رہے۔

میرصادق نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سلطان کے کان بھرے:

"قبلہ عالم۔ آپ اگر شیخ احمد کو کوئی ذمے داری دینا چاہتے ہیں تو ضرور دیکھ لیکن اس اہمیز کے خیال میں ایک رہزن کو کوئی ذمے داری سونپنا عقلمندی نہ ہوگی۔

دھونڈو جی داگیہ جو آج شیخ احمد ہے، کل تک اپنے لٹیروں کے ساتھ حیدر آباد اور مرنگا پٹم پر چھاپے مار کر گزر بسر کرتا تھا۔ ایک ایسے ناقابل اعتبار شخص کو قلعہ دار بنادینا مصلحت ملکی کے لئے خلاف ہے کیونکہ ایسے آدمی سے کسی وقت بھی فتنہ و فساد کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ طاقت حاصل کرنے کے بعد یہ دولت خداداد کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائے۔"

مشہور ہے کہ کہنے سننے سے تو دیواریں تک اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہیں۔ میرصادق نے سلطان کے اس قدر کان بھرے کہ سلطان نے اسے قلعہ دار بنانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے اپنے دربار سے ہٹا کر بڑے بیٹے فتح حیدر کی ملازمت میں بھیج دیا۔

صلح نامہ مرنگا پٹم کے بعد سلطان خود کو بے بس اور بے دست و پا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس وقت کی تین طاقتیں انگریز، امرٹے اور نظام، تینوں ہی نے اس کے خلاف محاذ بنا کر اسے شکست سے دوچار کیا تھا۔

مرنگا پٹم سے ان متحدہ دشمنوں کے رخصت ہونے کے بعد سلطان نے ملکوں اور ریاستوں کو قاصد اور سفارتیں بھیجیں تاکہ ان سے اتحاد اور یگانگت پیدا کی جائے۔

سلطان نے سب سے پہلے قریبی ریاست یعنی مرہٹوں کو ٹھولا۔ اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس کی اتحادیوں بلکہ انگریزوں کے ہاتھوں شکست نے مرہٹوں اور نظام کی آنکھیں بھی کھول دی ہیں کیونکہ انگریزوں کا مقابلہ صرف سلطان ہی کر سکتا تھا۔ مرہٹوں اور نظام میں یہ طاقت نہ تھی کہ انگریزوں کے مقابلہ کی تاب لا سکتے۔

چنانچہ سلطان نے اگلے ہی سال یعنی ۱۷۹۳ء میں مادھوجی سندھیلا سے خط و کتابت کا آغاز کر دیا۔ اس نے سندھیلا پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ انگریز دراصل ہندوستانیوں میں تفرقہ پیداکر کے پورے ہندوستان پر قبضہ کے خواب دیکھ رہا ہے۔

مادھوجی سندھیلا کے دماغ میں بھی کچھ اسی طرح کے خیالات جنم لے رہے تھے۔ ناٹھرنولیس کے

مال جاہ کی حمایت کی تھی۔ اس وجہ سے نظام دکن کو مجبوراً سلطان کی طرف مائل ہونا پڑا۔
یوں سلطان کو اپنے دونوں پڑوسینوں کی ایک طرح کی حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ ویسے ہی اس نے
اپنی طاقت کا کافی بڑھ چالی تھی۔

کارنوالس کا جانشین مرجان شور کچھ زیادہ کاٹ چھاٹ کا آدمی نہ تھا اس لیے انگریز حکومت
نے مرجان شور کی جگہ لارڈ مارنٹن ولزلی کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا۔
اس شکست نے سلطان کو بہت کچھ سکھایا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے ملک کے فرمانرواؤں کے
علاوہ بیرونی ممالک سے بھی دوستی کی غرض سے خط و کتابت شروع کی۔

سلطان فی الحال انگریزوں سے الجھا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ اس قدر مضبوط ہونا چاہتا تھا کہ
انگریزوں سے پوری طرح بدلہ لے سکے اور انہیں بھارت سے تینشہ کے لیے نکال سکے۔ چنانچہ
سلطان نے میسور کی تیسری جنگ کے فوراً بعد ماریشس (مدغاسکر) کے فرانسیسی گورنر کی معرفت
شہنشاہ فرانس کوئی شانزدہم کے پاس دوستی کا خط بھیجا جس کا اسے کوئی جواب نہ ملا۔

اس سے اگلے سال سلطان نے پھر گورنر ماریشس کے پاس دوستی کا ایک خط روانہ کیا۔
اس وقت ماریشس کا گورنر دسینی تھا۔ یہ پانڈ بھری کا گورنر رہ چکا تھا۔ اس نے سلطان کے خط
کا جواب بڑے خلوص و محبت سے دیا۔

اس سے اگلے سال سلطان نے گورنر ماریشس کے پاس بلقاہدہ ایک فوجی وفد بھیجا جس کے
ممبر محمد ابراہیم اور حسین علی خاں تھے۔

سلطان نے وفد کو زبانی پیغام کے علاوہ ایک خط بھی دیا جس کے مندرجات یہ تھے:

۱۔ تلچھری پر حملہ کے لیے فرانس دس ہزار سپاہی روانہ کرے۔ اسے
تاخت و تاراج کرنے کے بعد یہ سپاہی سلطنت حذا داد کی ملازمت میں
لے لیے جائیں گے۔ اور سلطان کی کمان میں کو چین، مدورا، اتر چنپل
اور بنجور کی طرف بڑھیں گے۔

۲۔ ان مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد پانڈ بھری اور مدراس پر چڑھائی
کی جائے گی اور خشکی کے راستے کلکتہ پہنچے گے انگریزوں کو بنگال
سے نکال باہر کیا جائے گا۔ پھر بھٹی کا علاقہ فرانسیسیوں کے قبضہ
میں دیدیا جائے گا۔

برعکس سندھیا، سلطان کا کسی قدر حامی اور ہندوستان کی آزادی کا علمبردار تھا۔ اس سربہ سردار کی
بھارت سے محبت پر جس قدر غور کیا جائے وہ کم ہے۔ اس نے شہنشاہ دہلی کے ساتھ مل کر انگریزوں کو
ملک سے نکلانے اور بنگال واپس لینے کی تحریک چلائی تھی۔ شہنشاہ دہلی بھی اس کے منصوبہ سے
متفق تھا اور ایک مضمونک ان میں مداخلت جاری رہی۔

نظام دکن اور مرہٹوں کے درمیان کر نول کے معاملہ پر کارنوالس کے زمانہ ہی میں اختلاف
پیدا ہو گیا تھا۔ سلطان کی شکست کے بعد یہ علاقہ اتحادیوں کو ملا تھا۔ مرہٹے اسے اپنی مدد میں
شامل کرنا چاہتے تھے اور نظام اس پر اپنا حق جتاتا تھا۔

کارنوالس کے جانشین مرجان شور نے اس معاملے میں غیر جانبداری کی پالیسی اپنائی سلطان
اور سندھیا کی خط و کتابت ایک ہی سال تک جاری رہ سکی اور ۱۷۹۶ء میں مادھوجی سندھیا کا
انتقال ہو گیا۔

اسی سال مرہٹوں اور نظام میں جنگ شروع ہو گئی۔ انگریز اس جنگ سے الگ رہے۔ حالانکہ
انگریزوں کی دو بٹالین فوج نظام دکن کے علاقہ میں رہتی تھی۔ نظام کو انگریزوں کی غیر جانبداری پر
نہ صرف افسوس ہوا بلکہ اسے اپنی سلامتی کی فکر پڑ گئی۔ چنانچہ اس نے فرانسیسیوں کی طرف دوستی
کا ہاتھ بڑھایا۔ اس طرح فرانسیسیوں کا اثر دکن میں بڑھنے لگا اور نظام نے دونوں انگریز بٹالینوں
کو اپنے علاقہ سے رخصت کر دیا۔

رجان شور نے پہلے تو اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی لیکن جب نظام نے کڑپہ کا علاقہ فرانسیسی
سردار و سپہرہ عیند کو دے دیا تو اسے کٹکا پیدا ہوا۔

پونا میں مادھوجی سندھیا کے مرنے کے بعد اس کا بھتیجا دولت راؤ سندھیا مرہٹوں کا پیشوا
بنا۔ اس کا جھکاؤ بھی سلطان کی طرف رہا مگر اس نے کوئی عملی قدم اٹھانے پر آمادگی ظاہر نہ کی سوائے
اس کے کہ وہ انگریزوں سے کشیدہ خاطر رہا۔

کارنوالس ہی کے زمانے میں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ پھر لگ گئی تھی۔
اور کارنوالس پانڈ بھری لینے کے لیے بڑھا تھا۔

اس وقت فرانسیسی سردار میسور ریڈ بھی کڑپہ سے اس کے مقابلے پر نکلا تھا۔ اس پر مرجان
شور نے نظام دکن سے احتجاج کیا تھا۔

پھر جب نظام دکن کے بیٹے شہزادہ عالی جاہ نے باپ کے خلاف بغاوت کی تو انگریزوں نے

۳- دس ہزار فرانسیسی جوانوں کے ساتھ سلطان کے پچاس ہزار فوجی اس ہم میں حصہ لیں گے اور آئندہ فرانس اور سلطنتِ خداداد اتحادی بن کے رہیں گے۔ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر برطانیہ بھیج دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان سے وہ تین کروڑ روپے بھی واپس لیے جائیں گے جو سلطان نے انگریزوں کو بطور تادانِ جنگ ادا کیے ہیں۔

یہ وفد بنگلور سے ہوتا ہوا ماریشس پہنچا اور اس نے بندرگاہ سے اترتے ہی سلطان پٹنوکا پر تہنم بلند کر دیا۔

ماریشس کی فرانسیسی حکومت نے اس وفد کا شاندار طریقے سے اعلانِ استقبال کیا۔ اس وفد کے پہنچنے سے پہلے فرانسیسیوں کو نہ تو سلطان کی امداد کا خیال تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ سلطان، انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے والا ہے۔

ماریشس کے گورنر نے سلطان کے خط کے ساتھ اپنا ایک خط لگا کر شہنشاہِ فرانس کے پاس روانہ کر دیا۔

گورنر نے اپنے خط میں شہنشاہ کو اطلاع دی کہ سلطان کے پاس ایک لاکھ بہترین فوج ہے جبکہ انگریزوں کی طاقت بارہ ہزار یورپی اور چالیس ہزار دیسی سپاہیوں پر مشتمل ہے اس لیے سلطان کی مدد کرنے میں کوئی اندیشہ نہیں۔ گورنر نے شہنشاہ کو یہ بھی لکھا کہ:

"ماریشس میں اس وقت بغاوت پھیل رہی ہے اس لیے سلطان کو براہِ راست مدد بھیجنا مناسب ہو گا۔ اس مقصد کے لیے پہلے اس امیہ پر قبضہ کیا جائے۔"

اس ساری کاروائی کو انتہائی پوشیدہ رکھا گیا۔ یہاں تک کہ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ سلطان کا یہ خط فرانسیسی حکومت کو پہنچا بھی یا نہیں مگر یہ کتنے نطف کی بات ہے کہ انگریزوں کو اس معاملہ کی خبر پہنچ گئی تھی اور یہ کام انگریزوں کے گروگوں یعنی سلطنتِ خداداد کے نمک حراموں اور خدادر نے کیا تھا۔

سلطان نے اس سلسلے میں شاہِ افغانستانِ زمانِ شاہ کے پاس بھی اسی طرح کی ایک

روانہ کی تھی۔ اس سفارت میں سید حبیب اللہ اور نواب بنگی (سید محمد رضا خان) شامل تھے۔ سلطان نے سفارت کے ہاتھ جو خط لکھا اس میں تحریر تھا کہ:

شاہِ افغانستان کا اسلامی فرض ہے کہ وہ کافروں کو ہندوستان سے نکلانے میں سلطان کی مدد کرے۔

یہ سفارت کچھ اور کراچی کے راستے کابل پہنچی۔ شاہِ افغانستان نے سلطان کو جواب میں یہ اطمینان دلایا تھا کہ وہ فکر نہ کریں کیونکہ میں (شاہِ افغانستان) بہت جلد ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہوں۔

سلطان نے شاہِ افغانستان کا خط پاتے ہی اسے دوسرا خط لکھا جس میں اسے فرانسیسیوں کی متوقع مدد کی اطلاع دی گئی تھی اور شاہ کو لکھا گیا تھا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کسی طرح کرے۔ سلطان کے اسی خط کے جواب میں شاہِ زمانِ والی افغانستان نے دسمبر ۱۷۹۸ء میں لاہور پر حملہ کیا تھا۔

زمانِ شاہِ والی افغانستان، تیمور شاہ کا بیٹا اور احمد شاہ ابدالی کا پوتا تھا۔ وہی احمد شاہ ابدالی جس نے ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کو پانی پت کی جنگ میں شکست دے کر انہیں شمالی ہند سے ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دیا تھا۔

زمانِ شاہ بڑی تیزی سے کابل سے نکلنا اور بغیر مزاحمت کے لاہور پہنچ گیا۔ انگریزوں کو یہ تو معلوم تھا کہ سلطان پٹنوکا ایران اور افغانستان سے جوڑ توڑ میں لگا ہوا ہے مگر انہیں یہ گمان نہ تھا کہ زمانِ شاہ اس قدر جلد ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔

زمانِ شاہ کے لاہور پر قبضہ سے انگریزوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لاہور سے دہلی کا فاصلہ اُن دنوں بیس منزلوں کا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر زمانِ شاہ، دہلی کی طرف بڑھے تو کم از کم بیس دن میں دہلی پہنچے گا۔

انگریز چلنتے تھے کہ زمانِ شاہ کو روکنے کی طاقت مرہٹوں میں نہیں ہے۔ اگر زمانِ شاہ دہلی پہنچ گیا تو ممکن تھا کہ وہ شہنشاہِ ہند کو سہارا دے کہ انگریزوں کے خلاف کھڑا کر دے اور پھر ان کو ہندوستان سے نکلنا پڑے۔ اس لیے وہ فوراً حرکت میں آ گئے اور انہوں نے افغانستان

یہ دہی زمانہ تھا جب سلطان، ماریشس کے گورنر کو دو خطرہ دانہ کر چکا تھا اور اب ایک دفعہ سمجھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس چالاک شخص نے سلطان کو یہ تاثر دیا کہ وہ سلطان اور گورنر ماریشس کی مراسلت سے واقف ہے۔

سلطان کے وزرا نے فرانکوئیس کی شدید مخالفت کی۔ انہوں نے سلطان سے صاف الفاظ میں کہا کہ یہ شخص جعلی ہے اور اس کا آزادی کے ساتھ سرنگا پٹم میں گھومنا خطرہ ہے۔ مال نہیں۔ اس لیے اسے گرفتار کر کے اس وقت تک قید رکھا جائے جب تک فرانسیس اس کے متعلق کوئی واضح اطلاع نہیں آتی۔

مگر۔

سلطان نے اپنے وزیروں کے اعتراض پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ فرانکوئیس کو ماریشس پہنچانے کے لیے سلطان نے ایک آدمی کو سترہ ہزار روپے دیے کہ وہ ایک جہاز خریدے تاکہ وہ ریپاڈ ماریشس جاکر سلطنتِ خدا داد کے لیے تین ہزار جہتیں اور دس ہزار فرانسیسی فوجی بھرتی کر کے لے آئے۔ مگر سلطان نے جس شخص کو رقم دی وہ رقم لے کر فرار ہو گیا۔

سلطان کے لیے اب یہ ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ اس نے ابھی کچھ ہی دن پہلے اسی مسئلہ میں کچھ تاجروں کو ایک جہاز پر ماریشس بھیجا تھا اور اب ریپاڈ کے ساتھ محمد ابراہیم اور حسین علی خاں کو جانا تھا۔

بہر حال، سلطان نے نئے جہاز کی تیاری کا حکم دیدیا۔ ریپاڈ کو سرنگا پٹم بھیج دیا گیا کیونکہ مارشوں کے موسم میں منگور کی بندرگاہ بند کر دی جاتی تھی۔

آخر جہاز تیار ہوا اور ریپاڈ، محمد ابراہیم اور حسین علی خاں ماریشس روانہ ہوئے۔ ایک ماہ کے بڑے سفر کے بعد یہ لوگ ماریشس پہنچے۔

اس وقت ماریشس کا گورنر میلنگ تھا۔ ریپاڈ نے گورنر سے علیحدگی میں کچھ گفتگو کی۔ پھر گورنر نے سلطان کے دونوں وکیلوں کا پُر تپاک استقبال کیا۔

پھر جب گورنر نے فوجی تعاون اور سپاہیوں کی بھرتی کی گفتگو شروع ہوئی تو سلطان کے وکیلوں نے غصے سے کہا کہ ریپاڈ کا رویہ اور انداز بڑا افسرانہ اور محتاط ہے۔ وہ کچھ مول باتیں کرنے لگا تھا۔

گورنر نے وکیلوں کو بتایا کہ ماریشس میں فرانسیسی فوجیوں کی تعداد اس قدر کم ہے کہ وہ

میں زماں شاہ کے بھائی کے ذریعے بغاوت کرادی۔

زماں شاہ کو اپنے ملک میں بغاوت کا پتہ چلا تو وہ لاہور سے سرپرہ پیر رکھ کر کابل کی طرف روانہ ہو گیا اور سلطان منہ دیکھتا رہ گیا۔

زماں شاہ کے ساتھ صرف ۲۲ ہزار سپاہی تھے۔ سر جان شور کے خیال میں زماں شاہ نے ہندوستان پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے محض تجربہ کے لیے لشکر کے ساتھ لاہور تک کا سفر کیا تھا تاکہ آئندہ حملہ کے لیے اندازہ لگا سکے۔

مگر۔ بعد میں یہ بات کھلی کہ اگر زماں شاہ دہلی پہنچ جاتا تو نہ صرف دہلی پر قبضہ ہو جاتا بلکہ اٹال لشکر تو سلطنتِ اودھ پر بھی قابض ہو سکتا تھا۔ پھر انگریزوں کو ہندوستان سے اپنا یوریا بستر بیٹنا پڑتا۔

انہی دنوں منگور میں نرکی لباس پہنے ہوئے ایک شخص دکھائی دیا۔ یہ شخص انگریز اور فرانسیسی زبان بڑی روانی سے بولتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستان میں بولی جانے والی بہت سی زبانوں سے بھی واقف تھا۔

اس شخص کے کئی نام تھے۔ بصرہ میں وہ عبداللہ، سورت میں دویش اور ماریشس میں ملاش کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

یہ غیر ملکی اپنے جہاز میں شاید فرانسیس سے منگور پہنچا تھا۔ منگور میں اس کی ملاقات میر غلام علی منگور سے ہوئی۔

اس نے غلام علی منگور سے کو بتایا کہ اس کا اصل نام فرانکوئیس ریپاڈ ہے اور وہ ماریشس میں نائب کمانڈر تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں اس لیے آیا ہے تاکہ سلطان سے ان رضا کاروں کے بارے میں گفتگو کرے جو سلطان کی مدد کے لیے سرنگا پٹم آنا چاہتے ہیں۔ منگور نے اسے سرنگا پٹم بھیج دیا۔

سلطان نے فرانکوئیس ریپاڈ کی باتیں بڑے غور سے سنیں اور اس بارے میں اپنے وزرا سے صلاح مشورے کیے۔

ماریشس ایک جزیرہ ہے جو براعظمِ افریقہ کے جنوب مشرقی ساحل کے قریب واقع ہے۔ اُن دنوں یہ سلطنتِ فرانس کی ایک نوآبادی تھی۔

سلطان کی مدد کرنے سے معذور ہے۔

اس وقت دکیوں نے ریپاڈ پر دباؤ ڈالا کہ وہ گورنر کو رضا مندر سے مگر وہ جلسہ سنا نہ کر سکتا تھا اس نے کیا۔ البتہ گورنر نے وعدہ کیا کہ وہ ان کی آمد کو موثر بنانے کی ذاتی طور پر کوشش کرے گا۔

پس۔ گورنر نے سرکاری طور پر ایک اعلان شائع کرایا جس میں سلطان کے یہ رضا کاروں کی فراہمی کا ذکر کیا گیا۔

دکیوں نے بھی اعلان کیا کہ ہندوستان میں انگریزی مقبوضات کے خلاف ایک اقدالی جنگ چھڑنے والی ہے بلکہ اس وقت تک وہاں جنگ شروع ہو چکی ہوگی۔

آخر رضا کاروں کی بھرتی شروع ہوئی لیکن صرف ۹۹ رضا کار دستیاب ہو سکے۔ ان میں بری فوج کا کمانڈر موسیو سیو، بحری فوج کا کمانڈر موسیو ڈیوبک، یورپی فوج کا کمانڈر دیوین، توپ خانہ کے دو افسر، بحریہ کے چھ افسر، جہاز سازی کے چار ماہرین، ۲۶ عام افسر، کمیشنڈ فیو ۳۶ یورپی سپاہی اور ۲۲ حبشی اور دو غلی نسل کے سپاہی شامل تھے۔ یہ تمام لوگ جہاز میں سوار ہو کر میسور روانہ ہو گئے۔

جب یہ لوگ منگلور کے ساحل پر اترے تو اس سے دو دن پہلے لارڈ ولزلی ہندوستان پہنچا تھا۔

سلطان نے ان رضا کاروں کا پرتپاک استقبال کیا۔ محمد ابراہیم اور حسین علی خاں کو ان کی کامیابی پر داودی اور ان کم تعداد رضا کاروں کو بہتر شرائط اور معقول مشاہرہ پر سلطنت خداداد کی ملازمت میں لے لیا۔

لارڈ مارلٹن ولزلی، کارنوالس کی جگہ پر گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا تھا۔ اس وقت نرسوہیہ نہیں بنی تھی اور یورپ سے ہندوستان آنے والوں کو پورے براعظم افریقہ کا کئی ہزار میل کا چکر لگا کر اس امید ہوتے ہوئے ہندوستان آنا پڑتا تھا۔

جب ولزلی لندن سے اس امید پہنچا تو وہاں اس کی ملاقات ہندوستان کے تین انگریز سپاہی شاطروں سے ہوئی۔

ان میں سے ایک نوجنرل میڈوز تھا جو سلطان کا جانی دشمن تھا۔

دوسرا جنرل بیئرڈ تھا جو عرصہ تک سلطان کی قید میں رہ چکا تھا۔

اور تیسرا نیجر کرک پیٹرک تھا جو ایک مدت تک پونا اور حیدرآباد دکن میں ریڈیٹ رہ چکا تھا۔

ولزلی اور ان شاطروں میں ہندوستان اور خصوصاً میسور اور سلطان کے بارے میں بہت کھل کے بات چیت ہوئی اور کارنوالس نے ولزلی کو سلطان اور ہندوستان کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس کی نہ صرف تصدیق ہوئی بلکہ ان شاطروں نے ولزلی کو اس کے خیال میں بے انتہا معلومات فراہم کیں اور وہ سلطان کا کارنوالس سے بھی بڑا دشمن ہو گیا۔

ارل آف مارلٹن کا وطن آئر لینڈ تھا۔ وہ ۸ جون ۱۷۹۰ء کو پیدا ہوا۔ اس کا پورا نام آرچرڈ کولی ولزلی تھا۔ وہ ۱۷۸۲ء میں پارلیمنٹ کا ممبر بنا اور اسی وقت سے اس نے ہندوستان کی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔

ولزلی کو پارلیمنٹری طرز حکومت قطعی پسند نہ تھا۔ اس کی شخصیت میں شخصیت پرستی اور شاہ پسندی بدرجہ اتم موجود تھی۔ فرانسیسیوں سے اسے خاص طور پر دشمنی تھی اس لیے کہ اس کے زمانے میں فرانسیس میں جمہوریت قائم ہو رہی تھی۔

ولزلی کو فرانسیسیوں کے ساتھ جو مخصوص دشمنی تھی اس کی ایک اور وجہ بھی تھی جس کے بارے میں ایک مؤرخ نے لکھا ہے:

”لارڈ ولزلی کی بیوی ایک فرانسیسی خاتون تھی جس کے ساتھ لارڈ صاحب شادی سے پہلے ہی تعلقات کی تمام حدیں پھلانگ چکے تھے۔ پھر بعد ایک بہت بڑے جھگڑے کے، انہیں اس سے شادی کرنا پڑی۔“

پھر جب ولزلی کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنایا گیا تو اس نے بیوی سے ساتھ چلنے کو کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اگرچہ اس نے طلاق نہیں لی مگر ان میں علیحدگی ہو گئی۔

یہی وہ خاص وجہ تھی جس کے سبب ولزلی فرانسیسیوں کا جانی دشمن تھا؟

قارئین کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ انگلستان اور فرانس میں زمانہ قدیم سے دشمنی چلی آرہی ہے مگر اس کے باوجود ان دونوں ملکوں میں شادی بیاہ کا سلسلہ بھی ہمیشہ قائم رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں ملکوں میں خاندانی رشتہ داریاں تھیں جس کی وجہ سے بھی دونوں ملکوں میں دوستی ہو جاتی تھی اور کبھی جنگ بلکہ شدید جنگ چھڑ جاتی تھی جو یورپ سے نکل کر ان کی نوآبادیوں تک جا پہنچتی تھی۔

چنانچہ کرک پیٹرک نے دلہنی کو یہ نکتہ کی بات بتادی تھی کہ جب تک ہندوستان میں فرانسیسیوں کا اثر مسوخ رہے گا تب تک انگریز نہ تو پورے ہندوستان پر قابض ہو سکیں گے نہ چین سے رو سکیں گے۔

دلہنی نے ہندوستان پہنچ کے جو خط وڈنڈ اس کو لکھا تھا اس سے اس کے وہ تمام ارادے ظاہر ہو جاتے ہیں جنہیں وہ ہندوستان میں رہ کر پورا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس طویل خط میں لکھا:

”میرے گاہک کی صلح کے بعد اب اس ملک میں اندرونی طور پر مکمل سکون ہے مگر اس کے گرد پیش کے ہمارے اتحادی (نظام اور مرہٹے) اندرونی بغاوتوں، باہمی لڑائیوں اور پیغم انقلاب کے بعد اب بالکل خستہ حال ہو گئے ہیں۔

جہاں تک بیٹو سلطان کا تعلق ہے وہ اپنی طاقت مجتمع کرنے کے محمول بڑھانے اور اپنی فوج کو اعلیٰ تربیت دینے میں مصروف ہے اور اب کچھ عرصہ سے وہ دہلی علاقوں کو ہمارے خلاف اُگسا رہا ہے۔ اس نے نظام دکن کو یقیناً ایک خط بھیجا تھا جبکہ وہاں کا وزیراعظم (جو ہمارا دوست تھا) پوچھا گیا ہوا تھا۔ اس نے حیدرآباد کی بساط سیاست پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اب حیدرآباد میں سلطان کا ایک وکیل رہتا ہے سلطان نے پونا (مرہٹوں کا مرکز) میں بھی اپنے وکیل بھیجے ہیں۔ اس طرح وہ ہمارے خلاف دشمنی کو ہوا دے رہا ہے۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا ہم بلا فحاشی اور بلا نیابت بیٹو کی اس دشمنی کو صبر سے بیٹھے دیکھتے رہیں ؟

اس معاملہ میں میری رائے یہ ہے کہ ہم بیٹو کو مخاطب کرتے وقت کوئی سخت کلمہ نہ لکھیں۔ دوسرے یہ کہ ہم اس کی چابازیوں پر چشم پڑی نہ کریں بلکہ اسے بتادیں کہ اس کی کوئی دغا بازی ہم سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

دلہنی اپنے ایک اور خط میں لکھتا ہے:

”ان حالات میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظام ہماری دوستی حاصل کرنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نظام سے اس کی فوجیں الگ کرنے کے لیے خط و کتابت کرنا چاہیے۔“

اس وقت نظام کے دربار میں جیس کرک پیٹرک ریزیدنٹ تھا۔ پیٹرک بڑی رنگین طبیعت کا مالک تھا۔ کہنے کو تو وہ انگریز ریزیدنٹ تھا مگر حیدرآباد کی کوئی ایسی بڑی عقل نہ ہوتی تھی کہ جس میں پیٹرک موجود نہ ہوتا۔

نظام کے تمام بڑے بڑے سول اور فوجی افسر اس کے ہم نوالہ وہم پیالہ تھے اور ہر روز کسی نہ کسی افسر کے ہاں محفل نشاط جتنی تھی جس میں شراب و کباب کے ساتھ شباب کا بھی انتظام ہوتا تھا۔

پیٹرک اس قدر بنگ اور بے باک تھا کہ اس نے حیدرآباد کے ایک امیر کی بیٹی کے ساتھ بیاہ کر لیا تھا۔ جس کے بارے میں واضح نہیں کہ اس نے اس کے ساتھ باقاعدہ بیاہ کیا تھا یا اسے داشتہ بنا کے رکھ چھوڑا تھا۔

”میر عالم کی سوانح عمری“ نامی کتاب جس کے مصنف محمد سراج الدین طالب حیدرآبادی ہیں، نے اپنی اس کتاب میں پیٹرک کے بارے میں لکھا ہے:

”جیس حیدرآباد میں اپنا ریزیدنٹ ہونے کے زمانہ میں اپنی راتیں اس مکان میں گزارتا تھا جو اس ریزیدنٹسی کے سرکاری مکان کے قریب ہی واقع تھا۔ اس مکان میں جیس کی ایک داشتہ رہتی تھی۔ اس داشتہ کی دوستی نواب عاقل الدلہ کی نواسی خیر النساء بیگم سے تھی۔ خیر النساء کے باپ کا نام ہدی یا رضاں اور ماں کا نام شرف النساء بیگم تھا۔ خیر النساء وزیر دکن میر عالم کے رشتہ میں بھی ہوتی تھی۔ وہ جیس کی داشتہ کے پاس

اور اسے مجبور کیا کہ وہ نظام دکن کو انگریزوں کے "سب سی ڈیاری" سسٹم کو ماننے پر مجبور کرے
لیونکہ فرانسیسیوں کی شورش کو صرف انگریز ہی دبا سکتے ہیں اور انگریز اس وقت تک حرکت میں
نہیں آئیں گے جب تک نظام ان کے "سسٹم" کو تسلیم نہ کرے۔

پنابچہ وزیر اعظم نے نظام دکن کو مشورہ دیا:
"عالی جاہ - وقت کا تقاضہ ہے کہ ہم فوراً انگریزوں کا تعاون حاصل کریں کیونکہ صرف انہی کی
فوجیں فرانسیسی شورش کو ختم کر سکتی ہیں۔"

نظام دکن کے سامنے یہ "سسٹم" ایک بار پہلے بھی پیش کیا گیا تھا لیکن وہ ایک خود دار
عمران تھا۔ اس نے اسے ماننے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ تاہم اب حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ نظام نے
کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا:

"ہم مانتے ہیں کہ انگریز اس شورش کو ختم کر سکتے ہیں مگر اس کی حالت تو اس ضرب المثل کے
مانند ہو جائے گی کہ آسمان سے گرا تو کچھ زمین اٹکا۔ فرانسیسیوں سے جان چھڑانے کے لیے اگر ہم
انگریز فوجوں سے کام لیں گے تو ان کے جنگل سے نکل کر ہم ان کے جنگل میں پھنس جائیں گے اور
پہری مطلق العنانی ختم ہو جائے گی۔"

نظام کا اندازہ بالکل درست تھا۔
اس نے شاید اس سسٹم پر پہلے ہی اچھی طرح غور و خوض کر لیا تھا مگر اس وقت فرانسیسیوں کی
شورش کو دبانے کا بھی ضروری تھا۔

وہ گوگلو کے عالم میں تھا کہ اس کے وزیر اعظم نے کہا:

"عالی جاہ - انگریز فوج تو آپ کی ملازم ہوگی۔ اسے آپ کے خزانے سے تنخواہ ملے گی اور
اس کے قیام و طعام کی ذمہ داری ہمارے حکام کے سپرد ہوگی۔ پھر وہ ہم پر حاوی کیسے ہو سکتی
ہے۔ جس طرح میں آپ کا غلام ہوں اسی طرح انگریز فوج آپ کی غلام اور پروردہ ہوگی۔"

نظام دکن کے گرد یہ جال بڑی خوبصورتی کے ساتھ پھیلا گیا تھا کیونکہ بعد میں اس بات کا پتہ
چلا کہ انگریز فوج کو حیدرآباد کے قریب گنتور میں خفیہ طور پر تیار رکھا گیا تھا اور جیسے ہی
فرانسیسی شورش شروع ہوئی انگریز فوج کو حیدرآباد کی طرف پیش قدمی کا حکم دے دیا گیا تھا
پنابچہ جس وقت نظام اور وزیر اعظم اسطو جاہ میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، انگریز فوجیں حیدرآباد
کی سرحد پر پہنچ چکی تھیں۔

روز آیا کرتی اور اکثر راتیں وہیں گزارتی تھی۔

روزانہ آنے جانے کی وجہ سے غیر النساء پر پیٹرک کی نظر میں بھی
پڑتی تھیں۔ پھر ان دونوں میں تعلقی پیدا ہو گیا اور اس لڑکی میں
ریڈیڈٹ کی دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی۔

جلد ہی یہ بات ہر طرف پھیل گئی۔ اس پر ریڈیڈٹ پیٹرک
نے اس لڑکی کو اپنی ریڈیڈٹ کی کمان میں داخل کر لیا۔

ریڈیڈٹ پیٹرک کی چہرہ و سنیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ دوسرے امرائے دولت کے
علاوہ میر عالم جسے انگریزوں نے وزیر اعظم بنایا تھا، اس نے بھی لارڈ ولزلی سے پیٹرک کی
تشکایت کی تھی۔

ولزلی انگلستان سے اپنے ساتھ جو فدا مول لے کے آیا تھا اس کا نام تھا:

"سب سی ڈیاری"

اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اپنی فوج برخواست کر کے انگریز فوج کو اپنی
مدد کے لیے رکھنا۔

یعنی ولزلی یہ چاہتا تھا کہ ہندوستانی حکمرانوں کو اس ہلت پر مجبور کر دے کہ وہ اپنی فوجیں
برخواست کر کے اپنی حفاظت کے لیے انگریز فوجوں کو ریاست میں رکھیں۔

اس عمل سے ہر حکمران، انگریزوں کے ماتحت ہو جاتا۔ پنابچہ ولزلی نے اس فارمولے کا
پہلا تجربہ نظام دکن پر کرنے کا فیصلہ کیا۔

نظام کے پاس اس وقت کافی تعداد میں فرانسیسی فوجیں موجود تھیں اور ان کا اثر نظام
پر تھا۔ ان نظام کا وزیر اعظم انگریزوں کا دوست تھا۔

ولزلی نے کسی طرح دکن میں موجود فرانسیسی فوج میں شورش پیدا کرادی۔

ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟

اس کا پتہ کسی کو نہیں چل سکا۔ جب فرانسیسی فوج میں نظام کے خلاف بغاوت کے آثار پیدا
ہوئے تو نظام گھبرا گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ دکن کا تاج و تخت اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔
ولزلی ایسے ہی موقع کا منتظر تھا بلکہ یہ موقع اس نے خود ہی پیدا کر لیا تھا۔

ولزلی نے اپنے ریڈیڈٹ کے ذریعے فوراً انگریزوں کے پروردہ وزیر اعظم اسطو جاہ کو بلا

ارسطو جاہ کو فوجوں کے آنے کی خبر ملی تو وہ حیران رہ گیا مگر اب کیا ہو سکتا تھا !
نظام ادکن نے فکر مند نظروں سے ارسطو جاہ کو دیکھا اور گھٹی گھٹی آواز میں بولا :
"ارسطو جاہ - خوب غور کر لو - ایسا نہ ہو کہ ہم انگریزوں کے ہاتھوں بالکل بے دست و پا ہو
کر رہ جائیں۔"
"عالی جاہ کو تردد و فرسے کی ضرورت نہیں۔"

ارسطو جاہ نے نظام کو سہارا دیا :

"فوج انگریز کی ہو یا ہماری - ملازم تو ہماری ہوگی - ہم اس کے حاکم ہوں گے - شاہی وقار
کو کوئی دھچکا نہیں لگے گا - بس آپ کے حکم کی دیر ہے - انگریزی فوجیں حیدر آباد کی سرحد پر
پہنچ چکی ہیں۔"

آخر نظام نے ہتھیار ڈال دیے :

"اچھا - تم جیسا مناسب سمجھو ویسا کر سکتے ہو۔"

نظام کی رضامندی حاصل ہوتے ہی ملک فروش ارسطو جاہ نے چند گھنٹوں کے اندر اندر تین شرط
پر مشتمل معاہدہ نظام کے دستخط کے لیے سامنے رکھ دیا -

معاہدہ کی شرائط حسب ذیل تھیں :

۱۔ نظام الملک چھ ہزار فوج توپ خانہ کے لیے رکھیں گے جس کے افسر
انگریز ہوں گے -

۲۔ اس فوج کے اخراجات ریاست حیدر آباد برداشت کرے گی -

۳۔ تمام فرانسیسیوں کو برخواست کر دیا جائے اور آئندہ ریاست میں سوائے

انگریزوں کے کوئی اور یورپین ملازمت نہ کر سکے -

نظام ادکن جال میں پوری طرح جکڑ گیا تھا -

فرانسیسیوں کی شورش سامنے تھی -

انگریزی فوجیں حیدر آباد پہنچ چکی تھیں -

سوائے معاہدہ پر دستخط کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا - اس نے پچھتم نم معاہدہ پر دستخط
کر دیے -

کلکتہ میں جیمز آٹکونسل کے اہل میں ایک تصویر آویزاں ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ

دلہنی کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہے جس پر ،
"سب سی ڈیاری حیدر آباد ۱۷۹۸ء"
لکھا ہوا ہے -

اس معاہدہ پر دستخط ہوتے ہی حیدر آباد کی آزادی اور خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا !

دلہنی نے سلطنت خداداد کو مٹانے کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا اس کی بنیادیں پہلی اینٹ
پر رکھی گئی کہ نظام ادکن کو گھیر کے سازش کے ذریعے مجبور کیا گیا کہ وہ دلہنی کے سب سی ڈیاری
سسٹم کو قبول کرے - چنانچہ نظام ادکن نے اس معاہدہ پر دستخط کر کے اپنی آزادی کو نہ صرف
ختم کر دیا بلکہ خود کو بالکل اس طرح انگریزوں کی گود میں ڈال دیا جس طرح کرناٹک کے والا جاہ محمد علی
نے کیا تھا -

والا جاہ محمد علی کہنے کو تو ایک آزاد ریاست کا حکمران تھا لیکن اس کے پاس نہ کوئی اختیار تھا نہ
فوج تھی - اس کی فوج انگریزی فوج میں ضم کر دی گئی تھی - اب نظام ادکن کی بھی یہی کیفیت و حالت ہو
گئی تھی -

اس سلسلے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ، انگریزی تاریخوں کے حوالے سے لکھا گیا ہے - اب آئیے
دیکھتے ہیں کہ اس موت کے محضر یعنی سب سی ڈیاری سسٹم "کے بارے میں خود حیدر آباد کی تاریخ
کیا کہتی ہے -

یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ دلہنی کے تمام اقدامات کا مقصد صرف اور صرف سلطنت خداداد کو
مٹانا تھا -

"تاریخ نظام علی خاں" مطبوعہ حیدر آباد دکن کے مصنف اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں :

جنگِ میسور

۱۷۹۹ء

۱۲۱۳ھ

اسبابِ جنگ :

سلطان کے لڑکے جو صلح نامہ کے تحت بطور برغمال کمپنی کی زیر نگرانی

پاس فرانس سے دو سو فرانسیسی سپاہی اور عہدیدار آئے ہیں۔
انگریز مورخ اس فوج کے آنے سے خیال کرتے ہیں کہ سلطان نے
یہ فوج اس لیے بلوائی تھی کہ وہ انگریزوں سے اپنی بچھی شکست کا
بدلہ لینا چاہتے تھے لیکن اس بات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ
سلطان کو انگریزوں سے بدلہ لینے کے لیے فرانس کے صرف ۲۰۰ سپاہی
چاہیے تھے۔

اب رہا خلیفۃ المسلمین کو خط لکھنے کا سوال تو اس سلسلے میں یہ بات
ظاہر ہے کہ ہر مسلمان بادشاہ اپنی بادشاہت کی سند خلیفہ سے منگواتا
تھا اور سلطان نے اب تک یہ سند حاصل نہیں کی تھی۔ اس لیے ممکن ہے
کہ سلطان نے خلیفہ سے سند سلطانی منگوانے کے لیے سفارت بھیجی ہو۔
دوسری بات یہ کہ سلطان اور انگریزوں کے معاہدہ میں کوئی ایسی
شرط نہ تھی جس سے انہیں اندرون ملک اور بیرون ملک سفارتی
تعلقات قائم کرنے سے روکا گیا ہو۔

بہر حال سلطان کے ان اقدامات کو انگریزوں نے کمال شک
شبہ کی نظر سے دیکھا اور فیصلہ کیا کہ جس قدر جلد ہو سکے، ان کی
روز افزوں ترقی کو روک کر ان کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر
دیا جائے۔

اس کے لیے سب سے پہلے ولزلی نے مدراس گورنمنٹ کی فوج کو
مالابار اور کورومندل میں اترنے کے احکامات دیے۔ اس کے
بعد مرہٹوں اور نظام سے ایک نئے معاہدہ کی کوشش بھی شروع ہوئی
تاکہ جنگ کی صورت میں یہ دونوں طاقتیں انگریزوں کے ماتحت
سلطان کا مقابلہ کریں۔

اس کے ساتھ ہی انگریزوں کی نظر مرہٹہ دربار پونا پر بھی تھی۔ جس وقت ولزلی ہندوستان
آیا اس وقت پونا دربار مازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔
دولت راؤ سندھیانے نانافرونیس کو قید کر دیا تھا اور باجی راؤ پیشوا بنا ہوا تھا۔ اصل طاقت

نئے وہ ۱۷۹۴ء میں بہ عزت و احترام واپس کر دیے گئے۔ اس کے بعد
سلطان شاید اپنی سلطنت کو وسعت دینے اور مضبوط کرنے میں لگ
گئے۔ انہوں نے قلعہ جات کو مضبوط کیا۔ بعض نئے قلعے تعمیر کرائے پھر
قریب اور دور کے مالک میں سفارتیں بھیجیں۔

ایران کا ایک شہزادہ سلطان کے پاس کافی عرصہ مقیم رہ کر واپس
گیا۔ سلطان نے فرانس کے پولین عظم سے مراسلت کی شاہ افغان
سے کوئی مفاہمت ہوئی۔ ایک سفیر خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی کے
پاس بھیجا گیا۔

سلطان کے یہ تمام اعمال ایسے نہ تھے جن سے وہ جماعت (البتہ
انڈیا کمپنی) صرف نظر کرتی جو انگلستان سے جلب منفعت اور ملک
گیری کے لیے آئی تھی۔ چنانچہ کمپنی کے عہدیداروں نے ان تمام باتوں
پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ سلطان انگریزوں ہی کے خلاف
جارساء عزائم رکھتے ہیں۔

چنانچہ اس کے تدارک کے لیے کمپنی نے اقدام شروع کیے۔
کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز نے لارڈ ولزلی کو اسی لیے ہندوستان
میں گورنر جنرل بنا کر بھیجا تھا اور ولزلی نے حالات پر غور کر کے
ہوئے مرہٹوں کے خلاف نظام دکن کو مدد نہ دینے کے سلسلہ میں
پریسڈنٹ بورڈ آف کنٹرول کو ان الفاظ میں مطلع کیا تھا:
”ہو کوئی دور اندیشی نہیں کہ نظام اور مرہٹے آپس میں لڑ کر کمزور ہو
جائیں اور سلطان آرام میں رہیں۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزوں کا اصل مقصد صرف سلطان کو
نشانہ بنانا تھا۔ اسی لیے گورنر جنرل ولزلی نے کوشش کی کہ مرہٹوں
اور نظام کو معاہدوں کے ذریعے اپنے قابو میں لایا جائے تاکہ وہ
سلطان سے تعاون کر کے اس کے لیے طاقت کا سامان نہ کریں۔
ولزلی جب ہندوستان پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ سلطان کے

دولت راڈ سندھیا کے ہاتھ میں تھی۔

انگریز سلطان سے جنگ شروع کرنے سے پہلے سندھیا کو پونا سے ہٹا دینا چاہتے تھے مگر انہیں خطرہ تھا کہ یہ مرہٹہ سردار سلطان سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ پس — ولزی نے پونا میں اپنے انگریز سفیر کو لکھا کہ: "نانا فرنیس سے یہ عہد لے کر اگر اسے آزاد کر دیا گیا تو وہ انگریزوں کا ساتھ دے گا۔"

یہ خط ابھی انگریز سفیر کو پہنچا ہی تھا کہ مرہٹوں کی آپس میں صلح ہو گئی اور نانا فرنیس آزاد ہو گیا۔ اس طرح انگریزوں کی نفاق ڈالنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔ اب یہی بات مدہ گئی تھی کہ کسی طرح سندھیا کو پونا سے دُور کیا جائے۔ اس کے لیے انگریزوں نے یہ ترکیب کی کہ احمد شاہ ابدالی کا پوتا زماں شاہ والی افغانستان، ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔

اس افواہ سے مرہٹوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ انگریزوں نے دولت راڈ سندھیا کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے شمالی ہندوستان کے مقبوضات کی حفاظت کے لیے پونا سے شمال میں چلا جائے مگر سندھیا نے یہ مشورہ اس کان سے سنا اور اُس کان سے اڑا دیا۔

اب انگریزوں نے ایک اور تدبیر کی۔ انہوں نے مرہٹوں کے صدر مقام آگوا یار میں کرنل کالنس کو سفیر بنا کر بھیجا۔ اس نے وہاں جا کر کیا لگی کھلائے اس کا تو علم نہیں مگر یہ ضرور ہوا کہ گوا یار کے امیروں اور وزیروں میں نفاق پیدا ہو گیا۔

انگریزوں نے جنوب کے علاوہ شمالی ہندوستان میں بھی اپنے ہاتھ پر خوب پھیلایے تھے۔ نواب اودھ، وارن ہسٹنگز کے زمانہ سے انگریزوں کے تابع تھا۔ اودھ کی سرحد پر مرہٹوں کے مقبوضہ علاقے تھے۔ انگریزوں نے اپنی ایک فوج اس سرحد پر بھیج دی اور جواز یہ پیش کیا کہ شاہ افغانستان، ہند پر حملہ کرنے والا ہے اس لیے یہ فوج اودھ کی حفاظت کے لیے تعینات کی گئی ہے۔

دولت راڈ سندھیا کو جب اس کا پتہ چلا تو اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ انگریز اس کے علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فوراً ایک لشکر لے کر شمالی سرحدوں کی طرف چل پڑا۔ اب پونا خالی تھا اور یہی انگریزوں کا مقصد تھا۔

دولت راڈ سندھیا کے منظر سے ہٹتے ہی انگریزوں نے نانا فرنیس اور پیشوا کے سامنے اپنا سب سی ڈیدی سسٹم پیش کیا۔

انہوں نے مرہٹوں کو یقین دلایا کہ پہلے معاہدے پر ہزار ہاں گئے۔ اگر کمپنی اور سلطان میں جھگڑا ہو تو مرہٹوں کو کمپنی کا ساتھ دینا ہوگا۔

یہ بھی انگریزوں کی ایک چال تھی۔ وہ دراصل مرہٹوں سے کسی معاہدے کے خواہشمند نہیں تھے۔ بلکہ صرف یہ چاہتے تھے کہ سلطان سے جنگ کی صورت میں مرہٹے غیر جانبدار رہیں۔ اس لیے انہوں نے ایک اور حرکت کی۔

جب مرہٹے معاہدہ کرنے اور جنگ کی صورت میں ان کو اعلا دہینے پر آمادہ ہو گئے تو انگریزوں نے یہ کہہ کر پونا کی امداد کو متروک کر دیا کہ:

"مرہٹوں کے پیشوانے بغیر اپنے وزیر اعظم نانا فرنیس کو اطلاع دیے سلطان کے سفیروں سے ۱۳ لاکھ روپے وصول کر لیے ہیں۔"

انگریز ایک کے بعد دوسری چال چل رہے تھے۔ روپیہ کا جھگڑا کھڑا کر کے وہ پیشوا اور نانا فرنیس میں نفاق پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ انگریزوں نے جب نظام اور مرہٹوں کو اپنے دامن میں پھانس لیا تو افغانستان کی طرف توجہ کی۔

انہوں نے یہ افواہ اڑائی تھی کہ شاہ افغانستان زمان شاہ ہندوستان پر حملہ کر رہا ہے مگر یہ افواہ حقیقت کا روپ دھار گئی۔ زمان شاہ نے واقعی ہندوستان پر حملے کا ارادہ کر لیا اور اپنی فوجوں کو سرحد کی طرف روانہ کر دیا۔

اب انگریز گھبرائے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر شمال میں زمان شاہ آگئی تو پھر شمال میں وہ اور جنوب میں سلطان پٹو، دونوں مل کے انگریزوں کا خاتمہ کر دیں گے۔ اس کے توڑ کے لیے انہوں نے فوراً مراد آباد پر پی کے ایک شیعہ کو عباس شاہ صفوی کے دربار میں بھیجا۔

انگریزوں کا یہ فرستادہ بہت چالاک اور چرب زبان تھا۔ اس نے عباس شاہ صفوی کے دربار میں جلتے ہی واویلہ بجا دیا:

"اعلیٰ حضرت۔ عالی جاہ۔ شاہ معظم دہائی ہے۔ ہم پر بڑا وقت آن پڑا ہے۔ آپ ہی ہمیں شاہ افغانستان کے علم و متم سے بچا سکتے ہیں۔"

عباس شاہ صفوی اور اس کے درباری اس کے دادیلا سے بہت متاثر ہوئے۔ شاہ ایران نے اس سے دریافت کیا:

”اے شخص۔ تو کون ہے۔ تو کیا چاہتا ہے۔ تجھ پر کس نے ظلم کیا ہے؟“

”عالی جاہ!“

اس چرب زبان نے روتے ہوئے کہا:

”میرا نام کاظم بخاری ہے۔ میرے تمام عزیز و اقارب ہندوستان اور کابل میں رہتے ہیں۔ میں ان سے ملنے گیا تھا۔ وہاں کا حال دیکھ کر میرا سینہ غم سے پھٹ گیا۔ میں نے یہی بہتر جانا کہ میں عالی جاہ کے دربار میں آکر فریاد کروں۔“

”کیا حال ہے کابل کا؟“ شاہ صفوی نے سوال کیا:

”ہیں تفصیل سے بتاؤ۔“

”عالی جاہ۔“

کاظم بخاری نے ٹسو سے ہاتھ ہونٹے کہا:

”افغانستان میں ہم شیعوں پر حدودِ ظلم و ستم ہو رہے ہیں۔ شیعوں کے جان والی محفوظ نہیں۔ ان کے عقاید پر پابندیاں لگائی گئیں اور سینکڑوں شیعہ، شیعہ ہونے کے جسم میں تہ تیغ کیے جا رہے ہیں۔“

یہی حال ہندوستان کا ہے۔ وہاں کے شیعوں پر بھی افغانوں نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔“

مذہبی معاملات میں ہم مسلمان خواہ شیعہ ہوں یا سنی، فوراً بھڑک اٹھتے ہیں اور ہمارے ملک کے بعض علاقوں میں اس وقت بھی شیعہ سنی فساد کی اصل وجہ یہی جلد بازی اور بغیر تحقیق کے قدم اٹھنا ہے۔

چنانچہ کاظم بخاری کی باتیں سن کے شاہ صفوی جذباتی ہو گیا۔ وہ مذہبی جذبات میں ایسا بہا کہ اس نے اس اہم خبر کی تصدیق کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور فوراً افغانستان پر حملہ کی تیاری کا حکم دے دیا۔



شاہ زمان ایک بڑے لشکر کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کے لیے روانہ ہوا تھا۔ ابھی وہ ہند کی سرحد پر پہنچا ہی تھا کہ اس کے وزیر اعظم کا ایک قاصد اس کے پاس پہنچا۔

”شاہ معظم و محترم!“

سوار قاصد نے وزیر اعظم کا خط پیش کرتے ہوئے زبانی کہا:

”وزیر اعظم نے تجھے حکم دیا ہے کہ ان کا یہ خط حنور عالی میں پیش کرتے ہوئے میں ان کی طرف سے یہ بھی عرض کر دوں کہ شاہ ایران عباس صفوی کی فوجیں افغانستان پر حملہ کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔ اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ ہندوستان کی ہم ملوثی کو کے آپ افغانستان کی ملامتی کے لیے فوراً واپس تشریف لے آئیں۔“

زمان شاہ قاصد سے حملے کی خبر سن کر پریشان ہو گیا۔ اس نے جلدی جلدی خط لکھا۔ وزیر اعظم نے زمان شاہ کو یہ بھی لکھا تھا کہ اس نے شاہ ایران کے پاس ایک قاصد روانہ کیا ہے کہ وہ شاہ سے معاہدہ امن کی خلاف ورزی کی وجہ دریافت کرے اور حملہ کو روکنے کی حتی الامکان کوشش کرے۔

یہ زبانی اور تحریری اطلاع ایسی تھی کہ زمان شاہ کو ہندوستان کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے لشکر کے قدم اک دم روکنا پڑے۔ اس نے واپسی کا حکم دے دیا اور کمال پریشانی کے عالم میں کابل واپس پہنچا۔

اس وقت تک ایران کا حملہ تو نہ ہوا تھا مگر وزیر اعظم کا بھیجا ہوا قاصد بھی شاہ ایران سے مل کے اب تک واپس نہ آیا تھا۔

افغانستان کے وزیر اعظم کو اس کے ایک جاسوس نے ان الفاظ میں ایران کے ممکنہ حملے کی اطلاع دی تھی:

”محترم وزیر اعظم۔ جلد کوئی انتظام کیجیے۔ ایران کی فوجیں ہم پر حملہ کرنے کے لیے کیل لگاتی ہیں۔“

سے لیں ہو رہی ہیں۔“

وزیر اعظم بھرا گیا۔ اس نے دریافت کیا:

”عزم کیا تمہیں یقین ہے کہ شاہ ایران ہم پر حملہ کے لیے تیار ہو رہا ہے؟“

عزم نے فوراً جواب دیا:

”محترم وزیر اعظم! میں اس خبر کی تصدیق کر کے آپ کے پاس آیا ہوں۔ فوج کے علاوہ میں نہ

دہان کے عوام میں بھی بڑا جوش و خروش دیکھا ہے۔ وہ بھی افغانستان کے بہت خلاف دکھائی دے رہے ہیں۔

”عجیب بات ہے۔“

وزیراعظم نے خود کلامی کے انداز میں کہا:

”مجھ میں نہیں آتا۔ شاہ ایران یا ایرانی عوام کا ہم نے کیا بگاڑا ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے ہم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔“

”محرم وزیراعظم“۔ عزم نے کہا:

”میں نے ایرانیوں کو باتیں کرتے سنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افغان جو ہمارے بھائیوں پر ظلم و ستم کر رہے ہیں۔ ہم اس کا سخت انتقام لیں گے۔“

”کون ظلم کر رہا ہے۔ کس پر ظلم ہو رہا ہے؟“

وزیراعظم نے فکر مندی کے عالم میں ٹھوڑی دیر بعد دو تیز رفتار سوار حاضر کرنے کا حکم دیا۔ اس نے سواروں کے سامنے سے پہلے پہلے دو مختصر خط لکھے۔ ایک خط شاہ افغانستان زماں شاہ کے نام تھا جس میں اسے ایران کے متوقع حملہ کی اطلاع دے کر اس کے کابل واپس آنے کی درخواست کی گئی تھی۔

دوسرا خط جو شاہ عباس صفوی شاہ ایران کے نام تھا، اس کا متن کچھ اس طرح تھا:

”محضور دالاجاہی شاہ عباس صفوی والا قدر حکمران دولت ایران!

عاجز و ناچیز وزیراعظم افغانستان دالاجاہی کے حضور عرض بردار

ہے کہ دشمنوں نے یہ افواہ اڑائی ہے کہ لشکر ایران افغانستان کی

سرحد کی طرف روانگی کا قصد رکھتا ہے۔

چونکہ شاہ افغانستان زماں شاہ ایک مزاحیہ ہم کے سلسلے میں

کابل سے باہر ہیں اس لیے یہ غلام عرض خواہ ہے کہ ہماری طرف سے معاہدہ

امن کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی گئی۔ اس لیے افغانستان پر حملے کی

کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

امید ہے کہ دالاجاہی اس سلسلہ میں محبت سے کام نہ لیں گے۔ اگر

سلطنت افغانہ کو یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں کہ یہ قہراً خوش بنا

پر کیا گیا ہے کہ ہمارے مابین معاہدے کی ایک شق کے مطابق کہ اگر کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو جائے تو جنگ سے پہلے اس کے بارے میں دونوں اطراف سے وضاحتیں اور گفت و شنید ضروری ہو گی۔

امید ہے کہ دالاجاہی انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے اس کی وجہ اور جوان سے ہیں آگاہ فرمائیں گے!

حقیقہ فقیہ ناچیز:

(وزیراعظم)

شاہ ایران کو جب افغانستان کے وزیراعظم کا نہایت دوستانہ اور بہرہ خواہ خط ملا تو اسے جلد بازی میں اٹھائے ہوئے قدم پر قدم سے افسوس ہوا اور اس نے مزید تحقیق کے لیے زیادتی کو طلب کیا:

”زیادتی کاظم بخاری کو فوراً پیش کیا جائے۔“

زیادتی نے اپنا تہہ بہہ کچھ بتایا نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ شہر میں اجنبی ہے اور ایک سرکاری مراٹے میں ٹھہرا ہوا ہے۔

چنانچہ کو تو تالی شہر کو حکم ہوا کہ شہر کی تمام سرکاری / شاہی مراٹوں میں کاظم بخاری کو تلاش کر کے فوراً دربار میں پیش کیا جائے۔

کاظم بخاری کی تلاش تین روز تک جاری رہی مگر اس نام کا کوئی شخص کسی مراٹے میں بھی گزشتہ ایک سال سے نہ کبھی آیا تھا اور نہ اس نے قیام کیا تھا۔

چنانچہ شاہ عباس صفوی نے اپنے امیروں اور وزیروں سے اس سلسلے میں مشورہ کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کوئی زبردست سازش تھی کہ ایران و افغانستان کو جنگ میں الجھا کر دونوں کی طاقت کو ضعف پہنچایا جائے۔

اُس وقت ایرانی لشکر ہرات پر حملہ کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ شاہ ایران نے لشکر کو فوراً واپس آنے کا حکم دیا۔

انگریزوں کی اس سازش کا حال ایک اور تاریخ میں زیادہ واضح اور ترین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اس میں نام اور مقامات کا بھی فرق ہے اس لیے اسے بھی تاریخین کی دلچسپی اور محلات کے لیے درج کیا جا رہا ہے تاکہ مآثر کا پورا نقشہ سمجھ میں آ سکے۔

مؤرخ اس طرح رقم طراز ہے:

’ولزی کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ فرانسیسی سلطان کی مدد نہ کر سکیں گے تو وہ اب اس سلطان کے دوسرے اتحادیوں کی طرف متوجہ ہوا۔

اس وقت افغانستان کا شاہ ہندوستان پر حملہ کے لیے پُر زور رہا تھا۔ انگریزوں کو خطرہ تھا کہ اگر شاہ افغانستان دہلی تک پہنچ گیا تو پھر انگریزوں کا ہندوستان میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ پس اس نے سوچا کہ کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ شاہ ہندوستان پر حملہ نہ کر سکے اور خود اپنے ملک کے اندرونی معاملات میں ہی الجھ کر رہ جائے۔

ولزی نے اس سلسلے میں اپنے گورنروں کی کانفرنس منعقد کی اور اس میں یہ طے پایا کہ کوئی ایسا شخص تلاش کیا جائے جو ایران پہنچ کے وہاں شیعہ سنی فساد کی بنیاد رکھے اور شاہ ایران کو افغانستان پر حملہ کرنے پر مجبور کر دے۔

یہ کام مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آتا تھا مگر مآثر کے مآثرین نے ایسا زبردست منصوبہ بنایا کہ اس نے انگریزوں کی مرضی کے مطابق ایران اور افغانستان کو لٹا دیا۔

اس کانفرنس کے ایک ہفتے کے اندر اندر بمبئی کے گورنر لارڈ ڈکن نے ولزی کے پاس ایک شخص کو اس سفارتش کے ساتھ بھیجا کہ یہ شخص اس (ولزی) کے منصوبہ کی عملی جامہ پہنا سکے۔

وہ آدمی شہر بمبئی کا ایک شیعہ مہدی علی خاں تھا۔ ولزی نے مہدی سے گفتگو کی اور اسے اپنے منصب کا پایا تو فوراً اپنا منصوبہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

پس مہدی علی خاں (اس کا نام کاظم بخاری بھی لکھا گیا ہے) ایران کے شہر بڑشہر گیا اور فوراً ایرانی رعایا بن گیا۔

وہاں بیٹھ کے اس نے ایرانی اور افغانی میں اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ پھر اس نے شیعہ سنی اختلافات کی داستانوں کو نلک مریج لگا کر سنانا شروع کیا۔ اس نے یہاں تک کہا کہ افغانی، ہندوستانی شیعوں پر اس قدر مظالم توڑ رہے ہیں کہ لاہور کے شیعوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر کمبہنی کے علاقوں میں پناہ لینا شروع کر دی ہے۔

مہدی علی خاں نے ایرانی دربار کو یقین دلایا کہ اگر شاہ افغان نے اس بار ہندوستان پر حملہ کر دیا تو وہ دہلی تک پہنچ جائے گا اور لاہور سے دہلی تک کے تمام علاقوں کے شیعوں کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑے گا۔ اس لیے شاہ کو ہندوستان پر حملہ سے روکنا نہ صرف شیعوں کو بلکہ گھر ہونے سے بچانا ہو گا بلکہ پوری انسانیت پر احسان ہو گا۔

اس زمانہ میں شاہ کے بھائی محمود شاہ کو بھائی سے بہت سی شکایات تھیں مگر کمزور ہونے کی وجہ سے وہ علی الاعلان شاہ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا سکتا تھا۔

ادھر مہدی علی خاں نے اپنی چرب زبانی سے ایرانی امیروں کو پوری طرح اپنا ہمنوا بنالیا تھا۔ پس ایرانی امرا اور وزرا نے شاہ ایران عباس شاہ صفوی پر زور ڈالا کہ وہ شاہ کے بھائی محمود شاہ کی فوجی مدد کر کے افغانستان کا تختہ الٹ دے۔ اس طرح اگر افغانستان کا تختہ نہ بھی اٹا گیا تو کم از کم شاہ ہندوستان پر حملہ کرنے سے توباز رہے گا اور لاہور سے دہلی تک کے شیعہ اس کے اثر سے محفوظ ہو جائیں گے۔

سنا ہی دربار میں شیعوں پر افغانیوں کے مظالم کا تذکرہ روزی ہوتا تھا اور شاہ صفوی اپنے فرقہ کے لوگوں کی مدد کرتا بھی جانتا تھا۔ اس لیے جب اس کے کان میں محمود شاہ کو فوجی مدد دے کر افغانستان میں شورش پیدا کرنے کی بات ڈالی گئی تو وہ فوراً آمادہ ہو گیا۔

اس طرح شاہ ایران، ہمدی علی خاں کے فریب میں بلا واسطہ آگیا اس نے محمود شاہ کو بلا کے ایک ایرانی لشکر اس کے حوالے کیا اور محمود شاہ نے اس لشکر کے زور پر افغانستان کے سرحدی صوبہ ہرات پر حملہ کر دیا۔

جب ایران و افغانستان میں جنگ چھڑ گئی تو ہمدی علی خاں کا کام ختم ہو گیا۔ کیونکہ ہرات پر حملہ کی خبر پا کر زماں شاہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے بجائے کابل واپس چلا گیا تاکہ اپنے ملک کو ایرانیوں کے حملے سے محفوظ کرے۔

زماں شاہ کے کابل آنے پر یہ بات کھلی کہ کسی ہمدی علی خاں نے شاہ ایران کو افغانیوں کے شیعوں پر ظلم و ستم کی غلط داستانیں سن کر ہرات پر حملہ کا جواز پیدا کیا تھا مگر جب ہمدی علی خاں کہیں مصیبت نہ ہو سکا تو یہ سازش کھل گئی۔ شاہ ایران نے ہرات سے فوجیں واپس بلا لیں اور دونوں ملکوں میں از میر نو ایک صلح نامہ ترتیب پا گیا۔

مگر دہلی اپنے منصوبہ میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ زماں شاہ نے ہند پر حملہ متوی کر دیا اور انگریزوں کے افغانستان کی طرف سے دھڑنے ختم ہو گئے۔ یہ سب کچھ اس کے ایجنٹ ہمدی علی خاں کا کوششوں کا نتیجہ تھا۔

دہلی نے بجٹی کے گورنر لارڈ ڈکنسن کو اس منصوبے کی کامیابی کی مبارکباد دی اور اسے حکم دیا کہ ہمدی علی خاں کو اس کی خدمات کے صلہ میں دو لاکھ دس ہزار روپے ادا کیے جائیں۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ فرانسیسی کا جنرل (بادشاہ) پولین برابر فتوحات حاصل کر رہا تھا۔ انگریزوں کو اس بات کا علم تھا کہ سلطان شیخو نے پولین کے پاس بھی سفارت بھیجی ہے اور اس کا جواب میں پولین نے وعدہ کیا ہے کہ وہ موقع ملنے ہی اس کی مدد کو ضرور پہنچے گا۔ اسی سلسلہ میں انگریز امیر انجمن میں کا وہ خط بڑی اہمیت رکھتا ہے جو اس نے اسکاںڈریہ (

ہڈی کو نسل کو کھاتا تھا۔

نیلسن نے اپنے خط میں ممکنہ خدشات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

”انگریز پولین کا قبضہ اسکندریہ پر ہو گیا تو اس کا اگلا قدم ہندوستان میں ہو گا تاکہ وہ شیخو سلطان کی مدد کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ بحر قزحہ کے راستے ہندوستان کے ساحل مالابار تک فرانسیسی بحری بیڑے کی قطار لگ جائے۔“

چونکہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی اس لیے دہلی نے سرنگاپٹم پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ نے فوری طور پر مول اور فوجی حکام کو خطوط اور حکمائے روانہ کیے کہ وہ جنگ کے لیے تیار رہیں۔

نظام دکن کے فوجی تعاون کے لیے دہلی نے کرک پیرٹل کے چھوٹے بھائی کینن کرک پیرٹل نظام کے پاس بھیجا اور کولنر کو سندھیا کے پاس پونا روانہ کیا۔ نظام نے تو انگریزوں کا سب سے ڈیاری سسٹم قبول کر لیا تھا البتہ مرٹوں نے یہ نظام قبول کیا مگر یہ وعدہ کیا کہ جنگ کی صورت میں انگریزوں کی فوجی مدد کریں گے۔

سلطان کو ہواؤں کے رخ سے انگریزوں کے جنگی ارادوں کی تصدیق ہو گئی تھی اس لیے اس نے یوڈیو بک کو پولین کے پاس خط دے کر روانہ کیا۔ اس فرانسیسی افسر کے ساتھ سلطان نے شیخ الرحیم اور محمد بسم اللہ کو بھی بھیجا تھا۔ سلطان نے پولین کو لکھا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے اور مالابار کے ساحل پر اپنی دس سے ۱۰ ہزار فرانسیسی فوج اتار دے۔

اس وفد کو مارشس سے ہو کے پولین کے پاس پہنچنا تھا مگر تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ وفد پیش تو ضرور پہنچا مگر اس کے بعد اس پر کیا گزری اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یقیناً وہ انگریزوں کی دشمنی کا نشانہ ہو گیا ہو گا۔ اس سازش کی تصدیق دہلی کے اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو اس نے سلطان کو لکھے گئے اپنے خط میں ظاہر کیا ہے۔ اس نے لکھا:

"یہ تو ناممکن ہے کہ آپ اس بات سے آگاہ نہ ہوں کہ آپ فرانسینوں سے جو انگریزوں کے دشمن ہیں، جو خط و کتابت کر رہے ہیں اس سے ہم بھی واقف ہیں۔۔۔ ان تمام نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی جو آپ کر رہے ہیں۔ کمپنی سے آپ کی دوستی بھی ختم ہو سکتی ہے۔ آپ کے ملک میں انتشار اور بد نظمی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ کے مذہب کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

آگے چل کے وہ لکھتا ہے:

"حالات کی تحقیق کے لیے مجھ کو نو سو فرانسیسیوں کا پیغام بھیجا جا رہا ہے اور اسے ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ کمپنی کی حفاظت کے لیے سلطان سے جو ملک چاہے، اطلب کرے۔"

دلزلی نے سلطان کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور فوجوں کو تیاری کا حکم دے دیا۔ اس نے دسمبر ۱۷۹۸ء کو امیر البحر کو مندرجہ ذیل حکمنامہ بھیجا:

"نظا کوکن کے ملک میں فرانسیسیوں کی تباہی (نظام دکن نے سب سہی و دیاری معاہدہ کے تحت فرانسیسیوں کی نہ صرف فوج ملک سے نکال دی تھی بلکہ تمام فرانسیسیوں سے ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا تھا) ساعمل کار و مدد اور مالابار پر ہماری فوجی تیاریوں میں ہماری پیش قدمی اور یورپ اور اس امید (جنوبی افریقہ) سے بڑی فوجی کمک کی توقع وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے اس جزیرہ نما (جنوبی ہند) میں ہماری پوزیشن کو بہت مستحکم کر دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور سلطان کی فوجی طاقت کو کچل کے رکھ دوں۔"

اس کے ساتھ ہی فوجوں کی کان منہا کرنے کے لیے دلزلی کلکتہ سے مدراس پہنچ گیا۔ سلطان کو دھکی آمیز خط ۱۲ دسمبر ۱۷۹۸ء کو لکھا تھا۔ اس کا جواب سلطان نے ۲۵ دسمبر ۱۷۹۸ء سلطان کے جواب کے ہر لفظ سے اس کی بے بسی ٹپکتی ہے۔ ملک فروش اور ایمان فروشانہ انداز نے اس شیریز کو حالات کے شگن میں اس طرح جکڑ دیا تھا کہ وہ بالکل بے اختیار ہو کر

سلطان نے دلزلی کو لکھا:

"لارڈ دلزلی اس بات سے آگاہ ہیں کہ سلطنت خدا دین ایک ایسی قوم بھی بستی ہے جو بحری تجارت کرتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک جہاز چاول کے مارشس گیا تھا۔ واپسی پر وہاں چالیس بیروزگار تلاش معاش میں یہاں آئے تھے۔ ان میں سے دس کو سرکاری ملازم رکھ لیا گیا اور باقی جو بے ہنر تھے انہیں واپس بھیج دیا گیا۔"

میرادل مقصد یہ ہے کہ میں نے جو معاہدہ کیا ہے اس پر قائم رہوں اور اسے مستحکم کروں میں اس وقت محل میں تنہائی کی زندگی بسر کرتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھار شکار کو لکھتا ہوں۔ اس پر آپ کا یہ لکھنا کہ اتحادیوں کو خوفناکی ضرورت ہے، انتہائی حیرت کی بات ہے۔ امید ہے کہ آپ دل میں کوئی ایسی ویسی بات نہ آنے دیں گے جس سے دلوں میں میل پیدا ہو۔

ڈچ اہل فرانس کا معاملہ تو وہ لوگ مجسم شیطان ہیں۔ انہوں نے وقت سے فائدہ اٹھا کر زیر بحث اعلان شائع کر دیا تاکہ ہمارے اور آپ کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو جائیں۔

سلح نامہ کی انجام آدھی کے وقت یہ فیصلہ ہوا تھا کہ چاروں فریق اس کے پابند رہیں گے اور اس معاہدہ میں کوئی رد و بدل نہ ہوگا۔ سلطان نے آخر میں لکھا اور پتہ نہیں کتنی مجبور یوں اور دباؤ کے تحت لکھا کہ:

"آپ بڑے سردار ہیں۔ آپ کے دست میں۔ آپ میں قوت فیصلہ بہت عمدہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ دانا اور فرزانہ اصحاب کے دل شکوک اور بدگمانیوں سے آلودہ نہ ہوں گے۔"

میرے متعلق یہی خیال رکھیے کہ میں دل سے اتحاد اور دوستی کا خواہاں ہوں۔ آپ کے خطوط آنے سے مجھے دلی مسرت ہوتی ہے۔ اپنی خیریت سے شادمان کیجیے۔ اور کیا لکھوں۔"

اس کے جواب میں دلزلی نے ایک اور پُر ضرب خط سلطان کو لکھا جس میں تحریر تھا کہ وہ انگریزوں کو اپنے دربار میں رکھے اور اس کے مشورے سے اتحادیوں سے شرائط صلح طے کرانے۔

اس کے فوراً بعد ولزلی نے سلطان ترکی خلیفہ سلیم ثالث کا ایک خط جو انگریز سفیر پنسر کے ذریعہ خلیفہ سے حاصل کیا گیا تھا، سلطان کو بھیجا۔ اس میں سلطان ترکی کی طرف سے سلطان ٹیپو کو لکھا گیا تھا کہ:

”فرانسیسی غدار اور بے ایمان ہیں۔ انگریز ہمارے دوست ہیں۔ فرانسیسی مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ تم (سلطان ٹیپو) فرانسیسیوں سے قطع تعلقی کر کے انگریزوں سے صلح کر لو۔“

خلیفہ ترکی کا یہ خط جیسے پنسر ہی نے تیار کر لیا تھا، اس کے ساتھ ولزلی نے اپنا نوٹ بھی لکھا تھا کہ:

”آپ کے لیے بہتر ہے کہ تمام مذاہب کے دشمن اور خلیفہ اسلام پر حملہ کرنے والے فرانسیسیوں سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لیں۔ خلیفہ کے خط سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ فرانسیسیوں نے خلیفہ کی توہین کی ہے اور بلاوجہ شام و مصر پر حملہ کیا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جن کا احترام ہر مسلمان کرتا ہے اور مذاہب اسلام کے خزانے ہیں۔“

سلطان انگریزوں کے دلی مقاصد سے واقف ہو چکا تھا اور جانتا تھا کہ ولزلی کی یہ خط و کتابت محض اس کے جھلاوے کے لیے ہے۔ پھر بھی وہ ولزلی کے ہر خط کا باقاعدہ جواب دے رہا تھا۔ پہلے اس نے خلیفہ ترکی کے خط کا جواب بھیجا۔ پھر ولزلی کو جواب دیا۔

اسی مہینہ نپولین نے سلطان کے نام ایک خط قاہرہ سے لکھا مگر یہ خط سلطان تک نہ پہنچ سکا اور ضمیر فرشتوں نے بیچ ہی میں اسے اچکایا۔ نپولین کے تاریخی خط کا مضمون یہ تھا:

”عظیم ترین سلطان اور ہمارے بہترین دوست ٹیپو صاحب!

جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ میں بحیرہ احمر تک کثیر فوج کے ہمراہ اس دلی خواہش کے ساتھ پہنچ چکا ہوں کہ آپ کو انگریزوں کے پیچھے سے نجات دلائی جائے۔“

میرا خیال ہے مسقط کے راستے آپ تک پہنچوں مگر اس سے قبل آپ کے ملکی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے اس لیے آپ اپنے ایک بااعتماد

اور بھرپور دہالے آدمی کو سوڈن یا قاہرہ کے راستے میرے پاس بھیجیں تاکہ میں اس کے ساتھ گفتگو کر سکوں۔
خدا آپ کی قوت میں اضافہ کرے اور آپ کے دشمنوں کو غارت کرے۔“

نپولین نے اپنا یہ خط کسی فرانسیسی قاصد کے ہاتھ نہیں بھیجا کیونکہ اس بات کا امکان تھا کہ چونکہ انگریزوں نے سلطان کے گرد وطن فرشتوں اور غداروں کا جال بچھا رکھا ہے اور اگر کسی فرانسیسی قاصد نے سلطان سے ملنے کی کوشش کی تو یقیناً ممکن تھا کہ وہ گرفتار ہو کے قتل کر دیا جائے۔ اس خیال کے تحت نپولین نے یہ خط شریف مکہ، جو سلطان کا ہمدرد اور دینی بھائی سمجھا جاتا تھا، کی معرفت سلطان کو روانہ کیا۔

سلطان کے اس خط کے ساتھ ہی نپولین نے شریف مکہ کو اس خط کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے الگ ایک خط لکھا، جس میں تحریر تھا:

”میں اپنی فوج طرموج کے ساتھ یہاں پہنچ گیا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اسلامی ممالک کو انگریزوں کے ہاتھ سے نجات دلاؤں اور خاص کر آپ کے دینی بھائی سلطان ٹیپو کی مدد کو پہنچوں۔ اعلیٰ میری درخواست ہے کہ آپ وہ خط جو سلطان کے نام ہے، کسی معتبر آدمی کے ذریعے ان تک پہنچا دیتے۔“

مگر وہ ہاشمی زادہ اور دینی بھائی جس کے نام میں تو شریف ”شامل تھا“ دراصل ذات شریف تھا۔ اس نے اپنے نام کا بھی لحاظ نہ کیا اور یہ دونوں خطوط جلد میں مقیم انگریز سیاسی نمائندے سے دس کے والے کر دیے۔

یہ حال تھا اس شریف مکہ کا جو خود کو مسلمانوں کا سب سے بڑا ایڈر کہلاتا تھا۔

چنانچہ۔۔۔ یہ خط سلطان تک کبھی نہ پہنچ سکا۔ یہاں یہ بات میں ملحوظ خاطر رہے کہ اگر یہ خط سلطان کے پاس پہنچ بھی جاتا تو بھی نپولین نے مختصر عرصہ میں ہندوستان اور خصوصاً جوئی ہند پہنچ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ ولزلی نے اس خط کے لکھے جانے سے پہلے ہی اپنی فوجیں سلطنت خدا داد کی حدود میں داخل کر دی تھیں۔

شریف مکہ کی اس ردِ حرکت سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ترکی خلیفہ اور

مکہ کے حکمرانوں پر انگریزوں کا اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ بھی مسلمانوں کو تباہ کرنے میں دشمنوں کی مدد کرنے میں کوئی عار نہ محسوس کرتے تھے۔

سلطان نے کسی موقع پر کہا تھا:

”پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ جیسے انسان ہیں۔ آپ

کو فضیلت محض اس لیے حاصل ہے کہ آپ خدا کے رسول بھی ہیں۔“

اس زمانہ میں عرب اور ترکی میں دہائی تحریک زوروں پر تھی اور خلیفہ ترکی اور شریف مکہ اس تحریک کو پھیلنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے سلطان کے درج بالا جلوں خوب فائدہ اٹھایا۔

انہوں نے خود اپنے طور پر خلیفہ ترکی اور شریف مکہ کی طرف سے اعلان شائع کر کے تمام اسلامی ممالک میں تقسیم کرا دیا۔

اعلان یہ تھا:

”جنوبی ہند کی ریاست سرنگا پٹم کا سلطان پیپوڈا بی ہے اس لیے ہر مسلمان کا اس سے لڑنا جائز ہے۔“

سلطان اگرچہ بظاہر ان حالات سے لاپرواہ معلوم ہوتا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔ چونکہ انتظام حکومت کا بیہیہ کے سپرد تھا اور کاہینہ سلطان کو اندرونی یا بیرونی کسی خبر کی بھی ہوا نہ لگنے دیتی تھی۔ تمام اختیارات وزیراعظم میرصادق کے ہاتھ میں تھے۔ اس کے زمرہ خاص میں ہندو اور مسلمان دونوں قسم کے خدات شامل تھے جن میں پورنیا، تمل راؤ، میر غلام علی خاں، لنگڑا، میر معین الدین، میر قمر الدین، میر قائم اور بدر الزمان ناٹھ پیش پیش تھے۔

ان میں سے بعض نوافذاتی اعتراض کی بنا پر سلطان کے خلاف تھے اور بعض خاص کر میر صاحبان سلطان کی مذہبی اصلاحات کی وجہ سے برگشتہ خاطر تھے۔

انگریزوں نے ان کی مخالفت سے فائدہ اٹھایا اور کھلی رشوت اور بعض کو مستقبل کے دلدے کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔

ولزلی نے جنوری ۱۸۹۹ء میں اپنے ایک خط میں جنرل ہارس کو صاف الفاظ میں لکھا تھا کہ:

”مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ امرا، وزراء، باجگزار اور رعایا

سلطان کے خلاف ہے اور ہمارے سایہ میں آنے کو تیار ہے۔ اب جبکہ

ہیں سلطان کی سختی اور بدعہدی (پتہ نہیں وہ مکار کس سختی اور بدعہدی کی طرف اشارہ کر رہا ہے) کی وجہ سے جنگ کرنا پڑ رہی ہے تو عین انصاف ہے کہ ہم رعایا کی پریشان حالی، بے اطمینانی اور ناراضگی سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کام کے لیے کرنل کلوز، کرنل آر تھوولزی، ایفینٹ کرنل آر گینو، کیپٹن سلیم اور کیپٹن میرکالے کے نام تجویز کرتا ہوں۔“

کرنل آر تھوولزی جو ولزلی کا بھائی تھا، اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ ان باجگزار ریاستوں سے خط و کتابت کرے جو انگریزوں سے مل جانا چاہتی ہیں۔ دوسرا کام یہ کرے کہ ریاست کے معزول راجہ کے خاندان کے ہوازد موجود ہیں ان سے گفتگو کر کے انہیں ریاست کی ان کو واپسی کا یقین دلایا جائے۔

ولزلی نے سلطان کو جو شرائط لکھی تھیں ان میں کنارہ اور منگلور کو کمپنی کے حوالے کر دینے کی بھی شرط رکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ سبھی دیاری سسٹم کو قبول کرنے پر زور دیا گیا تھا لیکن سلطان کو ان شرائط پر گفتگو کا موقع نہیں دیا گیا بلکہ جب ولزلی، کلکتہ سے مدراس پہنچا تو اس نے ان شرائط میں ایک کثیر رقم بطور تادان جنگ ادا کرنے کی شرط بھی شامل کر دی۔ سلطان کو بات چیت کا قطعی موقع نہ دیا گیا اور ۱۳ فروری ۱۸۹۹ء کو انگریز فوج کو کاروائی کا حکم دے دیا گیا۔

سلطان انگریزوں کی ان حرکتوں کو بغور اور بڑی تشویش سے دیکھ رہا تھا مگر جب اس نے انگریزی حدود میں رد و بدل کے سلسلے میں اپنی تشویش سے اپنے امرا کو آگاہ کیا تو وزیراعظم غدار میرصادق نے اسے ہنسی میں اڑا دیا۔ وہ بولا:

”اللہ پاک کی قسم حضور والا۔ یہ فرنگی کئی ہزار میل کا سفر کر کے ہندوستان پہنچے ہیں۔ ان کی فوج بھاری فوج حضور کی تازہ دم اور بہادر فوج سے کس طرح مقابلہ کر سکتی ہے۔ آپ تم غلام انہیں ایسا مزہ چکھائیں گے کہ یہ بھاگ کے اپنے ملک ہی میں جا کر دم لیں گے۔“

سلطان نے قدر سے ناگواری سے فرمایا:

"اگر انگریز ہمارے قوم ہوتی تو ہم فکر مند نہ ہوتے مگر یہ قوم مکار ہے جو میدان جنگ کے بجائے سازش کے قلعہ میں بیٹھ کر عیاری اور غداری کے ہتھیاروں سے لڑتی ہے۔"

ایمان فروش میر صادق نے فوراً جواب دیا:

"یہ تو اور بھی اچھلے حضور والا۔ قسم ہے کلام پاک کی کاٹھ کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی۔ ان کی سازش اور مکاری بار بار تو کامیاب ہونے سے رہی۔"

جب ان کا یہ داؤ ہمارے پیچھے کیے کو معلوم ہے تو ان کا یہ حربہ بیکار ہو جائے گا۔ اس وقت یہ کیا کریں گے؟

سلطان نے سمجھے دل سے میر غلام علی سے پوچھا:

"کیوں میر صاحب۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا ہم انگریزوں کو ان کے ناپاک ارادوں میں ناکام بنا دیں گے؟"

مکار اور عیار میر سنگھ نے جواب دیا:

"حضور والا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اگر اس کا جواب اثبات میں دیا جائے تو اسے خوشامد یا چا پلوسی پر محمول کیا جائے گا اور اگر نفی میں جواب ہو تو وہ دروغ گوئی ہو گا۔ اس لیے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میر صادق نے فرمایا ہے اس کی تائید کر دوں۔"

اب سلطان نے اپنے وزیر ماییت پورنیا کی طرف دیکھا۔ پورنیا اپنا جواب پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔

اس نے پُرسکون لہجے میں کہا:

"حضور والا۔ مجھنا چیز کے خیال میں غداوند، انگریزوں سے خواہ مخواہ خوفزدہ ہو رہے ہیں یہ جو نظام دکن، مرہٹوں اور نواب ارکاٹ سے انگریزوں کے گھٹ جوڑی خبریں اڑاتی جا رہی ہیں یہ بالکل بے بنیاد اور سراسر غلط ہیں۔ بیتہ نہیں ایسی افواہیں کون پھیلاتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ افواہ خود انگریزوں نے ہی پھیلائی ہو تاکہ حضور ان سے خوفزدہ ہوں اور اپنے دوستوں سے دشمنی مول لے لیں۔"

سلطان سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ پورنیا کی بات پر کیا کہتا۔ اس نے بس روایتی سا جواب دیتے ہوئے کہا:

"خدا کرے دی ٹھیک ہو جو تم کہہ رہے ہو مگر ہمیں ان کی طرف سے غافل نہ ہونا چاہیے۔"

پھر سلطان نے قرال الدین کی طرف دیکھ کر حکم دیا:

"فوجوں کو ہر وقت تیار رکھو۔ کیا معلوم کس وقت طبل جنگ بج جائے۔"

تجویز کار گمر قرال الدین نے جواب دیا:

"حضور والا۔ بالکل فکر نہ فرمائیں۔ اب جو جنگ ہوگی وہ ہماری آخری جنگ ہوگی۔"

لیکن —

طبل جنگ بجنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

جول ہارس نے ۲۲ فروری ۱۷۹۹ء کو سلطنت خداداد کی سرحدوں پر حملہ کر دیا۔ ولزلی نے اسے

اختیار دیا تھا کہ دوران جنگ اگر سلطان صلح کی بات کرے تو حالات کے مطابق شرائط طے کی جائیں۔ اگر برطانوی فوج نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لی ہو یا قلعہ پر گولہ باری ہو رہی ہو اور سلطان کی طرف سے صلح کی کوئی درخواست آئے تو سلطان سے اس کی سلطنت دینے کے ساتھ ساتھ دو کروڑ کے تادان کا بھی مطالبہ کیا جائے اور شرائط کے پورا ہونے تک سلطان کے چار بیٹوں کو بطور ضمانت تمہاری تحویل میں دیا جائے۔

جول ہارس کی کمان میں اکیس ہزار فوج تھی۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ ۳ مارچ ۱۷۹۹ء کو سلطنت خداداد کی سرحد میں داخل ہوا۔

حیدر آباد نے اپنی ۱۸ ہزار سپاہ، امیر عالم کی سپہ سالاری میں بھیجو جول ہارس سے کرنل گل کے قریب آنے ملے۔

بھٹی سے جول اسٹوارٹ چھ ہزار فوج کے ساتھ آگیا تھا۔ اس پورے لشکر کا سپہ سالار اعلیٰ ولزلی کا بھائی کرنل آر تھروزلزلی تھا۔

مرہٹوں کا پیشوا باجی راؤ، پیسورام بھاؤ اور اس کے بیٹے آپا صاحب کے ساتھ حسب وعدہ انگریزوں کا مدد کو آگیا تھا۔ سندھیا اس محم کے خلاف تھا اس نے نانا فرنیس کو بھی اس سے باز رکھنے کا گوشش کی۔

مرہٹے دربار میں سلطان کے دو کیل (سفیر) احمد خاں اور غزال الدین موجود تھے۔ انگریز ان دونوں کو پرنس نے نکلنے کی گوشش میں تھے اور مرہٹوں کو بھی سب سی ڈی اے سسٹم قبول کر دینے کی تدبیروں میں تھے۔

میسور کے راستے جول ہارس کا لشکر تین دن سفر کر کے کرگ کی سرحد پر پہنچا اور اس نے مدیوٹا کے راستے کے قریب پٹاؤ ڈالا۔

سلطان کو جیسے ہی اس لشکر کی خبر ملی وہ فوراً فوج لے کر سویسرہ کی طرف چل پڑا۔
جہز ہارس نے سلطان کے آنے کی خبر پا کر جہز اسٹوارٹ کو دہل چھوڑا اور خود مرزا کا پیٹھ کے
راستے پہنچا۔

سلطان چنیا پٹن کے میدان میں پہنچ کے ٹھہر گیا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ انگریز فوج اسی
راستے سے گزرے گی مگر جہز ہارس نے سلطان کی آمد کی خبر پا کر اپنا راستہ کاٹا اور خانخانا ہلی کی طرف
چلا گیا۔

سلطان کو علم ہوا تو وہ بھی یلغار کرتا ہوا خانخانان ہلی کی طرف چلا اور گلشن آباد (مالوہلی) پہنچ
کے انگریزوں کا راستہ روک لیا۔

سلطان کی فوج جس قدر بہادر تھی اس کے سردار اسی قدر ہلکے فروش اور ہلکے حرام تھے۔ اس
وقت بھی پورنیا، میر معین الدین اور میر قمر الدین سلطان کے ساتھ تھے اور سلطان کے لشکر کو نقصان
پہنچانے کی فکر میں تھے۔

جہز ہارس کو اس میدان میں سلطان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بڑی خوریز جنگ ہوئی۔ انگریزوں کا
بہت نقصان ہوا اور قریب تھا کہ جہز ہارس کی فوج میدان چھوڑ جائے کہ غدار پورنیا اور میر معین نے
سلطانی فوج کو انگریز کی قوت خانہ کی زد پر لگا دیا۔ اس طرح دشمن کی گولہ باری نے سلطانی لشکر کو
شدید نقصان پہنچایا۔

سلطان کو ایمان فروشوں کی غداری کی تو خبر نہ ہو سکی مگر اس نے فوراً مہنجا لایا اور حکمت علی
تبدیل کرتے ہوئے باقی تمام لشکر کو یکجا کیا اور باقاعدہ جنگ لاکھم دیا۔

اس وقت بنکی نواب محمد رضا خاں، سید غفار اور حسین علی خاں کو اپنے ہمہ رکھنے کا موقع
ملا اور انہوں نے اپنے اپنے دستوں کے ساتھ جہز ہارس کے لشکر پر شدید حملے شروع کر دیے۔ اس
وجہ سے انگریز فوج شدید دباؤ میں آ گئی۔

اس وقت قمر الدین نے پھر غداری کا مظاہرہ کیا اور سوار رسالوں کو اس طرح دوڑایا کہ ان کے
گھوڑے آپس میں ٹکرائے اور خود ہی اپنی فوج کا نقصان کرنے لگے۔

اس بد نظمی اور بے ترتیبی کی وجہ سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور سلطانی لشکر کے بہت سے سپاہی
دشمن کی بھینٹ چرٹھ گئے۔

سلطان نے اسی معرکہ میں میر قمر الدین کو جہز اسٹوارٹ کے مقابلہ پر کورگ کی طرف روانہ کیا

اور اس کو حکم دیا کہ وہ جہز اسٹوارٹ کا راستہ روکے مگر وہ ہلکے حرام انگریز فوج کے پاس پہنچ کر
اس طرح خیمہ زن ہو گیا جیسے وہ ان کا محافظ ہو۔

ادھر سلطان کو اطلاع ملی یا خبر دی گئی کہ جہز اسٹوارٹ اپنی فوج کے ساتھ مرزا کا پیٹھ کے قریب
پہنچ گیا ہے۔

اس اطلاع پر سلطان نے میاں کے محاذ پر کچھ فوج چھوڑی اور خود بھی بڑی تیزی سے کورگ
روانہ ہوا۔ تیسرے دن وہ انگریز فوج کے مقابلے پر پہنچ گیا۔

سلطان کے ساتھ نواب بنکی محمد رضا خاں اور سید غفار بھی تھے۔ ان دونوں سرداروں نے دواظر
سے انگریز فوج پر زبردست حملہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دشمنوں کے

پشتے لگ گئے اور دشمن
گھر کر جنگل میں گھس گیا۔

نواب بنکی اپنے دستوں کے ساتھ ان کے تعاقب میں جنگل میں داخل ہو گیا اور وہاں انگریزوں
پر حملے کرنے لگا۔ قریب تھا کہ دشمن کی فوج منتشر ہو کر بھاگ نکلے کہ ناگہاں ایک گولی پیام اجل بن کے
نواب بنکی محمد رضا خاں کے سر میں لگی اور اس جو افر دے جا شہادت نوش کیا۔

نواب بنکی کا شہید ہوا کہ جیسے سلطان کا ایک ہاروٹ گیا۔ سلطان بڑا متعل مزاج اور بڑے
دل گردے کا مالک تھا مگر جب نواب بنکی محمد رضا خاں کی لاش اس کے سامنے لائی گئی تو اس کی آنکھیں اشکبار
ہو گئیں۔ سلطان نے نواب بنکی کی لاش مرزا کا پیٹھ بجوا دی اور خود دار السلطنت چلا گیا۔

سلطان کس قدر دلبر داشتہ تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ انگریزوں کے
مقابلے کے لیے مرزا کا پیٹھ سے نکلا تھا اور اب خود ادھر ہی واپس جا رہا تھا۔

شاید سلطان کا تیرا اقبال غروب ہو رہا تھا!

کیا دار السلطنت اور کیا میدان جنگ، غداران وطن ہر جگہ اپنا کام دکھا رہے تھے۔ پورنیا
اور میر صادق جیسے ہلکے حرام سلطان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ میر
قمر الدین ایک اچھا بھلا اور تجربہ کار سردار تھا جس نے ماضی میں اپنا بے مثل بہادری کے جوہر دکھائے
تھے مگر اس کے سر پر سلطان کا دایا ہنسنے کا جھوٹ سوار ہو گیا تھا اور وہ اس ذریعے سے سلطان کی جگہ میسرور
کے تحت دناج کا وارث بننا چاہتا تھا۔

چنانچہ اس ہلکے حرام کو جب سلطان نے جہز اسٹوارٹ کو روکنے کے لیے کورگ بھیجا تو یہ وہ
پہنچ کے انگریزوں سے جنگ کرنے کے بجائے ان کا محافظ بن گیا اور یہ فرض اس وقت تک ادا کرتا رہا

جب تک سلطان مرزا کا پٹم واپس نہیں چلا گیا۔

سلطان کی مرزا کا پٹم واپسی پر یہ ملک فردش جوں اسٹوارٹ کے پیچھے پیچھے اس طرح آیا جیسے اسے انگریز فوج کی باربرداری کی خدمت پر مامور کیا گیا ہو۔

اسی طرح ایک اور غدار میر قاسم نے جنرل ہارس کی رہنمائی کی اور اس کی فوج کو محفوظ راستوں سے لے جا کر مرزا کا پٹم کے جنوب مغربی حصہ میں گھمراہ کیا۔
مرزا کا پٹم کا یہ حصہ قلعہ کا کمزور ترین حصہ تھا!



انگریزوں کو سلطان کے خلاف جنگ جو کامیابیاں ہوئی تھیں ان کے متعلق یہ سوچنا کہ ان کے پاس اسلحہ کی افراط تھی یا ان کی فوج زیادہ بہادر تھی، قطعی غلط ہے۔ اُس دور کی لکھی ہوئی تاریخیں اور انگریزوں کے وہ خطوط جو انہوں نے ایک دوسرے کو لکھے اور جو تاریخ کا اب ایک حصہ بن چکے ہیں وہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ جنگ میں انگریزوں کی کامیابی جتنی بڑی اور فوجوں کی رہنمائی نہ تھی بلکہ سلطان کے امرا اور وزرا کی غداری تھی اور اس کے ساتھ ساتھ سلطان کے خلاف انگریزوں کا وہ زبردست پراپیگنڈہ تھا اور وہ سازشیں تھیں جن کے لیے میسور کی سابقہ رانیاں اور ریاست کے ہندو سربراہ دار اور مذہبی پیشوا دے، درے، سنے، مذکور گار بنے تھے۔

مورخ باسو اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

"گزشتہ جنگ دیسور کی تیسری لڑائی میں کارنوالس کی کامیابی بھی اسی سازش اور غداری کی رہنمائی تھی اور اس جنگ دیسور کی چوتھی لڑائی میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اس کا کھلا ثبوت اُس خط سے ملتا ہے جو گورنر مدراس نے لارڈ ولزلی کو لکھا تھا۔
وہ لکھتا ہے:

"میں آپ کی ترجمہ کے لیے ایک تحریر روانہ کر رہا ہوں جس کی صداقت پر مجھے کامل اعتماد ہے یہ تحریر اس شخص کی ہے جو سابق ریاست میسور

کے حکمران خاندان کا نہایت گمراہ دوست تھا اور جس کی اطلاعات گزشتہ جنگ میں نہایت اہم اور فیصلہ کن تھیں۔

تریل راڈ کے تعلقات میسور کی عمر رسیدہ رانی (جو بیٹو سلطان کی سوت میں ہے) سے نہایت دوستانہ ہیں اور جس کی تمام امیدیں اس جنگ سے وابستہ ہیں۔ اس بد قسمت عورت کے ارادوں اور خیالات سے میں آپ کو عنقریب مطلع کر دے گا اور وہ تحریر آپ کے غور و فکر کے قابل ہوگی۔ تریل راڈ کے تعلقات ان لوگوں سے بھی ہیں جو سلطان کے مقرب بارگاہ میں (یعنی ملک اور اہل انارک) میں

مدرس کے گورنر نے میسور کی رانی کے جس خط کا حوالہ مندرجہ بالا تحریر میں دیا ہے، شاید یہ دہی خط ہے جو رانی نے تریل راڈ کو لکھا تھا۔ اس کا اقتباس کتاب "پردہ لائن آف میسور" کے صفحات سے درج ذیل کیا جا رہا ہے۔

ہم نے اپنی کھوٹی ہوئی حکومت کو حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے ۱۷۹۰ء میں نواب والا جاہ محمد علی کے توسط سے ایک ایچی بھیجا تھا۔ اس کے بعد بھی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۷۸۷ء میں لارڈ میکارتھی (گورنر مدراس) نے ہیں یقین دلایا تھا کہ ہماری ریاست میں بحال کر دی جائے گی۔ اس کے لیے یہاں سازش کی گئی لیکن عین وقت پر اس کا علم چٹو کو ہو گیا اور ہم ناکام رہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ لارڈ کارنوالس کے زمانہ میں کیا گزری؟ اب سنا ہے کہ آپ اس ارادہ سے یہاں آئے ہیں کہ ہماری حکومت ہم کو دلا دی جائے۔ اس کے لیے اگر آپ کو شمشک کریں تو ایک کروڑ پچوڑے ایک پگوڑا برابر ۳۲ روپے) آپ کی نذر کیے جائیں۔ تریل راڈ سے آپ کو تفصیلات معلوم ہوں گی۔

اس خط میں رانی نے تریل راڈ کو لکھا تھا:

"گورنر اور انگریزوں سے کہو اگر وہ ہماری بہدہ نہ کرتے ہوں تو نہ

کر میں لیکن خاص اپنی حفاظت اور سلامتی کے لیے فرانس والوں کے اس

ملک میں پہنچنے سے پیشتر ضروری ہے کہ سلطان سے بھگت لیا جائے۔"

اس خط کے ساتھ رانی نے اس معاہدہ کی نقل روانہ کی تھی جو سلطان اور فرانس والوں کے درمیان تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رانی کو اس معاہدہ کی نقل کہاں سے اور کس کے ذریعے ملی؟ یہ ہے کہ رانی کے محل میں موائے پورنیل کے اور کوئی شخص نہیں جاسکتا تھا! کتاب "ماڈرن میسور" کا مصنف اپنی کتاب میں ایک خط کا حوالہ اور دیتا ہے جو رانی کی طرف دلزنی کو بھیجا گیا تھا:

"ابھی حال میں معلوم ہوا کہ خدا نے آپ کو اعلیٰ مرتبہ بخش کے اس ملک میں بھیجا ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ آپ ارادوں کے نیک اور ہمدرد ہیں۔ اس لیے ہم آپ کی حفاظت میں آنا چاہتے ہیں۔ اگلے عہد ناموں کے مطابق ہم کو ہمارا ملک لے کر دے دیجیے۔"

اس کا جواب دلزنی کے سیکرٹری جوشیوب نے اس طرح دیا تھا:

"آپ کا پردہ خان ایک عرصہ سے ہیں آپ کے متعلق اطلاعات پہنچاتا رہا ہے۔ لارڈ صاحب صدق دل سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کی تائید کرتے ہوئے آپ کی ریاست آپ کو واپس کر دی جائے گی۔"

بہر طور انگریز فوجیں دو ماہ پیشتر سے سرحد پر موجود تھیں۔ وہ بڑی تیزی سے سلطنت خداداد لطف بڑھیں۔ ان کے ساتھ میر عالم کی سرکردگی میں حیدر آباد کی فوجیں بھی تھیں۔

یہ فوجیں خفیہ طور پر آگے بڑھ کر سلطان کی حدود کے اندر رانی کو ڈپر کا بھین ہو گئیں۔ انگریزوں نے جاسوس اور سپاہی مختلف مقامات پر بھیج دیے کہ ان غداروں کے مکانوں میں جو اس سازش میں ایک تھے، مقیم ہو گئے اور یہ تمام قریب قریب مسلمان ہی تھے۔

یہ تو ابھی تک زبان زد خاص و عام ہے کہ شرچا پور وغیرہ میں بہت سے ایسے مسلمان تھے جو اپنے انوں میں انگریزوں کو چھپائے ہوئے رکھتے تھے۔

انگریزی فوج خفیہ طور پر آگے بڑھ رہی تھی مگر پورنیا اور میر صادق وغیرہ سلطان کو مسلسل دھوکہ دے رہے تھے کہ کیا بحال ہے کہ انگریز ملک کے اندر قدم رکھ سکیں۔ جبکہ ایک طرف سے مدرس کی جانب

ملے آیا تھا۔

اس وقت سلطان کی فوج منتشر حالت میں تھی۔ کچھ فوج شمالی علاقہ میں اور کچھ جنوبی علاقہ میں تھی۔ ویر فوج کے اس معرکہ کا کمانڈر ولزی کا بھائی آر تھرو ولزی تھا۔ اس نے آتے ہی قلعہ کی جنوبی جانب اس سے حملہ کر دیا مگر اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ دوسرے دن ولزی نے اپنے بھائی سے کمانڈر برڈ کے ہاتھ میں دیدی۔

جزل ہارس کی فوجوں کے سامنے نہ صرف ایک دیوار تھی بلکہ دریائے کاویری کی ایک شاخ بھی جو ایک چھوٹا سا ٹاپو بنا رہی تھی اس لیے مزید پندرہ دن تک یعنی ۲۰۔ اپریل تک انگریزوں، جلے اور گولہ باری قلعہ کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

دوسری طرف یعنی قلعہ کے انتہائی مغرب میں دریا کا پاٹ بہت کم تھا اور یہاں سے ہامانی دریا یا جاسکتا تھا اس لیے جزل ہارس نے آخری حملہ کے لیے اس مقام کو پسند کیا۔ جزل ہارس نے دو ہفتہ پہلے ہی جزل اسٹوارٹ کی طرف روانہ ہو چکا تھا تاکہ اسے ساتھ لے کر آئے اور بلاپٹم پر شمال مغرب سے حملہ آور ہو۔

مذاہر کی انتہائی تھی کہ میرزا الدین ان دونوں کے پیچھے اپنی بغیر حملہ کیے چلا آیا۔ یہاں تک کہ یہاں اپریل کے دوسرے ہفتہ میں سرنگا پٹم پہنچ گئیں اور انہوں نے عید گاہ کے قریب اپنے ٹوپے اکر لیے۔

سلطان کے پاس کل ۳۶ ہزار فوج تھی جس میں سے چودہ ہزار قلعہ میں تھے۔ آٹھ ہزار مختلف محاذوں اور باقی چودہ ہزار جس میں زیادہ سوار تھے، میرزا الدین، پورنیا اور فتح حیدر کی کمان میں تھی۔ چودہ ہزار میں سے صرف وہ فوج جو فتح حیدر کے ساتھ تھی، وفادار تھی، باقی فوج جو پورنیا اور میرزا الدین کی زیر کمان تھی سلطان کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچا رہی تھی۔

سلطان نے ۹۔ اپریل ۱۷۹۹ء کو جزل ہارس کو ایک خط لکھا جس میں اس نے حملے کا سبب دریافت کرنے ہوئے لکھا تھا:

”گو در جزل لارڈ مارگٹن ہمارے نیچے ایک خط بھیجا تھا جس کی نقل منوں ہے۔ آپ اس سے سمجھ جائیں گے کہ میں اپنے دعووں پر پوری طرح قائم ہوں۔ پھر انگریزوں کی اس چڑھائی کا کیا مطلب اور اس دہشت کا کیا سبب ہے؟ مطلع کریں۔ اور کیا لکھوں!“

سے جزل ہارس کے ماتحت انگریزی فوج بڑھ رہی تھی تو دوسری سمت مالابار اور کورنگ کے راستے ایک اور انگریزی فوج جزل اسٹوارٹ کے ماتحت سرنگا پٹم کی طرف آ رہی تھی۔

سلطان کو جب اس کی خبر ہوئی تو بڑی حیرت ہوئی۔ اس کے خط کا جواب دینے کے بجائے اس فوج کشی کی گئی۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور وہ انگریزی فوج کے مقابلہ کے لیے نکلا۔

اب ہم پھر اس جگہ سے جنگ کے حالات شروع کرتے ہیں جہاں تک انگریزی فوجیں ہیں گئی تھیں۔ جزل اسٹوارٹ کی فوجوں نے ان مورچوں پر قبضہ کر لیا جو سلطان نے قلعہ کے سامنے شہار میں تعمیر کیے تھے۔ یہاں بھی سازش کی وجہ سے مدافعت بالکل نہ ہوئی۔

انگریزی فوج کا وہ حصہ جو جزل ہارس کے ماتحت تھا، پوسھلی کے پاس دریا پار کر کے دریا کے عین مقابل جنوب مغرب میں ایک گنجان باغ کے اندر جو فصیل قلعہ اور دریا سے بالکل نزدیک تھا مورچہ لگا کر بیٹھ گیا۔

وہ باغات اب بھی اسی طرح گنجان ہیں۔ یہاں بھی ہوئی فوج فصیل سے نظر نہیں آتی۔ اس باغ فصیل قلعہ تک درمیان میں صرف دریائے کاویری اور خندق ہے۔

دریا کی چوڑائی اس جگہ بہت کم رہ گئی ہے۔ درمیان میں مختلف مقامات پر ایسی پتھریلی زمین ہے جو بالکل خشک رہتی ہے اس لیے محض اس موسم کے جب دریا میں طغیانی آتی ہے، اس مقام کو آسانی سے عبور کیا جاسکتا ہے اور فصیل قلعہ بھی یہاں زیادہ اونچی نہیں ہے۔

جزل میڈوز اپنی کتاب ”پٹو سلطان“ میں لکھتا ہے:

”انگریزی فوجوں کو پوسھلی کے محفوظ راستے سے قلعہ کے جنوب مغرب گوشہ کے عین مقابل ٹھہراتے ہوئے قلعہ کے اس صوبے سے کمزور پسلو کو بتلانے والا میر قاسم علی بن پیل سید نور الدین تھا۔“

۵۔ اپریل کو جزل ہارس نے دریائے کاویری کو جنوب مغرب سمت سے پار کیا اور ”سلطان پٹو“ کے قریب آ کر چمے لگانے۔

یہ مقام قلعہ سرنگا پٹم سے صرف تین چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ بد قسمتی سے سلطان اس گوشہ کا محمول انتظام نہ کر سکا تھا۔ میر قاسم قلعہ کے اس کمزور پسلو سے واقف تھا اس لیے وہ جزل ہارس کو ادھر

دوسری طرف میر صادق، پورینا اور میر قمر الدین سے نمک حرام تھے جو اپنے کھانے کی تھالی ہی میں بھید کر رہے تھے۔

موسیو کے جواب میں سلطان نے دریافت فرمایا:

”پھر سرنگا پیٹم کس پر پھوٹ جاؤں؟“

موسیو سپیو نے سینہ تان کر جواب دیا:

”حضور والا! سرنگا پیٹم کو فردی اور فردی کے ہم وطن سپہ سالار موسیو لالی کے سپرد کر جائیے۔

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جب تک ہم میں سے ایک فرد بھی زندہ ہے حضور کے ادا کیے جی تک میں کوتاہی نہیں کرے گا۔“

کس قدر عقل رائے تھی موسیو سپیو کی۔

اگر سلطان قلعہ سے نکل جاتا تو ظاہر ہے کہ انگریزوں کو قلعہ کے بجائے سلطان کی نگر پڑ جاتی اور وہ غاصرہ اٹھا کر سلطان کے پیچھے روانہ ہو جاتے۔ ادھر سلطان مرایا چینل درگ پہنچ کر بہت محفوظ جگہ جاتا اور ادھر فرانسیسی ایک ایک غذا کو چن چن کر ختم کر دیتے۔

جہاں تک موسیو سپیو کے مشورہ پر عمل کرنے سے ایک بہتری کی صورت ضرور نظر آتی تھی لیکن سلطان کو تو اسان فردوں نے گھیر رکھا تھا۔

موسیو سپیو کے جواب سے سلطان بے حد متاثر ہوا اس نے سپیو کو بڑے پیار سے دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ موسیو شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے۔

چنانچہ سلطان نے فرمایا:

”موسیو سپیو۔ ہمارے خیال میں ابھی تمہاری بات ختم نہیں ہوئی۔ تم کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہو؟“

”جی ہاں سلطان عزتم۔“

موسیو سپیو نے اب سے عرض کیا:

”میری ایک اور رائے بھی ہے۔“

”کوہ کو۔“

”میری رائے ہے کہ اگر حضور والا کو قدی کی اس تجویز سے اختلاف ہو تو انگریزوں کو دوست بنانے کی ایک تجویز اور بھی میرے ذہن میں ہے۔“

۱۰۔ اپریل کو جبریل ہارس نے اس مکتوب کا جواب ان الفاظ سے دیا:

”آپ کا خط معہ گورنر جنرل کے خط کے موصول ہوا۔ انگریزی فوج کی

چڑھائی اور اس دشمنی کے سلسلے میں آپ وہ خطوط ملاحظہ کریں جو گورنر

جنرل نے آپ کو لکھے ہیں۔ ان میں اس کی تشریح موجود ہے۔

اور کیا لکھوں!“

سلطان نے انگریزوں کے جواب اور اپنے سپہ داروں کی طرف سے گولہ باری کی خبر موثر انداز پر جان ہو کر اپنے فرانسیسی افسروں کو طلب کیا اور ان سے مشورہ چاہا۔

سلطان نے فرانسیسیوں کے موسیو سپیو کو مخاطب کیا:

”میرے غیر ملکی دوستو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ اس وقت ہم جن حالات سے دوچار ہیں، ان پر

اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اب تک جنہیں اپنا اعتماد و وفادار سمجھتے رہے ان کی دغا بازی اور مکاری

جبران نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ غنیم کا زور ہر لمحہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں میں کیا کرنا چاہیے

سلطان کے ان چار جگہوں کے ہر نقطہ سے اس کے دل کا کرب ٹپکتا محسوس ہوتا ہے۔ ایک طرف

مکاری دشمن جو ہمدردی کے بجائے مکاری کے ہتھیاروں سے لڑ رہا تھا خیرہ تو تھا ہی دشمن، اس کا شکوہ

عزت ہے لیکن یہ اپنیوں کا رویہ، اروش اور ذلیل حرکتیں۔ سلطان کس قدر بے بس اور بے چارہ ہو گیا تھا

اسے اپنیوں سے ناامید ہو کر غیروں سے دکھ سکھ کرنا پڑ رہا تھا۔

فرانسیسی افسران سلطان کے ان جگہوں سے بے انتہا متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں اشکبار

ہو گئیں۔ آخر موسیو سپیو نے جواب دیا:

”حضور والا! ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے اور آپ نے ہم پر ہمیشہ ہمدردی کی ہے۔ ہم ہر وقت

خون بہانے کو تیار ہیں۔“

ان نازک حالات میں ہم بھی رائے دے سکتے ہیں کہ حضور والا شاہی خزانہ، قیمتی سامان اور بیگار

کو ساتھ لے کر نصف شب کے بعد شہر کی صوبہ مرآ یا چینل درگ چلے جائیں اور اپنے ساتھ دس ہزار سو

اور پانچ ہزار باقاعدہ سوار بھی لے جائیں۔“

فرانسیسیوں کو سلطان کے نمک کا اس قدر پاس تھا کہ وہ اس پر اپنی جانیں نثار کرنے کو تیار تھے۔

توپوں میں بارود کے بجائے مٹی اور سن بھرا جاتا تھا۔

سلطان نے فوراً کہا:
"بیان کرو سیدو"

موسیو سپیو نے دلیرانہ عرض کیا:

"حضور والا! انگریزوں کو ہم فرانسیسیوں سے خاص پرغاش ہے۔ آپ ہم سب فرانسیسیوں کو اُن کے حوالے کر دیجئے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری گرفتاری کے بعد انگریز آپ سے مصالحت پر آمادہ ہو جائیں گے۔"

سلطان نے پہلے تو موسیو سپیو کو حیران نظروں سے دیکھا پھر بڑے دکھ سے کہا:

"دوستو! تم غریب الوطن ہماری طلبی پر یہاں آئے ہو۔ تم ہمیشہ ہمارے وفادار اور رفیق رہے ہو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ تم جیسے شریف بہادر اور وفادار دوستوں کو ہم دشمن کے حوالے کر دیں۔ اگر ہماری پوری سلطنت بھی تاراج ہو جائے تو ہمیں اسوس نہ ہو گا مگر یہ ناگن ہے کہ ہم تمہیں انگریزوں کے حوالے کر دیں۔"

اللہ اللہ! ایک طرف میرصادق، پورنیا، امیر قاسم، بدرالزمان، نائٹ اور میر قمر الدین، جو خود کو وفادار کہتے تھے اور ان کا شمار خاص اپنوں میں ہوتا تھا، ان کی غداریاں اور دوسری طرف وہ غیر لوگ یعنی فرانسیسی جو سات سمندر پار سے سلطان کے بلاوے پر اس کی ملازمت میں آئے تھے اُن کی وفاداریاں کہ اپنی جانبیں قربان کرنے پر آمادہ۔

سلطان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے!

فرانسیسیوں سے ملاقات کے بعد سلطان نے ان تک حراموں کو طلب کیا جو سلطان کے سینے پر اپنا خون بہانے کے دعویدار تھے۔

میرصادق، پورنیا اور بدرالزمان نائٹ آئے اور سلطان کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ سلطان کچھ بہ خاموش کھڑا دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ پھر اس نے ان غداروں کو مخاطب کیا:
"اڑائی کا جو حال ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ ہم جن حالات سے دوچار ہیں ان پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔"

ہم نے اپنے وفادار فرانسیسی سرداروں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا ہے۔ ان کی رائے ہمک

صائب رائے کو ہمارا دل بھی تسلیم کرتا ہے کہ ہم خزانہ سے جواہرات کی پیٹیاں اور توشک خانے کا قیمتی سامان لے کر خواتین حرم سرا کے ساتھ موبہ سرا یا چیتل درگ منتقل ہو جائیں اور قلعہ فرانسیسیوں کی حفاظت میں چھوڑ جائیں۔ تمہاری کیا رائے ہے؟

جہاں تک یہاں کی جنگ کا مسئلہ ہے تو اسے تو ہم ہار ہی چکے ہیں۔ باہر جا کر ہم پھر سے مقابلہ کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

سلطان کی زبانی یہ بات سن کر غداروں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ تو اپنے خیال میں شیر کو بال میں پھنسا چکے تھے جبکہ وہ اب جال کو توڑ جانا پڑتا تھا۔

دعویٰ رینگ خاموش رہے اور ایک دوسرے کو کنکھیلوں سے دیکھتے رہے۔ پھر غدار وزیراعظم میرصادق نے نہایت انکسار سے عرض کیا:

"حضور والا! آپ اپنے ارادوں کے مالک ہیں جو چاہے سو کر سکتے ہیں لیکن اگر آپ ہم سے رائے طلب کرتے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ ہم تک خوار جب تک زندہ ہیں آپ کے سینے پر خون بہا دیں گے۔ مگر آپ کا قلعہ چھوڑنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

اب پورنیا نے اپنی غدار کی کو ان الفاظ میں چھپانے کی کوشش کی:
"مجاں پناہ فرانسیسی قوم نے کس کے ساتھ دفاع کی ہے جو آپ کے ساتھ کرے گی۔ فرانسیسی اور انگریز دونوں قومیں اندر سے ایک ہیں۔"

ایک سگ زر تو دوسرا ر اور شغال

(ایک دولت کا کتا تو دوسرا گدڑ کا بھائی)

آپ جیسے ہی قلعہ فرانسیسیوں کے حوالے کریں گے یہ اُسے انگریزوں کے حوالے کر دیں گے۔

"پھر تم لوگ انگریزوں سے صلح کی گفتگو کر دو۔ آخر سلطان نے فیصلہ کیا۔"

پورنیا نے فوراً کہا:

"عالی جاہ۔ یہ آسان اور ممکن ہے۔"

ایک تاریخی حوالہ کے مطابق سلطان نے ۲۰۔ اپریل ۱۷۹۹ء کو اپنے دکن کے اٹھ انگریزوں

کو مندرجہ ذیل پیغام بھیجا۔

لارڈ مارننگٹن نے خط میں لکھا ہے کہ معاملہ کی صفائی کے لیے ایک شخص کو مقرر کیا جائے گا جس کے اختیارات آپ کو ہوں گے تاکہ معاہدہ عمل میں لایا جاسکے۔

آپ دونوں سرکاروں کے بھی خواہ ہیں آپ کی خوشی کس بات میں ہے مطلع کیجیے تاکہ معاہدہ کی گفت و شنید کی جاسکے۔

اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ لارڈ ڈولزلی نے جرنل مارس کو صلح کے اعتبارات کے ساتھ چارٹر میں بھی تحریر کر دی تھیں۔ چنانچہ جرنل مارس نے سلطان کو جو جوابی پیغام بھجوا دیا اس میں مجوزہ شرطوں میں اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کر دیا۔ دراصل جرنل مارس جنگ بند کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سلطان کو جو شرائط بھی لکھیں وہ مندرجہ ذیل تھیں:

- ۱۔ سلطان اپنی نصف سلطنت کپٹی کے حوالے کر دے۔
- ۲۔ فرانسسبوی کو چھٹی دے کہ انگریزوں کو ملازم رکھے۔
- ۳۔ دو کروڑ کا تادان جنگ ادا کرے جس میں سے ایک کروڑ جوہر میں گھنٹوں میں انگریزی فوج میں بیچ جانا چاہیے۔
- ۴۔ باقی ایک کروڑ کے لیے سلطان کو اپنے چار لاکھ (۱۶) سلطان بادشاہ ۲۔ فتح حیدر ۲۔ معین الدین ۴۔ عبدالحق) انگریزوں کی تحویل میں دینا ہوں گے۔

جرنل مارس نے اپنی طرف سے جو شرطیں شامل کی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ شہزادوں کے ساتھ چار وکیل:

- ۱۔ میر قمر الدین
- ۲۔ میر صادق
- ۳۔ پورنیا
- ۴۔ سید غفار

بھی انگریزوں کے حوالے کیے جائیں۔ ان میں سوائے سید غفار کے باقی تینوں انگریزوں کے یحیٰ تھے۔ سید غفار اس وقت سلطان کا سب سے زیادہ مضبوط اور وفادار سپہ سالار تھا۔ چنانچہ انگریز اسے سلطان سے الگ کرنا چاہتے تھے

لہذا باقی تینوں کو بطور وکیل وہ اس لیے طلب کر رہے تھے کہ انہیں شبہ تھا کہیں سلطان ان تینوں کو قتل نہ کر دے۔

جرنل مارس کو شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ بدرازماں نائٹھ بھی ان تینوں ہی جیسا غدار اور نمک حرام مردار تھا ورنہ وہ اسے بھی مزدور طلب کر لیتے۔

سلطان کو یہ شرائط قبول کرنے کے لیے مرن ۲۴ گھنٹے کا وقفہ دیا گیا تھا۔ بھلا اس کی حیثیت، شرافت اور عزت نفس ان شرائط کو کیسے قبول کر سکتی تھی۔

پچھلی مرتبہ انگریزوں کی تحویل میں اس کے دبیشے ایک طویل عرصہ تک رہے تھے اور اب وہ اس کے چار بیٹوں کو بطور بریغال طلب کر رہے تھے۔

سلطان کی شفقت پروری اور محبت یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ وہ ایک وقت چار بیٹوں کو خود سے جدا کر کے ظالم انگریزوں کے حوالے کر دے جن کے ساتھ وہ جو چاہے سلوک کر سکتے تھے۔

ان چوبیس گھنٹوں کے دوران انگریزوں کی طرف سے قلعہ پر مسلسل گولہ باری ہوتی رہی اور اس کے جواب میں قلعہ کی طرف سے انگریزوں پر جو گولے پھینکے جا رہے تھے ان میں مٹی اور سن بھی ہوتی تھی اور اس بات کا ثبوت بھی موجود تھا۔

آخر سلطان نے وہی فیصلہ کیا جو ایک غیرت مند اور جوانمرد سپاہی کو کرنا چاہیے تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ میدان جنگ میں ایک سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مارا جائے گا بجائے اس کے کہ وہ خود کو کافروں کے رحم و کرم پر بھروسہ کر دے۔

اب جنگ کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہا تھا۔ سلطان نے چاہا کہ وہ سرگاکپٹم سے نکل کے کسی اور جگہ چلا جائے اور وہاں سے جنگ جاری رکھے۔

اس نے حکم دیا:

”جواہرات، نوشک خانہ اور مستورات کو چیتل درگ روانہ کر دیا جائے۔“

غلام نے حکم کی تعمیل کی اور تمام مال و متاع ہاتھیوں، اونٹوں اور بیلیوں اور پاکبیلوں پر لدا دیا۔

جب روانگی کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو سلطان نے اس کی مجلس مشاورت طلب کی۔

جب تمام امرا جن میں تقریباً سب کے سب ایسا فردوش اور غدارانہ ناک و ملت تھے، جمع ہو گئے تو سلطان نے کہا:

”ہمارے فرانسسبوی دوستوں کی رائے درست تھی۔ ہم مرابا چیتل درگ روانہ ہو رہے ہیں۔“

سرنگاپٹم کی جنگ میں اب کچھ نہیں رہا۔

امرانے یہ سمجھ لیا کہ اگر سلطان قلعہ سے باہر نکل گیا تو ان کی سازش کامیاب نہیں ہوگی اور تمام کیے دھڑے پر پانی پھر جائے گا۔

اس وقت عذار وطن بدرالزمان آگے آیا اور اس وطن فروش اور کینہ پرور نے دست بستہ عرض کیا:

”قبلہ عالم۔ آپ کیا غضب فرما رہے ہیں اگر حضور نے یہ اقدام کیا اور جان نثاروں کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت والا اپنے حرم اور تمام خزانے کے ساتھ سرنگاپٹم سے باہر جا رہے ہیں تو ان کی ہمت میں ٹوٹ جائیں گی اور سارا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔

ایسے حالات میں یہ نیک خوار اور دفا دار ملک و ملت حضور والا کے اس فیصلے پر نہ مانے اور غیر شریفانہ اقدام، جو آپ کے شایان شان نہیں ہے، کی تائید اور حمایت نہیں کر سکتا۔“

سلطان نے بدرالزمان کے اس پرفریب جواب پر اپنے سامنے کھڑے تمام امر کی طرف دیکھا۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے اور کسی میں سلطان سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ تھی۔

سلطان نے ایک پشمرہ، افسرہ اور حسرت بھری نظر، جس میں امر کی غداری، مکاری اور ایمان فروشی کے لیے ایک کسک تھی، امر پر ڈالی۔ پھر ایک سردار بھر کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

”رمانے مولا بر اولی“

(اللہ کی مرضی سب سے اول و افضل)

اور — سلطان نے سارا بندھا ہوا سامان تو شک خانہ میں واپس بھیج دیا۔

اس طرح سلطان نے انگریزوں سے خوف کھا کر نہیں بلکہ اپنے امرا جن کی امارت، حکومت، برتری کے لیے وہ اب تک لڑا چلا آ رہا تھا، ان کی نیک حرامی، ایمان فروشی اور ملک و ملت سے غداری کے سلسلے خود اپنی موت کے غصہ پر دستخط کر دیے۔

امرانے سلطان کو مجبور کر دیا کہ وہ سرنگاپٹم میں آخری وقت تک قیام کرے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ سلطان نے یہ فیصلہ کن جذبات کے تحت کیا۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے یہ فیصلہ، اپنے امرا، جو دراصل غدار تھے، کے کہنے پر کیا تھا لیکن اس فیصلہ کی طرف ہی وجہ نہ تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو آخری وقت تک یہ امید تھی کہ اس کے امرا راہِ راحت پر آجائیں گے اور وہ سرنگاپٹم کو انگریزوں کے ہاتھوں سے بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

یہ بات صحیح بھی تھی۔

اگر عذار اپنی غداریوں سے باز آ جاتے اور مزید کوئی حرکت نہ کرتے تو اس وقت بھی سلطان اور اس کے لشکر میں اتنی طاقت نہ ہوتی کہ وہ دشمنوں کی متحدہ قوت کو پارہ پارہ کر دیتے مگر ایمان فروشوں کے دل سیاہ ہو چکے تھے اور بہر صورت سلطنتِ خداداد اور سلطان کا خاتمہ دیکھنا چاہتے تھے۔

سلطان کے اس فیصلہ سے نیک حرام بہت خوش ہوئے۔ اس خوشی میں اہل نواٹھ پیش پیش تھے کیونکہ غداری، ایمان فروشی اور انگریزوں سے دوستی میں وہی سب سے آگے تھے۔ میسور کی تیسری جنگ کی سازش میں بھی انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا مگر وہ سازش ناکام ہو گئی تھی۔ اس دفعہ ان کی سازش پہلے سے زیادہ منظم تھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس معاہدہ کے دوران اہل نواٹھ کے گھروں میں سے انگریزوں کو مٹھائی اور پلاؤ تحفہ کے طور پر روزانہ بھیجا جاتا تھا۔

سلطان نے جنگ کا فیصلہ کیا تھا اس لیے اس نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ تمام اہم مقامات پر فوج متعین ہونے کے باوجود انگریزوں کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔

اس سے سلطان نے اندازہ لگا لیا کہ اس کے امرا اسے تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ علمبرائے گرو خندق کھود کر اس میں بارود بھر دیا جائے تاکہ اگر انگریز اندر آ جائیں تو حفاظت ناموں کے لیے بارود میں آگ لگا کر علمبر کو اڑا دیا جائے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد سلطان نے سرداروں کو مختلف مقامات پر متعین کیا اور ایک دستہ فوج کو انگریزوں کی رسد رکھنے کے لیے روانہ کیا مگر — دبا تو آدے کا آدہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ نیچے سے اور پریک کے تمام امرا ایمان بیچ چکے تھے اس لیے سلطان کے کسی حکم کی تعمیل ہی نہ کی جاتی تھی۔ غداروں کی جرات کی انتہا یہ ہو چکی تھی کہ یہ لوگ لیفٹیننٹ ہل اور لارنس کو خندق پار کر کے قلعہ میں لے آئے تھے اور یہ دونوں انگریز قلعہ کے تمام انتظامات اپنی آنکھوں سے دیکھ گئے تھے۔

پھر اس غداری نے وہ وقت بھی دکھایا کہ انگریزوں کی شدید گولہ باری سے قلعہ کی ایک دیوار منہدم ہو گئی اور انگریزوں نے قلعہ میں داخل ہونے کے لیے پیش قدمی شروع کر دی۔ انہیں روکنے والا

کوئی نہ تھا۔ روکنے والوں نے تو خود ان کی رہبری کے فرائض ادا کیے تھے۔

قلعہ سے جوابی گولہ باری ہو رہی تھی لیکن توپوں میں گولے نہ تھے بلکہ سن اور مٹی بھری جاتی تھی۔ غداروں کا یہ عالم تھا کہ سلطان کو نہ قلعہ کی دیوار منہدم ہونے کی اطلاع دی گئی اور نہ انگریزوں کے داخلہ کی خبر اس کے کانوں تک پہنچنے دی گئی۔

آخر ۷۔ مئی ۱۷۹۹ء کو سلطان پر ایمان فروشوں اور غداروں کا حال پوری طرح کھل گیا اور ب کے چہرے بے نقاب ہو گئے۔

سلطان نے ایک پرچہ پر غداروں کے نام لکھ کر میر معین الدین کے حوالے کیا۔ اس پر درج تھا کہ ان غداروں کو آج رات قتل کر دیا جائے۔

سلطان نے اگرچہ غداروں کے چہرے دیکھ لیے تھے مگر انہوں نے کہ وہ اب تک اس بات سے بے خبر تھا کہ میر معین الدین خود بھی ان غداروں میں شامل ہے جن کے نام سلطان نے پرچہ پر لکھ کر اس کے حوالے کیے تھے۔

میر معین الدین نے سر دربار ہی پرچہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ حرکت اس نے جان بوجھ کر کی تھی تاکہ ایک طرف تو غداروں کو سلطان کے حکم کی اطلاع ہو جائے دوسرے یہ کہ سلطان پر یہ بات عیاں ہو جائے کہ اب وہ ان غداروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

تاریخ کی ایک روایت کے مطابق غداروں کی اس فرست میں میر صادق کا نام سرفہرست تھا۔ میر معین الدین کے قریب کھڑے ہوئے کسی شخص نے میر صادق کا نام پڑھ لیا اور اسے سلطان کے حکم کی خبر کر دی۔

اس تاریخی حوالہ میں کچھ زیادہ وزن نہیں ہے اس لیے کہ جس نے میر صادق کا نام پڑھا تھا اس نے دوسروں کے نام بھی ضرور پڑھے ہوں گے اور ان سب غداران ملک و ملت کو بھی اس کی اطلاع ہو گئی ہوگی۔

مگر—

حقیقت سے قریب ترین بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ میر معین الدین، جو خود بھی ان غداروں کا ایک ساتھی تھا، خود ہی سب ایمان فروشوں کو سلطان کے حکم کی اطلاع دے دی ہوگی کہ سلطان نے ان کے قتل کا حکم صادر کر دیا ہے۔ میر معین الدین اور یہ سب دوسرے غدار، ایک ہی تھیلی کی

چٹے بٹے تھے۔

میر معین الدین کی غداروں نے کام دکھایا اور سب غداروں اور ایمان فروشوں کو صاف پکالے لگئی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا اور سلطان کے حکم کی تعمیل ہو جاتی تو سرنگا پٹم کی اس آخری جنگ کے نتائج اور ثمرات کچھ اور ہوتے!



مدتے میں دیا۔
اس کے علاوہ غنایوں اور غریبوں میں نقد رقم اور کپڑا تقسیم کر دیا۔ پھر قلعہ کی دیوار میں شنگان کے بالکل قریب اپنا خیمہ لگوا دیا۔

انگریزی فوج غداروں کی مدد سے پچھلی رات کو نصیب کے عین نیچے پہنچ چکی تھی اور یہ اس وقت دیوار کے شنگان کے بالکل قریب موجود تھی۔

نصیب کے باہر جو خندق تھی اس میں صرف گھٹنوں تک پانی تھا۔ اس جگہ سلطان نے میر معین الدین کو تعینات کیا تھا اور اس اہم انفرادی فوج نے خندق کو پانی سے خالی کر رکھا تھا۔ تاکہ انگریزوں کو خندق پار کرنے میں دقت نہ ہو۔

میر معین الدین کے ماتحت سپہ دار سید غفار تھا جو بڑی مستعدی سے شنگان کے سامنے کھڑا اپنے فراتھی ادا کر رہا تھا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود انگریز قلعہ میں داخل ہونے کی ہمت نہ کر رہے تھے اور نہ میر معین الدین انہیں اندر داخل ہونے کا اشارہ دے رہا تھا۔

اس کی وجہ سید غفار کی وہ ہمداری اور سلطان سے وفاداری تھی جو وہ اب تک مختلف محاذوں پر دکھانا چلا آ رہا تھا۔

میر معین الدین دانت پیس پیس کے سید غفار کو دیکھ رہا تھا اور اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اسے اس کی جگہ سے کس طرح ہٹائے کیونکہ اس کی موجودگی میں انگریز فوج کا شنگان کے ذریعے قلعہ میں داخلہ ممکن نظر نہ آ رہا تھا۔

آخر کار میر معین الدین نے ایک شاطرانہ چال چلی۔ وہ بڑھکے سید غفار کے پاس پہنچا اور اس سے مرگوشی میں کہا:

”سلطان معظم کو جا کے ہوشیار کر دو کہ آج انگریزی فوج کے حملہ کا پورا امکان ہے اس لیے وہ اپنے دستوں کے ساتھ مستعد رہیں۔“

سید غفار ایک خالص وفادار سپاہی تھا۔ وہ میر معین الدین کی اس مکاری کو نہ سمجھ سکا اور اپنے افسر کے حکم کی بجا آوری میں اپنی جگہ چھوڑ کے سلطان کو اطلاع دینے چلا گیا۔

سید غفار کے بٹتے ہی انگریز فوج کو نیا رخ رہنے کا اشارہ دے دیا گیا اور سید غفار کی نشان دہی اس طرح کی گئی کہ جو سید غفار سلطان کو اطلاع دینے کے بعد اپنی جگہ واپس آ کر کھڑا ہوا، اس پر



۴۔ مئی ۱۷۹۹ء کا دن طلوع ہوا۔
صبح کا دھند لکا بہت ادا اس تھا۔ قلعہ میں گناہم سما ہوا نظر آ رہا تھا اور ہر طرف بایوسی پھائی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

سلطان نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد قلعہ کی شکستہ دیوار دیکھنے کے لیے گیا۔
اس جگہ یہ نکتہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ دیوار ایک دن پہلے شکستہ ہو کر گر چکی تھی۔ انگریز اندر داخل ہونے کی کوشش میں تھے۔ غداروں نے انہیں اطمینان دلادیا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں وہ قلعہ میں بے دھڑک داخل ہو جائیں۔

مگر۔۔۔ انگریز لشکر اب بھی سلطان کے رعب سے لرزہ بر اندام تھا کیونکہ اسے بتایا گیا تھا کہ اس شکستہ دیوار کے قریب سلطان خود خیمہ نصب کیے موجود ہے۔

سلطان نے اپنا خیمہ جونی گوشے میں لگوا لیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ملازمت کا ارادہ کر لیا اور دیوار کے شنگان کو بھرنے کا حکم دیا۔

دن کے دس بجے تھے کہ غو میوں کی ایک جماعت نے حاضری دی اور سلطان کو آگاہ کیا:

”اُن داتا۔ آج کا دن آپ کے لیے منحوس ہے۔“
پس سلطان نے مدد کا سامان تیار کرنے کا حکم دیا اور خود حمام میں چلا گیا غسل سے فارغ ہو کر سلطان باہر آیا اور اس نے ایک برہمن کو کئی میرموتیوں میں پروٹی ہوئی ایک بھاری کے ساتھ ایک ہاتھی

ایک سبز رنگ کی چھتری تان دی گئی تاکہ اسے آسانی سے نشانہ بنایا جاسکے۔
چنانچہ سید غفار کے یہ پوچھنے سے قبل ہی کہ اس کے لیے یہ چھتری کا اہتمام کیوں کیا گیا ہے اس پر دشمن نے گولیوں کی اس قدر بارش کی کہ اس نے وہیں جان، جان، آغزس کے سپرد کر دی۔
سید غفار کے شہید ہونے ہی اس کے دستوں کو جو شنگاف کی حفاظت پر مامور تھے ادا کال سے ہٹا لیا گیا۔

پھر اسی وقت وزیراعظم بلور میر صادق نے حکم بھیجا کہ فوج آ کر اپنی تختواہ لے جائے۔
مارچ بتاتی ہے کہ یہ میر صادق اور میر معین الدین نے مل کر منصوبہ بنایا تھا کہ عین موقع پر فوج کو تختواہ کے ہمانے دہان سے ہٹا لیا جائے گا۔
ایک دوسری روایت یہ ہے کہ فوج کو تختواہ دھول کرنے کا حکم وزیر مایات پورینا کی طرف سے دیا گیا تھا کیونکہ وہ وزیر خزانہ تھا۔

بہر حال۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میر صادق ہو یا پورینا۔ دونوں کا مقصد ایک ہی تھا کہ کسی طرح فوج کو شنگاف کے پاس سے ہٹا لیا جائے تاکہ انگریزی فوج کو قلعہ میں داخل ہونے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

پس دشمنوں کا منصوبہ کامیاب ہوا اور انگریزی فوج کو جھنڈیوں کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ میدان بالکل خالی ہے اس لیے وہ اندازوں کے ہاتھوں سے بنے ہوئے راستے سے بے دھڑک قلعہ میں داخل ہو سکتی ہے۔

دو بجے سے کچھ پہلے انگریزی فوج نے قلعہ پر حملہ کیا۔ اس حملہ آور فوج کی کان بیرڈ کے ہاتھ میں تھی۔

بیرڈ تین سال تک سلطان کی قید میں رہ چکا تھا اور جوش انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے خندق کے اوپر آ کر آواز دی:

"کیا تم سب تیار ہو؟"

اسے جواب ملا:

"ہاں۔"

اس پر جنرل بیرڈ نے بلند آواز میں کہا:

"تو پھر اسے ہمارے ساتھ آؤ اور آج انگریز سپاہیوں کی لاج رکھ لو۔"

جنرل بیرڈ کی کان میں ۴۲،۶۹ سپاہی تھے۔ ان میں ۲۴۹۴ یورپین تھے۔ اس نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ کی کان جنرل شیربک کو اور دوسرے حصہ کی کان جنرل ڈپلے کے سپرد کر دی۔

منصوبہ یہ تھا کہ ہم آگے پیچھے فضا میں چڑھنے کے بعد ایک حصہ جنوبی دیوار پر قابض ہونے کے بعد بنگلوری دروازے پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے اور دوسرا حصہ شمالی فضا میں قبضہ کرتے ہوئے فوج سے آئے۔

جنرل بیرڈ کی فوج کو فضا میں چڑھنے میں صرف چھ منٹ لگے کیونکہ اس کی رہنمائی میر فاسم کر رہا تھا جو اس سے پہلے ہی انگریز فوج کو بغیر کسی مزاحمت کے فضا میں پہنچا چکا تھا۔
سب سے پہلے میر فاسم فضا میں چڑھا۔ پھر تھوڑی دیر میں ساری فوج فضا میں پہنچ گئی اور دو حصوں میں تقسیم ہو کر شمال اور جنوب کو چل پڑی۔

انگریزوں نے فضا میں چڑھتے ہی اپنا جھنڈا اٹھ کر دیا۔ سرنگا پٹم کی فضاؤں نے اس سے پہلے اپنے قلعہ پر کسی غیر ملک کا جھنڈا نہ دیکھا تھا لیکن آج اپنے ہی نثاروں کی وجہ سے قلعہ پر انگریزی پرچم لہا دیا گیا تھا۔

جنوبی فضا میں کے لیے جو فوج مقرر کی گئی تھی وہ منصوبہ کے مطابق بنگلوری دروازے کی طرف بڑھی اسے روکنے والا کوئی نہ تھا اس لیے کہ روکنے والے تو خود جھنڈیاں لہا لہا کر حملہ آوروں کی رہبری کر رہے تھے۔

شمالی حصہ میں جانے والی فوج کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ میجر بیٹن، ڈیلاس اور میجر ہلن برج سے چکر کاٹ کر دوسری طرف پیچھے۔

اُدھر لاشوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اس ڈھیر میں ایک شخص میں زندگی کے کچھ آثار نظر آئے۔ ڈیلاس نے فوراً اس پر گولیوں کی بارش کر دی۔

مگر۔ اچانک اس نے اسے پہچان لیا۔ وہ زور سے چیخا:

"سید صاحب۔ کیا یہ آپ ہیں؟"

میجر ڈیلاس نے اسے جھک پہچان لیا تھا۔ وہ واقعی سید میر معین الدین تھا۔ اس نے سسکتے ہوئے خود اپنی شناخت کرائی:

"ہاں۔ میں سید ہی ہوں۔"

یہ دوپہر کا وقت تھا۔

سلطان کے سامنے دسترخوان بچھایا گیا۔ اپنے پرانے جو امرا بھی وہاں موجود تھے سلطان کے ماتھے دسترخوان پر بیٹھے۔

سلطان نے پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ جنوب کی طرف سے واویلہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سلطان کا لقمہ ڈالا ہاتھ نیچے آگیا۔

سلطان نے حکم دیا:

”معلوم کر دینا کیا شور ہے؟“

کسی نے جواب دیا:

”مہاراجہ کے وفادار جرنیل سید مختار نے حضور پر جان نثار کر دی اور اب انگریزی فوج بڑھتی ہوئی آرہی ہے۔“

سلطان نے ایک سردار کو کھینچی اور اس کی زبان سے نکلا:

”جہاد موت سے نہیں ڈرا کرتے۔ سید مختار کبھی موت سے نہیں ڈرا۔“

پھر سلطان نے اپنے امرا اور وزرا پر ایک نظر ڈالی۔ وہ سب بہت مطمئن اور بے فکر مہر جھکاٹے کھڑے تھے۔

سلطان نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے وزیروں اور امیروں پر ملامت بھری نظر ڈالی اور نفرت سے کہا:

”غدارو۔ تمہاری غداری کا جو صلہ تمہیں ملے گا۔ وہ ہمیں معلوم ہے۔ ہندوستان، غیر قوم کی ملامی میں چلا جائے گا۔ یہاں کی صنعت و معیشت تباہ ہو کر رہ جائے گی۔“

تمہاری غداری، ایمان فروشی اور ملک و ملت سے بے وفائی انگریزوں کے چہروں پر سرخی بن کے چلے گی۔

تمہیں اس وقت اس ملک حرامی کا احساس ہو گا جب تم اور تمہاری آئندہ نسلیں بیاری کی ایک ایک گٹھی کو ترسیں گی۔“

اس کے بعد سلطان نے اپنے گھوڑے طاووس کو طلب کیا۔

ماخوذ ہوئے۔ ہتھیار سجائے۔ گلے میں تلوار لٹکائی۔ ہاتھوں میں دو نال بندق پکڑی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

میر جڑیل اس نے فوراً اس کے منہ سے پانی کی چھال لگا دی۔ میر معین الدین کے ہوش ذرا ٹھکانے ہوئے تو اسے اٹھا کر بٹھایا گیا۔

میر جڑیل اس سے میر معین الدین نے پوچھا:

”آپ نے مجھے کس طرح پہچانا؟“

میر جڑیل اس کا دھیان فوراً کرنا ملک میں اس کا نفرین کی طرف گیا جس میں منگلور بھیجے جانے والے کمشنروں کے ناموں پر گفتگو ہو رہی تھی۔ سید میر معین الدین اس کا نفرین میں موجود تھا۔

یہ کا نفرین ۱۸۴۲ء میں ہوئی تھی مگر میر معین الدین کی غداری کا آغا اس سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔ وہ انگریزوں کی تمام اہم میٹنگوں میں حصہ لیتا تھا۔

میر جڑیل اس نے مسکرا کر جواب دیا:

”سید صاحب۔ میں نے آپ کو کرنا ملک کی میٹنگ میں دیکھا تھا۔“

میر معین الدین جواب تو نہ دے سکا البتہ اس کے لبوں پر ایک پھینکی سی مسکراہٹ لرزکے لگی۔ وہ چونکہ بڑے اہم اور خاص غداروں میں سے تھا اور انگریزوں کا بے حد پیارا دوست تھا اس لیے اس کے لیے فوراً پانچ میٹنگوں کی گئی۔

پانچ میٹنگیں۔

میر معین الدین کو سارا دے کر کھڑا کیا گیا مگر اس کے ذہن اول اور دماغ پر غداری کا اس قدر

لو بھٹکا کہ وہ ایمان فروشی کا یہ بو بھوسہ سر پر لیے کھڑا نہ رہ سکا۔

لڑکھڑایا۔

گرا۔

اور گرے ہی سر گیا۔

قدرت نے اس سے ملک و ملت فروشی کا بدلہ لے لیا تھا اور بدلہ بھی اس قدر خوفناک کہ جس قوم کے لیے اس نے اپنے دل سے غداری کی تھی اُسی قوم کے ایک فرد نے اسے اپنی گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

سلطان بیٹھا اور سلطنت خداداد میسور کا ایک بڑا غدار، سلطنت خداداد کے زوال سے پہلے ہی انگریزوں کے ہاتھوں گٹے کی موت مارا گیا تھا۔

ایک غدار کے لیے یہ موت کسی قدر برکت ناک تھی!

احمد خاں نے نفرت سے تھوک دیا:

سلاطین کے جاں نثار چاروں طرف سے اسے گھیرے ہوئے تھے، انہوں نے سلطان کو گرتے دیکھا تو چند جاں نثار گھوڑوں کے کود کر سلطان کے پاس پہنچے اور اسے ایک پالکی میں لٹا دیا۔ اس وقت تک انگریزی فوج چاروں طرف پھیل چکی تھی۔

آہ — سلطنتِ خداداد کا تیرا عظم، ملک و ملت کا رکھوالا، حریت کا علمبردار، آزادی
نقیب، آزادی ہند کا آخری سہارا اور ملتِ اسلامیہ کے ترکش کا آخری تیرا پیہ ہی امیر دل

وزیروں اور منصب داروں کی غداری کا شکار ہو کر تشنہ لب اپنے ہی خون میں نہا کر
شہید ہو گیا۔
اَنَا لَكَ دَانَا لِبِه راجعون۔

چلے گئے اور ادھر انگریزی فوج کو سفید نشان اڑا کر (جس کا پہلے سے
سمجھوتہ ہو چکا تھا) خبر دے دی گئی کہ میدان خالی ہے آ جاؤ۔ چنانچہ تمام
انگریزی فوج نہایت آسانی کے ساتھ تفصیل پر چڑھ کے قلعہ میں داخل
ہو گئی۔
جنرل میڈوز اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

”دوپہر کا وقت تھا جب حملہ کی سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو جنرل بیرڈ
اپنی فوج کو لے کر خندقوں سے نکلا اور دریا پار کر کے تفصیل قلعہ پر چڑھا۔
انگریزی فوج میں جو شخص سب سے آدھ تھا وہ جنرل بیرڈ تھا مگر اس کی
رہنمائی کے لیے ایک اور شخص بھی اس سے آگے آگے تھا اور وہ میر قاسم علی
تھا جو تفصیل قلعہ پر بیرڈ سے بھی پہلے چڑھا تھا۔“

سلطان ڈوڈی دروازے سے نکل کر اپنے باڈی گارڈ (محافظ) دستے کے ساتھ علم تیری کی طرف
چلا۔ اس کی خبر محکرم وزرانے فوراً انگریز فوج کو پہنچادی۔
اس واقعہ کے سلسلے میں ایک دستاویزی ثبوت یہ تصویر ہے جو دریا دولت (ایک محل) میں
اب بھی موجود ہے، جس میں صاف طور پر شاہد ہے کہ میر صادق، سلطان کے سامنے کھڑا آداب
پیش کر رہا ہے اور پیچھے مڑ کر انگریز فوج کو اشارہ بھی دے رہا ہے۔
سلطان کا دہلی دروازے کے قریب انگریزی فوج سے مقابلہ ہو گیا جو قلعہ کی تفصیل پر آ رہی
تھی سلطان اور اس کے محافظ دستہ نے انگریز فوج کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا۔
اس جگہ جو جنگ ہو رہی تھی اس میں ہندوؤں کے ساتھ تلواریں بھی چل رہی تھیں۔ اگر جنوبی
تفصیل پر سے پوریا فوج نہ ہٹا لیتا تو اس تفصیل پر بھی دشمن کی یلغار کو روک دیا جاتا۔
سلطان نے تین گھنٹوں تک انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک رکھا لیکن اس وقت
جو فوج پوریا اور میر معین الدین کی غداری سے جنوبی تفصیل اور شرقی دروازے پر قابض ہو چکی تھی وہ
اندرونی تفصیل سے ہو کر جنوب میں آگئی تھی اور وہاں سے گویاں چلا رہی تھی۔ اس سے مجبور ہو کر
سلطان کو پیچھے ہٹنا پڑا۔
جب سلطان پسپا ہو کر ڈوڈی دروازے پر پہنچا تو اسے بند پایا۔ کیونکہ سلطان کے دروازے

ایک اور مؤرخ نے آخری دوپہر اور شام کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:
”تفصیل کے معائنہ کے بعد دوپہر میں سلطان نے اسی جگہ جہاں
سایہ دار آم کے درخت ہیں، بیٹھ کے خاتمہ طلب کیا۔ ابھی ایک لقمہ
نناول فرمایا تھا کہ دوسرا لقمہ اٹھا یا چاہتا تھا کہ لوگ داویلا کرتے ہوئے
دوڑے آئے کہ سید غفار و فادار نے اپنی جان کو سلطان پر نثار کیا۔
سلطان نے اس نوالہ کو اسی طرح چھوڑ کے دسترخوان سے ہاتھ اٹھایا۔
عام طور پر مشہور ہے کہ سلطان نے ان امرا و وزرا پر جو وہاں موجود تھے
نظر ڈالتے ہوئے کہا:

”اس غداری کا نتیجہ تمہیں اس وقت معلوم ہو گا جب تم اور تمہاری
مہینہ نسلیں اس ملک میں محتاج ہو کر ایک ایک دانہ چاول اور پیاز
کی ایک ایک گٹھی کو ترسیں گی۔“

یہ کہہ کر سلطان نے اپنی تلوار پر تلے (غلاف) میں ڈالی۔ دونالی
بندوق اٹھ میں پکڑ لی اور چھوٹے دروازے سے باہر نکلا۔ اس وقت
سلطان غیر رنگ کپڑے کی قبائلیں پہنے ہوئے تھا۔

جس وقت سید غفار کو گولہ لگا، دوپہر کا وقت تھا مگر سپاہ مستعدی
کے ساتھ اپنے کام پر لگی ہوئی تھی۔ پوریا نے حکم بھیجا کہ تیخواہ تقسیم ہو
رہی ہے سپاہ آ کر اپنی تیخواہ لے جائے اور درپردہ سازش یہ تھی
کہ جب سپاہ یہاں سے ہٹ جائے تو انگریزی سپاہ کو چڑھ آنے
کے لیے اشارہ کیا جائے۔

حسب الحکم سپاہی اپنی تیخواہ لینے کے لیے مسجد اعلیٰ کے پاس

خدمات میں مستحوروں کے دستے بھی قائم کیے تھے جو زمانہ امن میں عیالات کے انتظامات میں مصروف رہتیں اور زمانہ جنگ میں باقاعدہ فوجیوں کی طرح جنگ میں حصہ لیتی تھیں۔ ایک اور انگریز افسر نے لکھا ہے:

"لاشوں میں کئی مستحوروں کی لاشیں بھی تھیں جن کے قیمتی کپڑوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ حرم سلطانی سے تعلق رکھتی ہیں۔" (مرزا کا پیٹم از پارسنس)

مقامی روایت ہے کہ:

"حرم سلطانی کی پردہ نشین عیالات اس آخری وقت میں آبرو دینے وطن و ملت کی خاطر اپنی جان دینے کی خاطر مسیح ہو کر میدان جنگ میں آگئی تھیں۔"

بمجرور ملاس مشرقی دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے محل کے اندر بھاگ کر دیکھا۔ وہاں بہت سے لوگ درد مند آدمیوں کے سامنے باادب بیٹھے تھے۔ اسے خیال ہوا کہ سلطان ابھی تک محل میں موجود ہے۔ اس پر بھڑک کر اس نے کہا کہ اس کے ساتھ محل کے اندر بھیجا گیا کہ وہ یہ اعلان کر دے کہ اگر سلطان خود کو بغیر کسی مقابلہ کے حوالے کر دے تو اس کی جان کی حفاظت کی جائے گی۔ بھڑک کر اس نے سفید علم اٹھائے قلعہ کے دروازے پر پہنچا۔ قلعہ دار میرزا نے اس کے قریب آیا اور جان کی امان طلب کی۔ امان ملنے پر اس نے دروازہ کھول دیا۔ (یہ دراصل محل کا دروازہ تھا)۔ بھڑک کر اس نے داخل ہوا۔ وہاں سلطان کی مسیح فوج موجود تھی۔

بھڑک کر اس نے خیرنگالی کے افکار کے طور پر اپنی تلوار قلعہ دار کے سپرد کر دی۔ سپاہیوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ سلطان محل میں موجود ہے۔ چنانچہ اس نے محل میں داخل ہونے کی اجازت مانگی۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندر بلا لیا گیا۔

وہاں سلطان کے دربار سے بیٹھے تھے۔

آئین نے معز الدین کو قتل دیتے ہوئے کہا:

"سلطان کی جان کی سلامتی کی ضمانت صرف اسی صورت میں دی جاسکتی ہے اگر وہ بلا مزاحمت خود کو حوالے کر دیں۔"

شہزادے نے واضح الفاظ میں بتایا:

سے نکلے ہی تک حرام میرصادق نے یہ دروازہ بند کر دیا تھا۔ سلطان اور آگے بڑھ گیا۔

انگریز فوج اندرونی فیصل پر سے برابر گولیاں برسار رہی تھی لیکن سلطان قدم قدم پر مدافعت کرتا ہوا پیچھے ہٹتا رہا اور عین اس وقت جب سلطان شہر کے دروازے کے قریب پہنچا تو اس کی پشت پر سے یعنی جنوب مشرقی سمت سے انگریز فوج نے پلہ لول دیا جس کی وجہ سے سلطان تین اطراف سے محاصرے میں آ گیا۔

اس وقت سلطان کے ایک افسر نے کہا:

"حضور۔ اپنے آپ کو انگریز فوج پر ظاہر کر دیجیے۔"

سلطان نے پلٹ کر غصہ سے جواب دیا:

"گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔"

انگریزوں کی حساب سے اس جنگ میں کل پانچ ہزار آدمی مارے گئے لیکن کتاب الاعراض میں تعداد بارہ ہزار بتائی گئی ہے تاہم وہ بھی درست نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ ان جاں نثاران وطن میں جو سلطان کے ساتھ شہید ہوئے ان میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی تھیں۔

کانسٹنس اپنی کتاب "مرزا کا پیٹم" کے صفحہ ۸۶ پر رقم طراز ہے:

"سلطان شیپو کی لاش کے قریب بے شمار مستحوروں کی لاشیں بھی

پڑی ہوئی تھیں جن کے لباس اور وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ

وہ حرم سلطانی ہیں۔"

انہیں جان کنگ بولا شوں کو اٹھانے پر مامور تھا، لکھتا ہے:

"مستحوروں کی لاشوں میں ایک خوب صورت برہمن لڑکی کی لاش

بھی ملی تھی۔"

کرنل کمرک پیٹرک نے لکھا ہے:

"معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے مردوں کے ساتھ مستحوروں کو بھی

فوج میں شامل کیا تھا۔"

اس تحریر سے اس گمان کو تقویت ملتی ہے کہ سلطان نے دوسرے مسلم بادشاہوں کی طرح اپنے

سلطان محل میں نہیں ہیں۔

میجر جن کو یقین نہ آیا۔ اس نے حکم دیا:
"محل کے تمام بند دروازے کھول دیے جائیں تاکہ تلاشی لی جاسکے۔"

شہزادہ معز الدین نے میجر سے درخواست کی:

"میجر آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی مگر ناموس حرم کی خاطر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔"

میجر نے اس بات کا وعدہ کیا۔

محل کے تمام دروازے کھل گئے۔ اچھی طرح تلاشی لی گئی مگر سلطان دہاں ہونا تو ملنا۔

جہز بیرڈ اس وقت تک باہر کھڑا تھا کہ کسی دشمن نے اسے اطلاع دی کہ قلعہ میں قید تمام انگریزوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔

یہ سننے ہی جہز بیرڈ غصہ سے پاگل ہو گیا۔ اس نے حکم دیا:

"تمام شہزادوں کو پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔"

چنانچہ شہزادے اس طرح جہز کے سامنے لائے گئے جیسے جانور ہنگامہ کے لائے جاتے ہیں۔
جہز بیرڈ شہزادوں کو دیکھتے ہی چہنچا:

"بناؤ سلطان کہاں چھپا بیٹھتا ہے ورنہ تم سب کو قتل کر دیا جائے گا!"

تمام شہزادے بالکل ہراسہ میں تھے جیسے کسی نے ان پر سحر کر دیا ہو۔ دراصل شدت غم نے ان پر سکو
طاری کر دیا تھا۔ ان پر بیرڈ کے غصہ کا کوئی اثر نہ ہوا۔

شہزادہ معز الدین نے بڑی مستقل مزاجی سے جواب دیا:

"محل کے تمام دروازے کھلے پڑے ہیں۔ چھپ چھپ کر تلاشی لی جا چکی ہے۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ

سلطان محل میں موجود نہیں ہیں اور نہ ہیں یہ علم ہے کہ وہ کہاں ہیں۔"

جہز بیرڈ نے بے یقینی سے کہا:

"خوب سوچ لو۔ اگر سلطان محل سے پکڑا گیا تو تم لوگوں کی خیر نہیں۔"

شہزادے نے اسی استقلال سے جواب دیا:

"جہز۔ سب کچھ مٹ گیا ہے۔ لٹ گیا ہے۔ جھن گیا ہے۔ اب کیا باقی بچا ہے جس کی ہم خیر نہائیں

اس وقت اختیار اور اقتدار ہمارے ہاتھ میں ہے تم جو چاہو سو کر سکتے ہو۔"

جہز بیرڈ نے دوسرا پینتہ تبدیل:

"اچھا۔ تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ انگریز قیدیوں کے قتل کا حکم کس نے دیا؟"

شہزادے نے متانت سے کہا:

"ہمیں اس بار سے میں کوئی علم نہیں لیکن۔ یہ یقین ضرور ہے کہ اگر انگریز سلطان کی قید
میں تھے تو سلطان ان کے قتل کا حکم کسی صورت نہیں دے سکتے تھے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ سلطان کے کسی
دشمن نے انہیں قتل کر کے الزام سلطان کے مرتھوپ دیا ہو۔"

جہز بیرڈ شہزادے کی متانت اور اس سے زیادہ ذہانت پر عیش کشی کر اٹھا۔ اس نے کیپٹن
میریٹ کو حکم دیا:

"شہزادوں کو اپنی حراست میں انگریزی کیپٹن میں بھیجا دو۔"

اس طرح سلطان شہید ہوا۔

اور۔

اس کے تحت جگر ایک بار پھر انگریزوں کی قید میں پہنچ گئے!



ہیچ کے کہا:-

"میں سلطان کا محافظ راجہ خان ہوں۔ زخمی کھلیا۔
"سلطان کہاں ہے؟" آئن اور ولزی نے ایک ساتھ سوال کیا۔
زخمی نے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کیا:
"سلطان ادھر ہے۔ مجھے نہ مارو۔"

ولزی نے گھبرا کر پوچھا:

"کیا سلطان زندہ ہے؟"

"نہیں۔" راجہ خان بولا:

"وہ دیر ہوئی مرجھا ہے۔"

ولزی اور آئن نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ اس ڈھیر پر گئے۔ آخر سلطان کی لاش کو
اٹھ کر لیا گیا۔

سلطان کا جسدِ خاکی کئی لاشوں کے درمیان دبا ہوا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ سلطان کے
انٹاروں نے آخر وقت تک اس کی حفاظت کی ہے۔

ولزی نے جھک کے دیکھا۔ سلطان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس نے جسم ٹٹولا تو وہ گرم تھا۔ اسے
بہ ہوا کہ سلطان زندہ ہے۔ ولزی نے گھبرا کر سلطان کی بغض پر ہاتھ رکھا۔

بغض ساکت تھی۔

اس کا شک دور ہو گیا۔

سلطان کے جسم میں چار گولیاں بیوست ہوئی تھیں اور چاروں زخم نظر آرہے تھے۔ ایک گول
انسان اس کے دائیں کان پر تھا۔

سلطان کے جسم پر سفید لٹیں کی قمیض اور پھلدار جینٹ کا ڈھیلا پاجامہ تھا۔ سرخ رنگ کا ایک نشی
دو سر اسوتی کپڑا اس کی کمر کے گرد بندھا تھا۔ سرخ اطلس کی ایک بیٹی کا ندھوں پر پڑی تھی۔

سلطان کا سر ننگا تھا۔ شاید گھوڑے سے اترتے وقت اس کا عامہ کہیں گر گیا تھا۔ اس کے
پیرھے بازو پر ایک قویٰ بندھا تھا۔

سلطان شہد کو بالکی میں ڈال کر عمل میں لایا گیا۔

سلطان کا لاشہ دیکھتے ہی محل میں کہرام مچ گیا۔ سوگواروں نے چیخیں مار مار کر آسمان سر پر اٹھایا۔

شاہک کا اندھیرا رات کی سیاہی میں تبدیل ہو چکا تھا۔

سلطان کا اب تک کسی کو کوئی پتہ نہ چلا تھا۔ انگریزوں کو تو یقین ہو گیا تھا کہ سلطان اب زندہ
نہیں مگر اس کی لاش کہاں ہے؟ اس کی تلاش تیزی سے جاری تھی۔

جنرل بیرڈ خود تلاش کے لیے تیار ہوا۔ اس نے مشعلیں منگوائیں اور سب لوگ اس دروازے
پر پہنچے جہاں دوپہر سے شام سات بجے تک خونریز جنگ ہوئی تھی۔

اس جھوٹی سی جگہ میں بے شمار لاشیں پڑی تھیں جن کی تیز کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ
ناممکن تھا۔

آئن اور ولزی نے دروازے کے قریب سلطان کی پالکی پڑی دیکھی۔ پالکی کے قریب ہی
لاشوں کے ڈھیر میں ایک شخص دکھائی دیا جس کے جسم میں حرکت تھی۔

یہ لوگ سمجھے کہ وہی سلطان ہے۔ آئن اور ولزی نے گھبرا کر اپنے ہتھیار سنبھال لیے اور گولی
چلانے کا قصد کیا۔

اسی وقت اس سکتے جسم نے گٹھی گٹھی آواز میں ابھائی:

"خدا کے لیے مجھے نہ مارو۔ میں سلطان نہیں ہوں۔"

اور اس زخمی نے ان دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"پھر تم کون ہو۔ جلدی اپنی شناخت کراؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔ کرنل ولزی نے زور

خواتین نے اپنے بال نوچ ڈالے اور درود یار سے ٹکری مارنے لگیں۔ تمام رات عمل میں قیامت مہل
برپا رہی۔
اسی رات انگریزی فوج صبح تک عوام و خواص کو لوٹتی رہی اور اپنی شرافت و تہذیب کا ثبوت
دیتی رہی۔

سلطان کی تجویز و تکلیفیں کا کام قاضی شہر کے سپرد کیا گیا۔

دوسرے دن سلطان شہید کو غسل دے کر مکہ معظمہ سے لایا ہوا کفن پہنایا گیا۔ شام چار بجے جنازہ
نیار ہوا۔
محل کے تمام لوگ جنازے کے ہمراہ تھے۔ جنازہ محل سے برآمد ہوا۔ راستے کے دونوں طرف
انگریزی فوج نصف بستہ تھی۔

یہ وہی فوج تھی جو ملک سلطان کے خلاف صفت آرا تھی اور گزشتہ تمام رات عوام اور خواص
کو جی بھر کے لوٹتی رہی تھی۔

جنازے کے آگے چار کمپنیاں چل رہی تھیں۔ جنازے کے ہمراہ اعیان سلطنت، امراء و وزراء
معززین شہر کے علاوہ عوام کی کثیر تعداد دھاڑیں مارتی چل رہی تھی۔

سب سے پیچھے گھوڑے پر سوار شہزادہ عبدالغنی تھا۔ وہ سر بر ہنہ تھا۔
جنازے کا جلوس آہستہ آہستہ قلعہ سے نکل کر شہر کی سڑک پر آگیا۔ سوگواروں کی تعداد دم بہ دم
بڑھتی جا رہی تھی۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ خواتین سروں پر
مٹی ڈال کر دھاڑیں مار رہی تھیں۔ عوام کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رزاں جاری تھا۔ ہر ایک اپنے
حبیب سلطان کے غم میں ماتم کتا تھا۔

جنازہ جس وقت مقبرے تک پہنچا تو سوگواروں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔
اس دن سرنگاپٹم کی فضا بھی سوگوار تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے مگر ہوا نام کو
بھی نہیں تھی۔ ایک پتہ بھی نہ ہل رہا تھا۔ ایک عجیب سا جیس تھا۔

ہر شخص ہما ہوا تھا۔ جیسے ہر ایک کو کسی نامعلوم خوف نے گھیر لیا ہو۔ لوگ آسمان کی طرف دیکھتے
اور گھبرا کر سہک اُٹھتے تھے۔ نہ معلوم آسمانوں میں کیا ہو رہا تھا۔ شاید اہل آسمان بھی گریہ کتا تھے اور

مغمم چہروں کے ساتھ جھک جھک کر سلطان کی میت کو دیکھ رہے تھے۔
سلطان کا جنازہ لال باغ پہنچا تو یکایک قلعہ سے ماتمی توپیں چھوٹنا شروع ہوئیں اور ادا صدر
لے میں شریک لوگوں نے غم آلود دھاڑیں مارنا شروع کیں۔
کئی لاکھ سوگواروں کے رونے، ماتم کرنے اور دھاڑیں مارنے سے اس قدر شور بلند ہوا کہ
یہی توپوں کی آواز دب کر رہ گئی۔

پھر ایسا ہوا کہ آسمان پر چھلٹے ہوئے بادلوں نے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک
ساتھ گرجنا شروع کیا۔

فضا کی عبرت ناک سنجیدگی میں دہشت پیدا ہو گئی اور ہر شخص کا چہرہ یوں دھوواں دھوواں ہو گیا
جسے وہ سب اپنے اپنے گھر سے اپنے کسی عزیز کے جنازے کو کا ندھا دیتے ہوئے یہاں تک
پہنچے۔

بادلوں کی گرج ختم نہ ہوئی تھی کہ آسمان پر بجلی بھی ترپنے لگی جیسے وہ بھی سلطان کے غم میں شامل
ہو رہی ہو۔

بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک نے فضا کو بڑا خوفناک بنا دیا تھا۔ جنازے میں شریک انگریز افسر
بپاہی گھر لگے۔ ان کے اوصاف ظاہر ہوئے جا رہے تھے۔

مصابح تاریخ خدا داد (میسور) سلطان کی تدفین کے بیان میں اس طرح رقم طراز ہے:
”ہجرل ہارس کے حکم سے صبح کو تمام شہزادوں اور ندیوں کو سلطان کا
دیدار کرانے کے ان کی تجویز اور تدفین کا حکم دیا گیا۔“

جنازہ نہایت احترام اور وقار کے ساتھ ۲۸ ذیقعد ۱۲۱۳ھ ہجری
بروقت نظر قلعہ سے روانہ ہوا۔ تمام شہزادے، سردار اور عہدیدار شریک
تھے۔

نواب حیدر علی خاں کے مقبرہ پر جسے گنبد کہتے ہیں، جنازہ ٹھرایا گیا۔
قیضی شہر کے سارے بڑے بڑے غراؤ کو دیے گئے اور اس
پیکر جلال کو اس کے باپ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا اور یہ ایک
مدت تک بڑے بڑے بوڑھوں کی زبان پر رہا کہ جب ہجرل ہارس کو سلطان کی
شہادت کی خبر پہنچی تو وہ لاش پر آیا اور فرط غم سے پکار اُٹھا:

”آج ہندوستان ہمارا ہے۔“

سلطان کی موت دراصل اسلامی جاہ و جلال اور اسلامی شان و شوکت کی موت تھی۔ ہندوستان کی آزادی کی موت تھی۔ ہندوستان کی غیرت و خودداری کی موت تھی۔

سلطان ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ اس کی نظروں میں بڑے بڑے مجاہد مسلمان سرداروں، فضلاء، محدثوں، مفسروں اور اماموں کی مرفورث نہ موت تھی۔ ان لوگوں کی موت تھی جو باطل کے سامنے پہاڑ بن کر کھڑے ہوئے اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک جبروت کے تیشوں نے ان کے سر پاش پاش نہ کیے۔ ان کی گردنیں قلم نہ کیں۔

یہ ہندوستان کے اس سپہوت کی موت تھی جس پر دنیا والے نواگ رہے آسمان بھی آسمان بھلے بغیر نہ رہ سکا۔

روایت ہے کہ دفعتاً ایک طوفان اٹھا۔ بادل کی نیب گرج اور بجلی کی خوفناک کڑک نے زمین کو ہلا کر رکھ دیا۔ تدفین کے وقت اکثر مقامات پر بجلی گری خصوصاً سلطان کے دیوان خانہ، مجلس اور مسجد اعلیٰ بجلی کی لپیٹ میں آئے۔

دریائے کاویری پایاب تھا۔ اس میں یکا یک بڑے زوردار کی طغیانی آگئی۔

ایک ایسا ہیبت ناک اور عبرت ناک سماں چھا گیا کہ جیسے زمین پر زبردست مصیبت آگئی ہو اور جس پر آسمان بھی غم کر رہا ہو اور برق و بار اس کے شریک نہ ہوں۔

اس زمانہ میں ایسی باتوں پر کچھ زیادہ توجہ نہ دی جاتی تھی بلکہ بے اعتنائی رتی جاتی تھی مگر کیا کیا جلتے کہ ہزار ریخ اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہے اور اس کا میں ثبوت دیتی ہے یہ بات نہیں کہ اس طرح کے واقعات صرف اسلامی تاریخوں میں لکھے گئے ہیں بلکہ انگریزی تاریخیں اس کا ثبوت دے رہی ہیں۔

وٹیس رئیس اپنی کتاب میں اور بورنگ، حیات پیو میں لکھتا ہے:

”اس وقت ایک طرف تو فلعہ سے ماتمی تو ہیں سر ہو رہی تھیں اور دوسری طرف بجلی کی چمک اور بادل کی گرج نہایت خوفناک تھی جس سے

اس واقعہ کی سنجیدگی اور دوبالا ہو گئی تھی۔“

سرنگاپٹم کے بڑے بڑے بھروسوں کا بیان ہے کہ ان کی زندگی میں اتنا زبردست طوفان پہلے نہ آیا تھا۔ سلطان کی تدفین کے دن آبرا۔ اتنی بجلیاں گریں جن کا حساب نہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے شہر پر خوفناک مصیبت آگئی ہے اور دروہام لرزہ بر اندام تھے۔ دریائے طغیانی اس جوش و خروش پر ہدایت طاری ہو جاتی تھی اور سب کو اس بات کی حسرت تھی کہ یہ طوفان ایک دن پہلے کیوں نہ آیا نہ ہو سکتا۔

حزین میڈوز ٹیلر اپنی کتاب میں بیان کرتا ہے:

”رات ختم ہو گئی۔ صبح ہوئی۔ تمام اہل شہر پر خوف و ہراس چھا یا رہا۔ ہر جگہ ہندوؤں کی آوازیں، مجروحین کی چیخیں اور ترم رسیدوں کی آہ و فغاں کی آوازیں آتی رہیں۔ رات بھر شہر میں لوٹ مار اور غارت گری ہوتی رہی۔ دن گرم تھا۔ ہوا بند تھی۔ کہیں ایک پتھر نہ ہلتا تھا۔ تمام آسمان پر بجلیاں ایک گوشہ سے نکل کر دوسرے گوشہ کی طرف بہم جاری تھیں۔“

خطیب کی آواز بہت زوردار تھی۔ جیسے ہی اس کی زبان سے تکبیر کہنے کے لیے لفظ ”اللہ“ نکلا تو یوں معلوم ہوا جیسے آسمان ٹوٹ کر زمین پر گر رہا ہے۔

ایک ہیبت ناک کڑا کے کے ساتھ بجلی چمکی اور ایک روشنی کے زوردار جھماکے سے سب کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ایک زبردست گرج کی آواز نے دلوں کو ہلا دیا اور یہ معلوم ہوا جیسے خطیب کی زبان سے ”اللہ“ کے بعد کوئی لفظ نکلا ہی نہیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک خاموشی طاری رہی۔

لاش کو اس کی آخری آرام گاہ میں رکھا گیا۔ جونہی لاش رکھ کے اسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ کہا گیا تو پھر ایک بار بجلی کڑکی۔ ایسی زبردست روشنی ہوئی کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ لوگ کیا کہہ رہے تھے اور کیا ہو رہا تھا! اس کے بعد

بجلی اور گرج کا ایک عجیب سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابھی تک بارش کا ایک قطرہ زمین پر نہ گرا تھا۔ کالی گھٹائیوں لہر رہی تھی جیسے ابھی زمین پہ اتر آئے گی۔

اس وقت یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ انسانی طاقت قدرت کے آگے کتنی حقیر ہے۔ دراصل آفرینندہ مطلق (خلاق عالم) کی آواز اس وقت سنائی دے رہی تھی۔

فوج کو حکم دیا گیا کہ آخری سلامی اُتارے۔

ادھر ہندو قبیلے چھوٹیں۔ ادھر آسمان سے ہزار ہا توپیں چھوٹیں شروع ہو گئیں جن کی آواز میں ہندوؤں کی آواز دب کر رہ گئی۔

فائر کے بعد جو بینڈ بجایا گیا، معلوم نہیں وہ کیسا تھا اور کس قسم کا تھا۔ آسمانی گرج از زمین کے بینڈ کا منہ چڑھ رہی تھی۔

میر عالم چند حیدر آبادی انہوں کے ساتھ پھرے کے پاس آکر ملا۔

گرج اور بجلی غضب ڈھا رہی تھی۔ انگریزی کیمپ پر بھلی گری۔ جس سے دوا شہر اور کچھ سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔

سلطان کے شہید ہوتے ہی ایک قہر تھا جو سرنگاپٹم پر ٹوٹ پڑا۔ قہر مہا بارہ ہزار شہیدانہ جانیں سلطان پر نثار کر چکے تھے۔

ادھر سلطان کی لاش محل میں لائی گئی اُدھر شہر میں ہر جگہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔

قری ماہ کی آخری تاریخ تھی رگھوپ اندھیرا چھا یا ہوا تھا۔ اس اندھیرے کو جلتے مکانات کے زخمیوں کی چیخ و پکار اور بے بس عورتوں کے نالہ و فریاد نے اور بھی ناک بنا دیا تھا۔

ان شعلوں میں جو کچھ نظر آ رہا تھا اس سے انسانیت کی روح بھی کانپ رہی تھی۔ مال و زر کا عورتوں کی بے رحمی، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے قتل کا اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھلائی سرنگاپٹم پر ٹوٹ پڑی ہیں۔

ہجر آئن اپنی یادداشتوں میں اس رات کا حال اس طرح لکھتے ہیں:

”جنرل بیرڈ جودن بھر کا تھا کھانا تھا وہ ذرا آرام کرنے کے لیے محل کے برآمدے میں لیٹ گیا۔

ابھی اس کی آنکھ بھی نہ لگی تھی کہ لوگوں نے اسے جگادیا اور بتایا کہ شہر میں کئی مقامات پر آگ لگی ہوئی ہے اور ہر جگہ لوٹ مار ہو رہی ہے۔ اس نے دو ایک جگہ سپاہیوں کو لوٹ مار سے روکنا چاہا مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔

قلعہ کی فتح کے بعد سپاہی اپنی پلٹوں میں واپس نہیں گئے بلکہ شہر میں داخل ہو کر لوٹ مار کرنے لگے۔

فوج کے وہ سپاہی جو بار برداری کے کاموں پر مامور تھے وہ کیمپوں سے نکل کر شہر میں آگئے اور لوٹ مار میں شامل ہو گئے۔

جگہ جگہ لوگوں کو کیمپ کے پٹیا جا رہا تھا کہ وہ اپنی پوشیدہ دولت کا پتہ بتائیں۔

عورتیں مکانات چھوڑ کر گلیوں میں آکر کھڑی ہو گئیں تھیں تاکہ اپنے حصے عصمت کی حفاظت کر سکیں۔

چند ہی گھنٹوں میں سونے اور جواہرات کے ڈھیر لوٹنے والوں کے ہاتھوں میں آ گئے۔ بڑے بڑے سرداروں اور اشراف کے مکانوں کو لوٹ کر بناؤں پر باد کر دیا گیا تھا۔

سلطانی خزانہ جہاں بے حساب دولت تھی وہاں پہرہ لگا تھا لیکن کچھ لوگ خفیہ راستوں سے خزانے تک پہنچ گئے اور انہوں نے جواہرات سے اپنی جیبیں بھری تھیں۔

عجیب بات یہ تھی کہ لوگ مال لوٹ لوٹ کر اپنی جیبیں بھر رہے تھے اور پیچ پیچھے کے لوگوں کو منع کرتے جلتے تھے۔“

(ماڈرن میسور)

واقعات تو انگریزوں کے چشم دید ہیں۔ ان سے قطع نظر اگر مقامی روایات کو لیا جائے تو

ہمارے کیمپ کے بازار میں ہمارے سپاہی بیش قیمت جواہرات،
سونے کی سلاخیں اور دوسری قیمتی اشیاء بہت سستے داموں بیچ رہے
ہیں یا انہیں دوسری چیزوں کے عوض دے رہے ہیں۔ ایک ایک بیش
قیمت موتی ایک پیالہ شراب کے عوض دیا جا رہا ہے۔

ایک فوجی ڈاکٹر نے ایک سپاہی سے دو بازو بند خریدے جن میں میرے دوست
ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جو دوسرے سے کم قیمت کا بتایا جاتا ہے اس کو
حیدر آباد کے ایک جوہری نے تیس ہزار روپے کا بنایا ہے اور دوسرے کے
بارے میں اس نے کہا کہ وہ اس قدر قیمتی ہے کہ اس کی قیمت کا اندازہ نہیں
کیا جاسکتا۔

اس قدر مال و دولت حاصل کرنے کے باوجود ہمارے افسر اور سپاہی
ان اہلک اور زانیوں کو پس لڑتا چلتے ہیں جو محل سے دستیاب ہوا ہے۔ فوج کا
ہر شخص سچی کہ جہز ہمارے ملک اس کے لیے مضطرب ہے کہ مالی غنیمت جلد از
جلد تقسیم ہو جائے۔

فتح مند فوج جسے اب اور کوئی کام نہیں ہے، قابو سے بالکل باہر
ہو رہی ہے۔

کرنل ولزلی مالی غنیمت کے بارے میں اپنے بھائی کو اس طرح لکھتا ہے:
"مالی غنیمت کی تقسیم کے لیے جو ایجنٹ مقرر ہوئے ہیں وہ جو لوگوں سے
زیادہ خطرناک ہیں۔ انھوں نے محل کے دروازے، سلطان کے لباس اور
دوسرے کپڑوں تک کو فروخت کر دیا ہے اور ابھی ان کے پاس سلطان کے
لبوسات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔

یہ وہ کپڑے ہیں جو سلطان کے استعمال میں تھے اور وہ انہیں پہنا کرتا تھا۔
اگر ان کپڑوں کی فروخت کو نہ روکا گیا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ یہاں کے
لوگ جو ہمارے قبضہ سے بیزار ہیں، سلطان کے ان کپڑوں کو بطور نشانی اور
نمبر خرید لیں گے اور یہ بات ہمارے لیے بڑی شرمناک ہے۔

اس لیے میری رائے ہے کہ ان کپڑوں کو خود گورنمنٹ خرید لے اور

تکم میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ ان واقعات کو لکھ سکے۔
کہا جاتا ہے کہ غداروں نے جو غداری کی تھی، اس کا نتیجہ انہوں نے سلطان کی شہادت کے ہاں
ہی گھنٹوں بعد دیکھ لیا۔

یہ ایک فوری خدائی انتقام تھا جو غداروں سے لیا گیا۔ ان کا مال، گھر بار، ذات و وقار، بٹا
کہ ان کی عورتوں کی ناموس بھی غداری کی مصیبت چڑھ گئی تھی۔

صبح کو جب جہز ہمارے کورٹ کے واقعات کا علم ہوا تو اسی نے جہز میرڈ کی جگہ کرنل ولزلی کو
مامور کیا اور پڑے پڑے لوگوں کے گھروں پر پردہ لگا دیا۔ لیکن شہر میں قتل و غارت کا بازار پھرم
گرم رہا۔ کوئی گھر اور کوئی خاندان اس سے محفوظ نہ رہا۔

آخر تک آکر کرنل ولزلی نے جہز ہمارے کو دکھا:

"سرنگا پٹم کے زوال کے بعد وہاں کی رعایا پر اس قدر ظلم و ستم کیا گیا ہے
کہ اس کے آگے سلطان کے مفروضہ مظالم کچھ حقیقت نہیں رکھتے اور یہ
مظالم کرنے والے سب انگریز سپاہی تھے۔"

اس نے مزید لکھا:

"انگریز حاکم شہر (کو تو ال) کو میرے پاس بھیجا جائے اور اُسے میرے
حکم کے تابع رکھا جائے۔

جب تک لوٹ مار کرنے والوں میں سے چند لوگوں کو چھانسی نہیں دی
جائے گی اس وقت تک لوٹ مار روکنا محال ہے۔

اس وقت ہماری رجمنٹوں کے سپاہی اور جہز اسٹوارٹ شہر میں ہیں
اس لیے زیادہ خوف و دہشت پھیل رہی ہے۔

جب تک ہم نوٹ ذراغ اختیار نہ کریں گے لوگ اپنے گھروں کو
واپس نہ جائیں گے۔"

کرنل ولزلی نے اپنے بھائی لارڈ ولزلی، گورنر جہز ایسٹ انڈیا کمپنی کو سرنگا پٹم کے عوام پر انگریزوں
کے اہل ہونے والے ظلم کی داستان ان الفاظ میں لکھی تھی:

"مئی ۹۹ء کو شب سرنگا پٹم پر جو مصیبت آئی اس کی مثال نہیں
مل سکتی۔ شہر میں مشکل ہی سے کوئی ایسا گھر ہوگا جو لوٹ سے بچا ہوگا۔

انہیں شہزادوں کے حوالے کر دے یا جس طرح مناسب سمجھے کرے۔

پرائز کیٹیجی یعنی وہ لوگ جو مال شہیت کی تقسیم پر مامور تھے انہوں نے یہاں تک پیروہی کی کہ محل کے زنان خانے کی بھی تلاشی لی کہ کہیں وہاں مال و زر چھپا کر نہ رکھا گیا ہو۔
اس کی خبر جب گورنر جنرل لارڈ ولزلی تک پہنچی تو اس نے پرائز کیٹیجی والوں پر اعتراض کیا اور انہیں ایک سخت خط بھیجا۔

اس خط کا پرائز کیٹیجی کی طرف سے مندرجہ ذیل جواب دیا گیا:
”زمانہ حصہ میں جو عورتیں تھیں انہیں تلاشی سے پہلے عمل کے دوسرے

حصہ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

گورنر جنرل کو دیے جانے والے اس جواب سے پرائز کیٹیجی کی خود سری کا اندازہ ہو جاتا ہے!

جس وقت جنرل ہارس کو سلطان ٹیپو کی شہادت کی خبر ملی تو وہ فرط مسرت سے پیچھا اٹھا:

”آج ہندوستان ہمارا ہے۔“

گلکٹہ کے چیف جسٹس سر جان تھروٹ نے اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

”سلطان ٹیپو کی طاقت ہی ہمارے راستے کی سدا راہ تھی۔ اس کے

مرنے ہی ہندوستان پر ہمارا قبضہ ہمیشہ کے لیے ہو گیا۔“

لارڈ ولزلی، گورنر جنرل ہندوستان کو سلطان کی شہادت کا مشرورہ سنایا گیا تو اس نے ایک

عظیم شان جشن منعقد کرنے کا اعلان کیا۔

لارڈ ولزلی ۱۷ فروری ۱۸۰۰ء کو گلکٹہ واپس گیا تو وہاں اس کا شاندار جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس

میں چیف جسٹس، کمشنر انڈر ایجنٹ، ممبران کونسل اور دیگر افسران بالائے شریک ہوئے اور گر جاگھر تک پایادہ گئے۔

راستے کے دونوں طرف انگریز فوج صف باندھے کھڑی تھی اور ہندوستان میں یہ پہلا موقع تھا

کہ انگریزوں نے اتنا بڑا جلوس نکالا اور اسے مذہبی رنگ دیا ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ صرف سلطان کی ذات نے انگریزوں کو اب تک ہندوستان پر

قبضہ سے باز رکھا تھا اور اس کی شہادت کے بعد تو ہندوستان کے مختلف علاقے پکے ہوئے آسم کی طرح

انگریزوں کی جھول میں گنا شروع ہو گئے۔

مالی غنیمت کی تقسیم کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔

جب یہ کمیٹی قلعہ میں داخل ہوئی تو یہ لوگ محل کی دولت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لاکھوں جواہرات کے علاوہ سونے چاندی کی سلاخیں، زیورات اور بیش قیمت اشیاء محل میں موجود تھیں۔ بہت سی اشیاء برآمدوں اور صحن میں بکھری پڑی تھیں۔

پتہ چلا کہ بیرونی دروازے سے بعض سپاہی اور کچھ توپ خانہ والے اندر داخل ہوئے اور بت ماسامان لوٹ لے گئے تھے۔

جواہرات کو متعلق صندوقوں میں رکھا گیا تھا۔ صندوقوں پر حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی تہریں لگی تھیں۔ سونے کی سلاخیں اور زیورات دوسری جگہ صندوقوں میں تھے۔ زیورات میں بازو بند، انگلیں، گلو بند اور سر کی آرائش کی چیزیں تھیں۔

اوپر کے کمروں میں چاندی کی سلاخیں تھیں۔

ایک جگہ دو ہودے تھے جو پورے کے پورے چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ چاندی کے بہت سے طباق تھے جن پر میرے جواہرات لگے تھے۔

ان کے علاوہ قیمتی فرنیچر، دوربینیں، شیشے کا سامان، چاندی کے ظروف اور قیمتی کپڑوں کے سینکڑوں ٹکڑے تھے۔ قیلوں میں بیس لاکھ پونڈ سے تھے۔ ان کی قیمت اس وقت ۵ لاکھ پونڈ تھی۔ جواہرات کا اندازہ بیس لاکھ پونڈ لگایا گیا تھا۔ اس میں سے جزل ہارس کو سولہواں حصہ دیا گیا۔ اس طرح اس کے حصے میں ایک لاکھ ۴۲ ہزار نو سو پونڈ کے جواہرات آئے۔ اس کے علاوہ دس لاکھ پونڈ کا حصہ دوسروں کو دیا گیا۔

سلطان کے محل کی اشیاء میں اس کے ذاتی استعمال کے ۸۴ علمے، ۵۰ رومال، ۲۶ ٹوپیاں اور آٹھ زمر میں جگہ سے لگے دو خود تھے۔ ان کو یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا۔

سلطان کا تخت ہمارے سونے کے ۸ شیروں کی پشت پر قائم تھا، محلے سے محلے کے کر دیا گیا اور ہر جگہ اسی نمکھی کے حصے میں آیا۔ ان میں سے ہر ایک ۱۸۰ پونڈ مایٹ کا تھا۔

تخت کی چھت ایک انجیر کوئی گینٹ کو دی گئی۔ اس نے یہ چھت ایک ہزار سات سو ساٹھ (۱،۶۹۰) پونڈ میں فروخت کی۔

بعد میں گورنر جزل کی خواہش پر تخت کے تمام محلے خرید لیے گئے تاکہ بادشاہ کو بھجائے جاسکیں۔ آج بھی یہ تخت قلعہ وڈمر میں موجود ہے۔

لارڈ ولزلی کے ہندوستان کے بارے میں کیا خیالات تھے، ان کا پتہ اس کے ایک خط سے چلتا ہے جو اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

”میں ہندوستان میں اپنی فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع کر دوں گا کہ کمپنی کے ڈائریکٹران پھر سے ہندوستان پر رحم کرنے کی درخواست کریں گے۔“

چیف جسٹس سر جان تھروٹن نے لارڈ ولزلی کو، ۱۷ مئی ۱۷۹۹ء کو مندرجہ ذیل الفاظ میں مبارکباد پیش کی تھی:

”ہماری تاریخ ہندوستان کا سب سے شاندار اور عظیم کارنامہ آپ کے ہاتھوں انجام پانے پر میں آپ کو تیرہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔“

۱۸۴۱ء کے مصلحانہ جنگوں کے وقت سلطان کی حیثیت ایک فاتح کی تھی مگر اس کے چند ہی سال کے اندر اس کی تمام قوت خاک میں مل گئی۔ اس کے خاندان کو حکومت سے برطرف کر دیا گیا اور انگریزوں کا اقتدار دولت حاصل ہوئی جو ان کے تصور سے بھی زیادہ تھی۔ انگلستان کے لوگ جب بھی اس فتح کا ذکر کرتے تو لارڈ مارلٹن ولزلی کو ضرور خراج تحسین پیش کرتے تھے۔

اس سکارانہ کامیابی پر ولزلی کو ”مارکوئیس“ کا خطاب دیا گیا۔

جزل ہارس کو لارڈ ہارس آف مرگٹاٹم بنا دیا گیا۔

سپاہیوں کو تحفے دیے گئے۔ ان تحفوں کے ایک طرف فتح مرگٹاٹم کی تاریخ درج تھی اور دوسری جانب دریائے کاویری میں ایک شکست خوردہ شیر کی تصویر بنائی گئی تھی جسے بٹ جارج ایک گھوڑے پر سوار ہو کے نیزہ مار رہا تھا۔

تحفہ پر یہ تصویر بنا کر انگریزوں نے یہ بات تو تسلیم کر لی کہ سلطان ٹیپو مرگٹاٹم ہی کا نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا شیر تھا جس نے تخت و تاج کو ٹھکرایا اور میدان جنگ میں کود پڑا۔ پھر اس نے ایک سپاہی کی طرح رٹتے ہوئے جان دی۔

(نوٹ :

اگر خدا نے ہم پر رحم کیا تو ہم اس تخت کو انگلستان سے واپس لائیں گے
سلطان کے جنگلی جانوروں میں سے نہیں جیتے شاہ انگلستان جارج سوم کو بھیجے گئے تھے جیٹوں کے
ساتھ ان کی دیکھ بھال کرنے والے چملازم بھی بھیجے گئے تھے۔ ایک عدد بیل گاڑی اور دو بیل بھی شاہ
کو تحفہ بھیجے گئے تھے۔

سلطان بیپوکی خواہنگاہ جہول میرڈ کو بطور تحفہ دی گئی۔ ایڈنبرا میں یہ آج بھی موجود ہے۔

گورنر جہول ولزی کو ایک تلوار اور لارڈ کارنوالس کو ایک تلوار اور ایک خبر دیا گیا۔

سلطان کے پاس ایک نہایت نادر کتب خانہ تھا جس میں اسلامیات، فلسفہ، تاریخ، شاعری،
ادب اور قانون وغیرہ کی کتابیں اردو، فارسی اور مقامی زبانوں میں موجود تھیں۔ ان کتابوں کا ایک جگہ ڈھیر
لگا دیا گیا جسے دیکھ دیکھ کر شہزادے دل سوستے تھے۔

محل کے ساتھ اناج کے سات اور دوسری چیزوں کے ۲۰ گودام تھے جن میں چاول، گھی اور گرم مصالحہ
وغیرہ بھرا تھا۔

ایک گودام میں چاول نکالنے کے لیے بیکارہ سال پرانا دھان بھرا ہوا تھا جو نہایت اچھی حالت میں

تھا۔

قلعہ میں ایک ہزار توپیں، پانچ لاکھ گولیاں، بارہ ہزار گولے اور ساٹھ ہزار بندوقیں رکھی تھیں۔
توپوں میں ۵۱۔ انگریزی ساخت کی اور باقی سلطان کے کارخانوں کی بنی ہوئی تھیں۔

مال غنیمت کی تقسیم کے وقت حیدر آباد دکن کا سپہ سالار میر عالم سرنگاپٹم میں موجود تھا۔ اس
نے اس مال غنیمت میں حیدر آباد کا حصہ مانگا۔

جہول مارے نے اسے جواب دیا :

”سرنگاپٹم کو ہم انگریزوں نے فتح کیا ہے اس لیے کسی اور کو اس کا حصہ نہیں دیا جاسکتا۔“

اس سلسلہ میں تاریخ ”نظام علی خاں“ میں تحریر ہے :

”دورِ اعظمِ ارسطو جہاں اور میر عالم نے جہول مارے کی شکایت لارڈ

ولزی سے کی تھی۔“

”گورنر ڈارن میسور“ کا مصنف اس بارے میں ایک ادھر ہی حکایت بیان کرتا ہے۔ اس کے صفحہ

۲۳۸ پر لکھا ہے :

جب محل کی تمام دولت تقسیم ہو چکی اور کوئی چیز باقی نہ رہی تو آخر
میں محل میں سلطان کے کثیر التعداد جانوروں کو ٹھکانے لگانے کا سوال
پیش آیا۔ ان میں کثرت سے شیر اور چیتے تھے۔

جنگ کی ہونہائیاں میں ان جانوروں کی دیکھ بھال کرنے والے بھی
مارے گئے تھے اس لیے جانور کئی دن سے بھوک و پیاس سے بلبلا رہے تھے۔
لارڈ ولزی کے بھائی کرنل آر تھر ولزی نے میر عالم سپہ سالار لشکر حیدر آباد
سے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو ان جانوروں کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔

میر عالم نے اس پیش کش کو رد کر دیا۔ آخر سلطان کے ان محبوب جانوروں
کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔“

سرنگاپٹم پر قبضہ کے وقت سلطان کا بڑا بیٹا شہزادہ فتح حیدر قلعہ میں موجود نہ تھا۔ اس کے سلسلے
میں بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔

کرمانی لکھتا ہے :

”سلطان کی شہادت کے دن شہزادہ فتح حیدر اپنی فوج کے ساتھ کروی گٹھ
کی پھاڑی کے اُس پار تھا۔ جب اسے سلطان کی شہادت کی اور سرنگاپٹم پر
انگریزوں کے قبضہ کی خبر ملی تو وہ پریا پٹم چلا گیا۔“

سلطان کے غدار امراء اور وزراء جنگ کی صحیح خبریں شہزادے
تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔

ایک انگریز مورخ نے شہزادے کے بارے میں لکھا ہے کہ :

”اس المناک دن شہزادہ فرانسسین کی چھاؤنی میں تھا۔“

مگر یہ خیال غلط ہے۔ شہزادے کے اپنے ہی آدمیوں کا ایک چھوٹا سا لشکر تھا جس میں کچھ
فرانسیسی بھی شامل تھے۔

انگریزوں نے شہزادے کو رام کرنے کے لیے قمر الدین اور پورنیا کو بھیجا۔ اس وقت تک انگریزوں
کا یہ خیال تھا کہ وہ سرنگاپٹم کا تخت و تاج شہزادہ فتح حیدر کو دیں گے بشرطیکہ وہ بغیر جنگ کے خود کو
ان کے حوالے کر دے۔ چنانچہ قمر الدین اور پورنیا نے اس سے انہی خطوط پر گفتگو کی۔

ہمارے لشکر کے غدار بھی ہیں اور تمہیں دشمن کے حوالے کر دیں گے۔
 ہم مرزا کا پٹم چاہتے ہیں اور تمہیں اپنی وفاداری سے آزاد کرتے ہیں۔ ہم اطاعت کے لیے جا
 رہے ہیں اسی لیے ہمیں کسی فوج کی ضرورت نہیں۔ چاہو تو لشکر تم لے جا سکتے ہو۔ ہم تمہارے لیے دعا گو
 رہیں گے۔
 ملک جہاں خاں نے بھی اتنے ہی دکھ سے جواب دیا:

”شہزادہ عالم۔ ہم نے سلطان اور سلطنتِ خدا داد سے وفاداری کی قسم کھائی تھی۔ سلطان ہاشمید
 ہو گئے لیکن سلطنتِ خدا داد ابھی باقی ہے۔ ہم سلطنتِ خدا داد سے بے وفائی نہیں کر سکتے اور انگریزوں
 سے اسی الفت تک لڑتے رہیں گے جب تک ہماری روح اور جسم کا رشتہ باقی ہے۔ آپ مرزا کا پٹم تشریف
 لے جائیے۔ خدا آپ کو محفوظ رکھے۔“

تاریخ بتاتی ہے اس وقت شہزادے کی فوج میں صرف ایک سو بیس فرانسیسی سپاہی تھے اور سلطنت
 خدا داد میں موجود فرانسیسیوں کی یہی تعداد تھی۔

ان سپاہیوں کے سردار نے شہزادے سے عرض کیا:
 ”مہاجبِ عالم۔ ہم نے سلطان سے عہد کیا تھا کہ ہم شہزادے کو اپنی زندگی میں تمنا نہیں چھوڑیں گے اس لیے
 آپ ہیں اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیں۔
 ہم جانتے ہیں کہ انگریز ہمارے شدید دشمن ہیں مگر ہم آپ کو تنہا نہیں جاتے دیں گے اور آخری وقت
 تک آپ کے ساتھ رہیں گے۔“
 شہزادہ فتح حیدر کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

قدرت کی یہ کتنی بڑی قسم ظریفی تھی کہ سلطنتِ خدا داد میں ایک طرف تو پورنیا، میز حادق اور میر علی الدین
 اور میر قمر الدین جیسے غدار تھے اور دوسری طرف جہاں خاں، ناصر علی اور فرانسیسیوں کی وفاداری بھی موجود
 تھی جو ہر حالت میں شہزادے پر جہاں ناکر کے لیے پناہ دے تھے۔

شہزادہ فتح حیدر اپنے ایک سو بیس فرانسیسی سپاہیوں کے ساتھ انگریزوں کی اطاعت کے لیے
 مرزا کا پٹم روانہ ہو گیا۔

پورنیا اور قمر الدین کی یہ ایک اور کامیابی تھی۔ وہ دل ہی دل میں مسک رہے تھے۔

شہزادے نے ان غداروں سے دریافت کیا:

”اب تم لوگ میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

نیک حرام پورنیا نے سر جھکا کر بڑے غمزے سے عرض کیا:

”مہاجبِ عالم۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب جنگ فصول ہے۔ اگر آپ انگریزوں کی اطاعت پر آمادہ ہو
 جائیں تو آپ کو حکومت مل سکتی ہے۔“

شہزادے نے قمر الدین سے پوچھا:

”تم کیا کہتے ہو اس سلسلے میں؟“

قمر الدین نے بھی سسکھا منہ بنا کر کہا:

”مہاجبِ عالم۔ مجھ سے انگریزوں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر شہزادے نے جنگ کے فیرو کو حوالے
 کر دیا تو سلطان شہید کی حکومت انہیں دیدی جٹے گی۔“

اب شہزادے نے اپنے وفادار سپہ سالار ملک جہاں خاں کی طرف دیکھا:

”ملک جہاں خاں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

ملک نے دست بستہ عرض کیا:

”مہاجبِ عالم۔ آپ پورنیا اور قمر الدین کی باتوں کا اعتبار نہ کیجیے۔ یہ دونوں احسان فراموش اور
 غدار ہیں صرف ایک مرزا کا پٹم کا فلعہ ہوتا ہے۔ ابھی تو سلطنتِ خدا داد کا وسیع ملک اور مضبوط
 قلعے موجود ہیں اور ہم وفادار آپ کے ساتھ ہیں۔“

سپہ سالار ملک جہاں خاں اور دوسرے سردار میر میراں ناصر علی نے شہزادے کو بہت سمجھایا بکھایا
 مگر شہزادہ دیر تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

پھر اس نے آخری فیصلے سے پہلے اپنے سرداروں کے چہرے ایک ایک کر کے پڑھنا شروع کیے۔
 اس وقت اس کی چھٹی ہنسی بڑی تیزی سے پھٹ کر شروع ہو گئی اور اس نے عسوس کیا کہ ملک جہاں خاں
 اور میر میراں ناصر علی کے علاوہ سولہ ایک دوسرے سرداروں کے اور باقی تمام سردار ایک دوسرے کو کھینچوں
 سے دیکھ رہے ہیں۔ اور ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔

آخر شہزادے نے بڑے دھم سے فیصلہ کیا:

”جہاں خاں اور ناصر علی! ہم تمہارے لشکر گزار ہیں کہ تم جیسے وفادار اب بھی موجود ہیں مگر جس طرح
 باطلان کو شہید کرنے میں ان کے اپنے امیر و وزیر پیش پیش تھے اسی طرح اگر ہم نے جنگ جادی رکھی تو

دوسری طرف دفا دار سپہ سالار ملک جہاں خاں آنسو بہانا ہوا اپنے غمخیز شکر کے ساتھ دوسری جانب جا رہا تھا۔

ملک جہاں خاں کو اپنی منزل کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ہاں اس کے پیش نظر ایک مقصد ضرور تھا اور یہ مقصد تھا:

”انگریزوں سے جنگ۔ آخری سانس تک جنگ۔“

میر میراں نامر ملنے سلطنت خداداد کے تمام امیروں سے باغی ہو کر سلطان اور اس کے بیٹے کی دفا داری کا حلف اٹھایا تھا اور وہ اپنے عہد پر تمام عمر قائم رہا حالانکہ باقی تمام میروں اور میر میرافوں نے اپنی غداری کے عوض انگریزوں سے بڑے بڑے وظیفے حاصل کیے تھے مگر میر میراں نامر علی، شہزادے کے پیرمالا ملک جہاں خاں کے ساتھ چلا گیا تھا اور اپنی آخری سانس تک انگریزوں سے لڑتا رہا۔

سلطنت خداداد کے ان دونوں دفا داروں نے انگریزوں کے خلاف اپنی جنگ کو کس طرح جاری رکھا اس کے ذکر سے پہلے ملک جہاں خاں کے بارے میں کچھ بتانا ضروری ہے۔

پورخ ملس لکھتا ہے:

”کتاب تذکرۃ البلاد والاعلام“ کے دسویں باب میں ملک جہاں خاں

کے حالات اس طرح تحریر ہیں:

ملک جہاں خاں بمطابق قومیت مرہٹہ تھا۔ اس کا پہلا ناؤ ڈونڈیاں داغ تھا۔

بعض تاریخوں میں اس کا نام دھونڈیا داگبہ لکھا گیا ہے۔ خان مھوف ایک

نہایت شجاع اور جری مرد میدان تھا۔ سلطان کی ملازمت میں آنے سے پہلے

اس کے پاس تین چار سو سوار تھے۔ وہ ہمیشہ مرہٹوں، انڈان اور سلطنت خداداد

پر چھاپے مار کر لوٹ مار کیا کرتا تھا اور کبھی کسی کے ہاتھ نہیں آیا۔ سلطانی

فوج بھی اس کی گرفتاری سے عاجز آگئی تھی۔

اس وقت سلطان نے اسے ایک اقرار نامہ بھیجا کہ اگر وہ ملازمت سلطانی

میں آجائے تو اس کے جان و مال کے علاوہ اس کے مراتب بھی بڑھا دیے

جائیں گے۔

چنانچہ سلطان کے قول کا اعتبار کرتے ہوئے وہ دار السلطنت آیا۔ یہاں

سلطان نے اسکی بہت آؤ بھگت کی۔

ڈونڈیا داغ کی اس آؤ بھگت سے نکت حرام میر صادق کو حسد پیدا ہوا اور وہ موقع کی تلاش میں رہا۔

ایک طرف تو وہ دن رات سلطان سے اس کی شکایتیں کرتا اور دوسری طرف اس کی تباہی کی سازشیں کرتا رہتا تھا۔

آخر ایک دن اس کو موقع مل گیا۔ چنانچہ اس نے سلطان سے اس قدر جھوٹی شکایتیں کیں کہ خان مھوف کی طلبی ہو گئی۔

جب جہاں خاں محل کے دروازے پر پہنچا تو اسے گرفتار کر کے حراست میں رکھا گیا اور اس کی فوج سلطانی فوج میں داخل کر لی گئی۔ مگر سلطان کے دل میں جہاں خاں کے لیے جگہ تھی۔

اگرچہ جہاں خاں کا خرچ صرف تین روپے روزانہ مقرر کیا گیا تھا بیس

جہاں خاں نے اس کا کوئی گلہ نہ کیا۔ یہاں تک کہ کچھ دنوں بعد سلطان نے

ایک لیٹن جہاں خاں کے نام سے تیار کی اور خان مھوف کی رہائی کا حکم دیا۔

نکت حرام میر صادق نے عین وقت پر پھر جہاں خاں کی شکایت کرتے

ہوئے دل کا غبار نکالا اور کہا:

”جہاں پناہ۔ ڈونڈیا جیسا مکار اور بد طبیعت انسان دنیا کے پر دے پر

نہ ہوگا۔ جب تک وہ آزاد رہا، اپنے چند سواروں کے ساتھ سلطنت خداداد

مرہٹوں اور نظام کے علاقوں کو جس طرح تاخت و تاراج کرتا رہا وہ ذات شاہ

سے مخفی نہیں۔ اگر اس کو اتنا بڑا عمدہ اور کثیر فوج دے دی گئی تو سلطنت

کی خیر نہیں۔“

سلطان پھر نکت حرام میر صادق کے بہکاوے میں آ گیا۔ اس نے جہاں خاں

کی رہائی کا حکم موقوف کر دیا۔

ڈونڈیا داغ کو بھی خبر تھی کہ سلطان کے دل میں اس کی کس قدر عزت

ہے۔ چند ہی دن اس طرح گزرے تھے کہ سلطان نے اسے رہ کر دیا۔

اس رہائی کے بعد ڈونڈیا داغ مسلمان ہو گیا۔ اس کا اسلامی نام شیخ احمد

رکھا گیا مگر اس نے اپنے لیے جہاں خاں کا نام پسند کیا۔

میر صادق کے شر سے بچنے کے لیے جہان خاں شہزادہ فتح حیدر کے پاس چلا گیا۔
جب شہزادے نے انگریزوں کی اطاعت کا اعلان کیا تو جہان خاں نے مات الفاظ میں شہزادے سے کہا:
”صاحبِ عالم میں اس کا میں آپ کی اطاعت کرنے سے معذور ہوں۔
یہ کہہ کے اس نے اپنا گھوڑا اوڑا اور شہزادے کے کمپ سے نکل گیا۔
بھی مؤرخ اگے چل کر لکھتا ہے:

”جب شہزادہ حیدر پر اس کی نصیحت کا رگزن ہوئی تو جہان خاں شہزادے سے الگ ہو کر مغرب کی طرف چلا گیا۔ بت جلد اس کے پاس چڑھ سوار جمع ہو گئے۔

پھر ادھر ادھر تاخت و تاراج کر کے جہان خاں نے اس قدر طاقت پکڑ لی کہ اس کے پاس بیس سے ۲۵ ہزار کے درمیان فوج اکٹھا ہو گئی۔
پھر تو یہ عالم ہوا کہ دو آبدار دریائے تنگ بھدرا اور دیائے کرشنا میں اس کے ناک سے دلی میں دہشت پیدا ہو جاتی تھی۔
جہان خاں نے سلطان کے دشمنوں سے انتقام لینا شروع کیا۔ مرہٹہ سردار گوگلے اور پرمرام جو سلطان کے مقابلہ پر کئی مرتبہ آئے تھے، جہان خاں نے ان کے سر نیزوں پر چڑھا کے تشہیر کی۔

انگریزی فوج کے کئی دستے اس کے مقابلے پر آئے اور انہیں سخت ناکامی ہوئی۔

آخر کرنل آر تھروڈلی ایک زبردست فوج کے ساتھ جہان خاں کے مقابلہ پر آیا اور اس نے آتے ہی جنگ کے بجائے جہان خاں کی فوج میں سازش کے دروازے کھولنا شروع کر دیے۔ پھر بھی جہان خاں نے دو سال تک انگریزوں کو ناکوں چنے نہ جوائے۔

جہان خاں کے پاس چونکہ کوئی قلعہ نہ تھا اس لیے اس نے کرنل اوگرٹھ کے بچانوں کا سہارا لیا۔ مگر بچانوں نے غداری کی اور ان کی غداری کی وجہ سے

یہ وفا دار کو مال بھنوار کے قریب شہید کر دیا گیا۔
سلطان ٹیپو کے بعد یہ دوسرا جب وطن تھا جو اس طرح ناموری کے ساتھ شہید ہوا۔

تاریخ کے اس بیان میں تھوڑا سا سہو یا جاننا ہے۔ کیونکہ جنگ آزادی یعنی مرگاکاٹیم کی چوتھی بلک کا پہلا نامور شہید سید غفار تھا۔ سید غفار کے مر پر سبز چتری تان کر انگریزوں کو اس کی نشان دہی کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سید غفار کو توپ کے گولے سے نشانہ بنا کر شہید کر دیا گیا تھا۔
دوسرا نامور شہید خود سلطان ٹیپو تھا۔
اور اب تیسرا نامور شہید جہان خاں تھا جسے کرنل اور کٹرپہ کے بچانوں کی غداری سے انگریزوں نے شہید کیا۔

ایک اور مؤرخ رئیس نے ملک جہاں خاں کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

”ملک جہاں خاں مرہٹہ تھاجو حیدر علی کے سواروں میں ۱۶۰ء میں بھرتی ہوا۔

۱۶۲ء میں جب کلانوالس نے مرگاکاٹیم کا محاصرہ کیا تو یہ فرار ہو کر دھڑار ڈھبھنجا اور دھڑار دھڑار قراچی کرنا پھرا۔ ۱۶۴ء میں اسے سلطان نے طلب کیا۔

اس کے ساتھ ۲۰ سوار تھے۔ جب وہ سلطان کے حضور پہنچا تو سلطان نے اسے اسلام قبول کرنے کو کہا۔ انکار پر اسے قید کر دیا گیا۔

جب ۱۶۹ء میں انگریزوں نے قبضہ کیا تو اسے اس حال میں پایا کہ ایک دیوار سے وحشی جانوروں کی طرح جکڑا ہوا تھا۔

اسے رہا کیا گیا تو یہاں سے فرار ہو کر وہ مرہٹہ سردار پر پہنچا اور وہ ایک بڑی فوج جمع کر کے میسور پر حملے کرنے لگا۔ آخر کرنل ولزلی کو اس کے مقابل بھاگ گیا۔

حمینوں کی مسلسل کوشش اور جنگوں کے بعد ایک جگہ جہاں خاں اور اس کی فوج انگریزوں کے فرغے میں پھنس گئی اور ملک جہاں خاں اس معرکہ میں مارا گیا۔

اس مؤرخ کا قلم اس قدر زہر آلود ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس نے نہ صرف ملک جہاں خاں کی وفاداری، حب الوطنی اور وطن دوستی کی توہین کی ہے بلکہ سلطان کو بھی ایک ظالم اور افسانہ فراموش انسان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔



سرنگاپٹم پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور سلطنت خداداد سے بڑے بڑے سردار جو سلطنت اور سلطان کے ہی خواہ اور وفادار تھے، وہ تمام کے تمام شہید ہو چکے تھے اس لیے انگریزوں نے اپنی مرضی کے مطابق سلطنت خداداد کے حصے بخرے کرنا شروع کر دیے۔ حالانکہ شہزادہ فتح حمید نے بغیر جنگ کے انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی تھی اور قمر الدین اور پورینا نے شہزادے کو یہ ضمانت دی تھی کہ وہ انگریزوں سے اسے سلطنت دلا دیں گے۔

مگر۔۔۔ انگریزوں کو اب کس کا خوف تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں، وعدوں اور اصولوں کی پابندی کرتے۔ دوسری بات یہ کہ لارڈ ولزلی اور کرنل ولزلی دونوں نے یہ بات پہلے ہی طے کر لی تھی کہ سلطنت خداداد سلطان کی اولاد کو واپس نہیں کی جائے گی۔

پس۔۔۔

دکھاوے کے لیے اور سلطنت پر قبضہ کرنے کے لیے جنرل ہارسی نے ایک کمیشن بٹھایا جس کا صدر وہ خود بنا اور کرنل ولزلی، سر باری کلوز اور کرنل کرک پیٹرک اس کے ممبر مقرر کیے گئے۔ ان کے علاوہ حیدر آباد کے سپہ سالار میر عالم اور سلطان شہید کے چند وزراء کو صرف مشاورت کے لیے منتخب کیا گیا۔

کمیشن کے سامنے سلطنت کے دو دعویٰ درج تھے :
۱۔ سلطان شہید کے عاجزادے۔

۲۔ میہور کا قدیم ہندو خاندان۔
معاملات کی چھان بین کے بعد کیشن کے آگے مندرجہ ذیل دلائل رکھے گئے۔

شہزادوں کی طرف سے دلائل:

- ۱۔ حیدر علی خاں کو اگر غاصب سلطنت تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس بات کو اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ سلطنت پر اس کا حق مسلم ہو چکا ہے۔
- ۲۔ حیدر علی خاں اگر غاصب سلطنت تھے تو ان کے فرزند سلطان ٹپو اور اور ان کے شہزادے اس الزام سے بالکل بری اور جائز وارث سلطنت ہیں۔
- ۳۔ سلطان ٹپو نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت اس طرح کی ہے کہ وہ حکومت کرنے کے اہل ہیں اور ان کے دل امیدوں سے بھرے ہوئے ہیں۔
- ۴۔ سلطنت کا رقبہ اس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ میسور کی سلطنت نے کبھی اتنی وسعت نہ دیکھی تھی۔

ہندو خاندان کی طرف سے دلائل:

- ۱۔ سلطنت میسور نے اپنے حق سے کبھی دست برداری نہیں کی اور ہمیشہ اپنی سلطنت کو حاصل کرنا چاہا۔
- ۲۔ حیدر علی یا سلطان ٹپو نے اسے اعلان کیا کہ اس حق سے محروم نہیں کیا۔
- ۳۔ دھرم کا اتوار جو ایک سیاسی حیثیت رکھتا ہے، اس سے روکنے کی بھی حیدر علی یا سلطان ٹپو نے کبھی کوشش نہیں کی جس کی وجہ سے ہندو رعایا کے دل میں قدیم خاندان کا وقار بختم باقی ہے۔

—

مندرجہ بالا دلائل کی روشنی اور ملکی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیشن نے مندرجہ ذیل نتائج مرتب کیے ہیں:

- ۱۔ اگر سلطنت سلطان کے شہزادوں کو تفویض کی جائے تو اس بات کا امکان ہے کہ ان کے دل میں انتقام لینے کا جذبہ موجود رہے گا۔
- ۲۔ سلطان کے شہزادے دربار کا جاہ و جلال اور سلطنت کی وسعت دیکھ چکے ہیں۔ وہ اس کو فراعونش نہ کہتے ہوئے اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔
- ۳۔ سلطان کے شہزادوں کو معلوم ہے کہ سلطان نے کس طرح فرانسیسیوں اور دیگر اقوام سے معاہدے کیے تھے اور ابھی جبکہ فرانسیسی خطرہ موجود ہے تو یوں ممکن ہے کہ وہ پھر سے ماز بار شہزادے کو دیں۔
- ۴۔ اگر سلطان کے کسی شہزادے کو تخت نشین کیا جائے تو وہ یقیناً ان لوگوں کو معاف نہیں کرے گا جو سلطنت کی تباہی اور شاہی خاندان کی محکومانہ موجودہ حالت کے ذمہ دار ہیں۔

(یہ اشارہ میر قمر الدین، پورنا اور میر قاسم جیسے عداؤں کی طرف ہے)۔

۵۔ نفاذ علی خاں والی حیدر آباد دکن جو اس جنگ میں ہمارا حلیف ہے، سلطان کے شہزادوں کو تخت دینے کا مخالف ہے۔ اس کے ثبوت میں کیشن کے پاس حیدر آباد کے وزیر اعظم ارسطو جاہ کا ایک خط ہے جس میں اس نے اپنے سپہ سالار میر عالم کو لکھا ہے:

”سلطان ٹپو کے فرزندوں اور سپہ سالاروں نے انگریزی کمپنی کے ذریعے جو استدعا کی تھی کہ انہیں بغرض پرورش نصف سلطنت اور نصف خزانہ دیا جائے تو (انہیں) تم کیوں نہیں کہتے کہ قلعہ ہم نے حملہ کر کے فتح کیا ہے اور وہ اسیرانِ جنگ میں سے ہیں۔ ان کے لیے قوتِ لایوت کے موافق تجویز کو ناجائز ہے۔“

پھر اس کیشن کو مخالف کہہ کر ہمارے ارسطو جاہ نے لکھا تھا:

”ا میں جانب (ارسطو جاہ) کو یقین ہے کہ سلطان کے لڑکوں اور بیٹاؤں کو منشا سے سرکار اور اظہار میر صاحب (میر عالم) کے موافق کیا جائے گا اور نصرت ملک ان کو ہرگز نہ دیا جائے گا“

کیشن نے اپنے خاص دلائل اور حیدر آباد وکن کی رائے ظاہر کرنے کے بعد سلطان کے ارادہ و زرار سے بھی رائے طلب کی۔ اس وقت غلام علی خاں نگر سے نے جواب دیا تھا:

”افعی کشتن و بچہ اش نگہداشتن کا رخصر و مندان نیست“

(سانپ مارنا اور اس کے بچے کو پالنا عقلمندوں کا کام نہیں)۔

سلطنت خداداد کی تقسیم کے بارے میں کیشن نے جو فیصلہ کیا اس کے بارے میں یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ فیصلہ نہ تو کیشن نے کیا اور نہ فیصلہ کرنے کے لیے یہ کیشن بٹھایا گیا تھا بلکہ کیشن صرف اس لیے بٹھایا گیا تھا کہ وہ انگریزوں کے اس طے شدہ فیصلہ کو اس انداز سے ترتیب دے کہ پیش کرے کہ عوام کو اس سے بے وقوف بنایا جاسکے اور انگریز قوم تاریخ میں خود کو اس قریب دہی کے باوجود انصاف پسند کہلا سکے۔

در اصل کیشن کا یہ فیصلہ وہی فیصلہ ہے جس کی تفصیل گورنر جنرل لارڈ دلہی نے اپنے دو خطوط میں انگلستان کو بھیجی تھی۔

اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ دلہی کے ان دونوں خطوط کو لفظ بہ لفظ اس کیشن کے فیصلہ میں بالکل اسی طرح سمودیا گیا ہے جس طرح دلہی نے لکھا تھا۔

ان خطوط کا پیش کرنا ایک طرح سے فیصلہ کا توار ہو گا مگر صرف چند جملوں سے قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ سب دلہی کا کیا دھرا تھا۔

دلہی اپنے پہلے خط میں لکھتا ہے:

”سلطان شیو کے دل و عہد کو انہی اصولوں کی تعلیم دی گئی ہوگی، وہی جذبہ اور تعصبات اس میں بھرے ہوں گے۔ اب ہمارے بظرف و کم اور نگرانی میں اس کا تحت نشیں ہونا اس کے لیے اس قدر سخت کمزوری اور ذلت کا باعث ہو گا کہ کوئی غیرت مند تاجدار اسے گوارا نہیں کر سکتا۔ اگر محدود نقطہ نظر سے بھی اس پر غور کیا جائے تو یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ سلطان شیو کا بیٹا اس انتظام کو (جس سے اس کی سلطنت کے ٹکڑے ہوں اور

اس کی آزادی مفقود ہوگئی ہو) درہم برہم کرنا اپنا فرض سمجھے گا۔ خود اس کی خبیایاں اسے اس بات پر مجبور کرنی ہیں کہ وہ ہماری قوت اور ہمدردی سے ہمیشہ دلی نفرت رکھے۔ لہذا اس خاندان کے شہزادے کو تحت نشیں کرانے سے ہمارے جدید نظام کے خاتمے کی ابتدا ہو جاتی۔“

اب ملاحظہ ہو کہ سلطان کے کسی شہزادے کے بجائے ہندو خاندان کو تخت نشیں کرنے میں دلہی کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔

دلہی نے اپنے ایک مراسلہ میں لکھتا ہے:

”میسور کے خاندان نے انتہائی ذلتیں برداشت کی ہیں لہذا یہ خاندان ہمارا احسان مند ہوگا اور ہمارے ساتھ خلوص کا اظہار کرے گا کیونکہ ہم نے اسے قعر ذلت سے نکال کر باقاعدہ عروج پر پہنچا دیا ہے۔ اس خاندان کے ہمیشہ برطانوی حکومت سے دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ اپنے بڑے دنوں میں بھی اس خاندان نے ہمارے دشمنوں سے کسی طرح کے تعلقات نہیں رکھے لہذا انہیں برسر اقتدار لانا ہماری نیابتی کام ہوگا اور وہ محض ہماری اعانت سے ہی سلطان شیو کے خاندان والوں اور دیگر دعویداروں سے اپنے تخت و تاج کو برقرار رکھنے کی توقع کر سکتے ہیں۔“

— وہ فرانسیسیوں اور دوسری طاقتوں کے خلاف ہوں گے۔

میسور کے معاملات کا اس طرح سے انتظام ہو جانے سے اس مخالف طاقت کا محض خاتمہ ہی نہ ہو گا بلکہ میسور کی سلطنت جس کے نام سے پورا کوٹناکھ تھرا تھا اب ہماری پشت پناہ ہوگی اور کپنی، اس کی رعایا اور اس کے حلیفوں کے لیے دولت اور قوت کا سرچشمہ ہوگی۔“

پس۔ لارڈ دلہی کے منصوبے کے مطابق سلطان کے خاندان کو سلطنت سے محروم کر کے سلطنت خداداد کی مندرجہ ذیل بند باندھ کی گئی:

۱۔ انگریزوں نے کناراکا صوبہ، کوٹھتور دارا پورم اور ویناڈ کے اضلاع اور وہ تمام علاقہ لے لیا جو مالابار اور کونناکھ کے درمیان زیریں گھاٹ پر واقع ہے۔

یا دلگاز رہے گی۔ ہماری اولاد آپ کی گورنمنٹ سے اس اظہارِ حسنِ عقیدت کو کبھی فراموش نہ کرے گی۔ اسی کی امداد پر پہلا بھروسہ ہے۔
دستخط:

۱۔ دیو ارجی منی

۲۔ لچھی منی

اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد نئے راجہ کی تخت نشینی کا مسئلہ پیش ہوا تو مناسب یہ سمجھا گیا کہ اس سے پیشتر سلطان کے شہزادوں کو ملک سے باہر بھیج دیا جائے۔
اس سے متعلق ماڈرن میسور کا معصوف لکھتا ہے:

”جب یہ طے ہو گیا کہ ہندو راج قائم کیا جائے تو کرنل ولزلی نے شہزادہ فتح حیدر کو اطلاع دی:

”گورنر جنرل کے خیال میں انگریزوں کے اتحادیوں کے مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ مناسب نہیں ہے کہ تختِ سلطان کے وارثوں کو دیا جائے۔ اس لیے مات لاکھ سالانہ کی پیش کش گزارے کے لیے غصوں کی گئی ہے۔ اس لیے اب یہ طے شدہ ہے کہ آپ (شہزادہ فتح حیدر) اور سلطان کے اہل خاندان کو میسور کی حدود سے باہر بھیج دیا جائے۔“

اس کا ردائی کے لیے دوسرا دن مقرر کیا گیا۔ شہزادہ فتح حیدر نے اس مجلس اور حکم پر تعجب کا اظہار کیا اور کہا:

”میں نے انگریزوں کے قول پر بھروسہ کر کے اپنے آپ کو سپرد کر دیا تھا۔ اگر کمپنی تخت و تاج نہ بھی دے تو اپنے باپ دادا کے مزاروں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“

کرنل ولزلی نے اس کے جواب میں کہا:

”قول جو دیا گیا تھا اس کے کوئی اور معنی نہیں ہے جاسکتے یہ یقین نہیں دلایا گیا تھا کہ تخت و تاج دے جائیں گے۔“

اس کے علاوہ یہ انگریزی قانون ہے کہ حکومت اگر چاہے تو اپنی رعایا میں سے کسی شخص کو بھی اپنی جائے رہائش چھوڑ کے کسی اور جگہ رہنے پر مجبور

اس کے علاوہ تلمیذ مرزا کا پٹم اور وہ تمام قلعے جو گھاٹ کے دروں کے ناکوں پر چھائے ہوئے تھے، انگریزوں نے قبضے میں لے لیے۔

۲۔ نواب نظام الملک کو گنتی اور گرم کندا کے علاقے، جیش درگ کے تمام علاقے اور میسور کے سرحدی علاقے دیے گئے۔

۳۔ مرہٹوں کو دونوں طاقتوں کے نصف سے زیادہ حصہ دیا گیا مگر یہ شرط لگائی گئی کہ وہ فرانسس پیروں کے خلاف صاف اور واضح معاہدہ کریں اور کمپنی کی مرضی کے بغیر کسی یورپین کو ملازم نہ رکھیں۔

نیز یہ کہ میسور میں جو ریاست قائم کی جا رہی ہے اس کے استحکام کی ضمانت دیں۔

مرہٹہ پیشوا نے اس شرط سے انکار کر دیا چنانچہ اس کے حصہ کو بھی کمپنی اور نظام نے آپس میں بانٹ لیا۔

۴۔ بقیہ سلطنت ہندو راجہ کو دیدی گئی۔ اسے گدی پر بٹھانے میں یہ بھی مصلحت تھی کہ ہندوؤں کی تالیفِ قلب کی جائے۔ بعد ازاں ۲۲ جون ۱۷۹۹ء کے معاہدے کے تحت یہ علاقہ بھی انگریزوں کے ماتحت چلا گیا۔

ایٹ اینڈ یا کمپنی کے اس علیحدہ کو بیوہ رائیڈ نے ۲۴ جون ۱۷۹۹ء کو شکریہ کا مندرجہ ذیل خط لکھ کر قبول کیا:

”آپ نے ہمارے بچے کے لیے میسور نگر کی حکومت مع تعلقات کے بحال کر دی ہے اور پورنیا کو دیوان مقرر کیا ہے۔ اس سے ہم بید مراد ہوئے ہیں۔ ہماری سلطنت کو ہمارے ہاتھ سے نکلے چالیس برس چوکے تھے۔ اب آپ نے اپنی ہمرانی سے پھر ہمارا ملک ہم کو دیا۔ اور پورنیا کو ہمارا دیوان مقرر کیا ہے۔ جب تک چاند سورج تباہ ہیں ہم آپ کی گورنمنٹ کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کریں گے اور ہمیشہ اپنے آپ کو آپ کے زیرِ سایہ اور آپ کا تابع فرمان سمجھیں گے۔“

آپ نے ہمارا نام قائم کیا۔ یہ بات ہمارے خاندان میں پشت و پشت تک

کر سکتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ انگریز حکومت نے تخت و تاج کے معاملے میں انصاف اور
رحمہلی سے غور کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب موجودہ وقت میں وہ اس کے
معاذ کے خلاف ہے خصوصاً جب اسے معلوم ہوا کہ سلطان شیواہ اس کے
اہل خاندان کا رجحان فرانس والوں کی طرف زیادہ ہے جو انگریزوں کو
ہندوستان سے نکانا چاہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی شہزادہ فتح حیدر کو دھکی بھی دی گئی کہ اگر اس نے گورنر جنرل کے حکم کی خلاف
ورزی کی تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہو گا۔ یہ دھکی شہزادہ عبدالخالق شہزادہ معز الدین اور شہزادہ محمد الدین
کو بھی دی گئی۔
پھر شہزادگان کو ۱۸ جون ۱۷۹۹ء کو دہلیور بھیج دیا گیا اور ۱۸۰۶ء میں سلطان کے پورے
خاندان کو کلکتہ بھیج دیا گیا۔

سلطان شیواہ نے میسور کے ہندو راجہ کے خاندان کے جس لڑکے کو راجہ بنایا تھا اس کا نام
خاصہ چامراج تھا۔ وہ ۱۷۹۶ء میں مر گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کرشن راج تھا۔
ورلانی نے اسے سندھیشی کے لیے چنا اور مرنگا پٹم کے بجائے شہر میسور کو اس کا دار السلطنت
قرار دیا۔

پورنیا کو اس کی خدمات یعنی خدائیوں کے صلہ میں ریاست کا دیوان (وزیر اعظم) مقرر کیا گیا اور
تخت نشینی کی تاریخ ۳ جون ۱۷۹۹ء طے پائی۔
چنانچہ ۳ جون کو رسم تاجپوشی ادا کی گئی۔

یہ رسم دوپہر کے وقت منعقد ہوئی۔ اس کے لیے راجاؤں کا پرانا تخت لایا گیا اور ایک خاندان
جشن منایا گیا۔

انگریزی کمیشن کے ارکان اور میر عالم میسور گئے۔ پورنیا نے بہت سے ہندوؤں کے ساتھ ان کا
استقبال کیا۔ جنرل ہارسن اور میر عالم نے کرشن راج کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھایا۔ اسے توپوں اور ہندوؤں
کی سلامی دی گئی۔

تین روز بعد کمیشن واپس چلا گیا۔ پورنیا کو دیوان اور کرنل باری کلوز کو ریزیڈنٹ مقرر کر دیا گیا۔
پھر ۸ جولائی ۱۷۹۹ء کو ایک نئے معاہدے کے تحت میسور کا نیا راجہ سیاسی معاملات میں کمپنی کا ماتحت
ہو گیا۔

معاہدے کی دوسری شرط یہ قرار پایا کہ :

۱۔ ریاست کی حفاظت کے لیے کمپنی ایک فوج رکھے گی جس کے مصارف کے
لیے راجہ سالانہ سات لاکھ پگوڑے ادا کرے گا۔

۲۔ راجہ کسی غیر سلطنت سے کسی قسم کے تعلقات پیدا نہیں کرے گا نہ ہی کسی
یورپین کو ملازمت میں رکھے گا۔

۳۔ حکومت برطانیہ کو اختیار ہو گا کہ وہ ریاست کی حفاظت کے لیے جس
قلعہ میں چاہے اپنی فوج رکھے۔

سلطنت خداداد کی چوتھی جنگ ۱۷۹۹ء کے خاتمہ پر سلطان شہیدی جج بندی کے حساب سے بقیہ
سلطنت خداداد کی آمدنی کا اندازہ ۵۵۲۹۸۳۶ پگوڑے تھا جبکہ ۱۷۹۲ء میں کل ریاست کی آمدنی
کا اندازہ ۵۸۰۹۸۳۵۰ پگوڑے تھا۔
انتظامی اخراجات وضع کرنے کے بعد انگریزوں نے آمدنی کا حساب تقریباً ۳۰۲۲۲۲۳۵ پگوڑے
لگایا اور ورلانی نے اس کی تقسیم مندرجہ ذیل طریقے پر کی :

۱۔ میسور کی نئی ریاست	۲۹۹۳۳	مرچ میل	۱۳۷۴۰۷۶	پگوڑے
۲۔ انگریزوں کا حصہ	۷۷۷۷۷			
۳۔ نظام کا حصہ	۲۰۷۳۳۲			
۴۔ مرہٹوں کا حصہ (جو انہوں نے نہیں لیا)	۲۶۳۹۵۷			

میزان کل : ۳۰۲۲۲۲۳۵

انگریزوں نے اپنے حصہ میں سے ۲ لاکھ ۴۰ ہزار پگوڑے سالانہ وظیفہ سلطان کے مندرجہ
ذیل شہزادوں کو دینا منظور کیے :

باقی شہزادوں کو نواب حیدر حسین، غلام علی اور اہام بخش کے ساتھ بعد میں دیلور روانہ کیا گیا۔

جس وقت یہ قافلہ سرنگاپٹم سے نکلا تو نوکر چاکر سمیت اس کی مجموعی تعداد ۷۰۰۔ افراد پر مشتمل تھی۔ دلزلی نے یہ کوشش بھی کی کہ سلطان کے اہل خاندان اور ان کے ملازموں کے علاوہ خاندان بھر کے دور دراز کے تمام رشتہ داروں کو بھی سرنگاپٹم سے نکال دے۔

اس کے برعکس غداروں پر نظر ڈالی بہائے تو معلوم ہوگا کہ میر قمر الدین کو ستر ہزار پگوڑے سالانہ پورنیا کو چھ ہزار پگوڑے سالانہ جمع ایک فیصد حاصل سالانہ جو تقریباً ۱۹ ہزار پگوڑے بنتا تھا۔ اس کے علاوہ سرنگاپٹم کے جنوب میں بطور جاگیر دیا گیا جو ۱۹۶۵ء تک اس کے خاندان کے پاس رہی۔ میر غلام علی لنگڑا، علی رضا اور دوسرے میر میراں کو تین تین ہزار پگوڑے سالانہ تاحیات دیے گئے۔

ایک اور میر میراں کو ۲۴۰۰ پگوڑے سالانہ اور ایک دوسرے میر میراں کو ۵۰۰ پگوڑے سالانہ وظیفہ دیا گیا۔

یہ وظیفے اور نشین ان لوگوں کو ملک و ملت سے غدار اور ایمان فرودشی کے صلے میں عطا ہوئے۔ نیلے درجہ کے تمام غداراں فردوں کو تنخواہ کا نصف پنشن کے طور پر دے کر انہیں ملازمتوں سے ہمیشہ کے لیے سبکدوش کر دیا گیا۔

قتل ہو جانے والے غداروں کے اہل و عیال کو بھی وظیفے دیے گئے۔

سید صاحب یعنی میر معین الدین کے خاندان کو جسے لوگوں نے اسی رات بے گھر کر دیا تھا اور اس کے تمام احوال جاننا کو جلا کر رکھ کر دیا تھا، دوسو پگوڑے ماہوار تنخواہ مقرر کی گئی۔

دلزلی نے سرنگاپٹم سے صرف سلطان کے خاندان کو ہی نہیں نکالا بلکہ اس نے دہان کے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو بھی شہر بدر کرنے کی حکمت عملی اختیار کر لی۔

اس نے ایک خط جنرل ہارس کو لکھا جس میں تحریر تھا:

”میری آرزو ہے کہ آپ اپنا دفتر سرنگاپٹم سے منگور منتقل کر لیں جس سے مردست یہ فائدہ ہوگا کہ (آپ کے دفتر میں کام کرنے والے) کثیر تعداد میں مسلمان سرنگاپٹم سے دفتر کے ساتھ منگور چلے جائیں گے۔ اس کام میں جلدی کیجیے کیونکہ یہ امر میسور میں ہمارے اطمینان کے لیے

۱۔ شہزادہ فتح حیدر سلطان

۲۔ معین الدین سلطان

۳۔ عبدالخالق سلطان

۴۔ معز الدین

۵۔ محمد سبحان

۶۔ شکر اللہ

۷۔ غلام احمد

۸۔ غلام محمد

۹۔ سرور الدین

۱۰۔ محمد یاسین

۱۱۔ جامع الدین

۱۲۔ منیر الدین

سلطان کے بارہ وارثوں کے ساتھ دلزلی نے یہ انعام کیا۔ اس طرح اس بندر بانٹ میں ہر جائیداد کو صرف ۱۲ ہزار سالانہ یعنی ایک ہزار ماہوار پگوڑے کا وظیفہ مقرر کیا تاکہ چند دنوں کے بعد وہ خاقوں سے دوچار ہو جائیں۔

برخلاف اس کے ایک غدار میر قمر الدین کو اس کی غداروں کے صلے میں ستر ہزار پگوڑے سالانہ وظیفہ دینا منظور ہوا اور پورنیا کو میسور کا وزیراعظم یعنی دہان کے سپاہ و سفید کاما ملک بنا دیا گیا۔

ان میں سے چار شہزادوں کو کیپٹن میرٹ کے ساتھ ۱۲ جون ۱۷۹۹ء کو دیلور بھیجا گیا۔ ان کے نام یہ تھے:

۱۔ شہزادہ فتح حیدر

۲۔ عبدالخالق

۳۔ معز الدین

۴۔ معین الدین

دہان میجر ڈیوٹن کو ان کی میزبانی یعنی چوکیداری پر لگایا گیا۔

بہت ضروری ہے۔
 منگور دفتر منتقل ہونے سے کثیر تعداد میں مسلمانوں کو سرنگا، بٹم چھوڑ کر منگور جانا پڑا۔
 "سلطنت خداداد میسور" کے مصنف محمد منگوری نے یہ بات بالکل ٹھیک کہی ہے کہ:
 "زوال سلطنت خداداد میسور، ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم اور
 انتہائی عظیم المیہ ہے۔"

مگر اس زوال کے اسباب پر تواریخ میں مفصل طور پر نہیں لکھا گیا اور صرف یہ بات کہنے پر اکتفا
 کی گئی کہ سلطان کے امراء اور وزراء نے آخری وقت میں سلطان سے غداری کی۔ اس وجہ سے سلطنت پر
 زوال آگیا۔

تاریخ حیدری اور تاریخ مغللات حیدری میں بھی صرف یہی لکھا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک تاریخی
 حقیقت ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔
 لیکن۔

صرف یہ کہنے سے کہ امراء اور وزراء کی غداری اس زوال کی وجہ ہے، قاری کا ذہن صاف نہیں ہوتا۔
 کیونکہ تاریخ اور تاریخی ناول کا قاری یہ مفروضہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آخر امراء اور وزراء نے سلطان
 سے غداری کیوں کی؟

اس غداری کی بہت سطحی سی وجوہات بیان کی گئی ہیں اس لیے ہم ذیل میں اس کی مفصل اور مدلل
 تاریخی وجوہات بیان کرتے ہیں تاکہ تاریخ کا طالب علم پوری طرح مطمئن ہو سکے۔
 اس بیان میں ہمیں بعض ایسی باتوں کو دہرانا پڑے گا جو پہلے کہی جا چکی ہیں لیکن بغیر انہیں دہرائے
 تاریخی اضافہ نوٹس کی حاجت ادا نہیں ہوتا۔

آئیے۔ اب ہم حالات و واقعات پر آغا سے ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں:

سلطان شہید کے والد نواب حیدر علی خاں نے جس زمانہ میں سلطنت کی داغ بیل ڈالی اس وقت جنوبی
 ہند میں ان کے مندرجہ ذیل حریف موجود تھے:

اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام نواب محمد علی والا جاہ کا آتا ہے۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان (جنوبی ہند) میں انگریزوں کے قدم چلنے والا سب سے پہلا

ران بھی نواب والا جاہ تھا۔ والا جاہ انگریزوں کی تائید اور مدد سے ارکاٹ کا نواب بنا تھا۔ اس کی یہ
 زد تھی کہ کسی طرح حیدر آباد کو کن کا بھی حکمران بن جائے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے والا جاہ محمد علی نے انگریزوں اور حیدر آباد کے بعض امراء کی مدد
 بنظام حیدر آباد کے خلاف سازشیں تیار کرنا شروع کیں۔

والا جاہ ابھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو پایا تھا کہ اسے میسور میں حیدر علی خاں کے عروج نے
 اس کو دبا دیا اور وہ حیدر آباد کو چھوڑ کر میسور کو ختم کرنے کے درپے ہو گیا۔

میسور اس وقت تک صوبہ مرا کے ماتحت تھا اور نظام الملک آڈل کے زمانہ سے مرا کا صوبہ بھی
 اس میں ضم ہو چکا تھا۔

والا جاہ اپنے آپ کو پورے جنوبی ہند کا بلا شرکت غیرے مالک سمجھتا تھا۔ اس لیے جب حیدر آباد
 بمسلکت جنگ نے صوبہ مرا کی صوبیداری حیدر علی کو دیدی تو والا جاہ حیدر علی کے خلاف ہو گیا اور اس
 خلاف انگریزوں سے ساز باز کرنے لگا۔

نواب بمسلکت صوبہ مرا کا صوبیدار حیدر علی کو بنانے کے بعد زیادہ عرصہ حیدر آباد کا
 بے نذرہ مہکا اور اس کے بھائی نظام الملک دوم نے اسے معزول کر کے خود تخت پر قبضہ کر لیا اس لیے
 یہ پسند نہ تھا کہ اس کے معزول شدہ بھائی کا بنایا ہوا گورنر حیدر علی صوبہ مرا کا گورنر باقی رہے۔
 اس کے علاوہ حیدر علی خاں کی طاقت اس قدر تیزی سے بڑھ رہی تھی کہ اسے یہ خوف بھی پیدا ہو گیا تھا کہ
 بن حیدر علی تمام جنوبی و شمالی ہند پر قبضہ کر کے پورے ہندوستان کا بادشاہ بن جائے جبکہ خود
 اودم بھی شہنشاہ ہند ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

جنوبی ہند کی تیسری طاقت یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہوس ملک گیری کے تحت پورے ہندوستان پر
 قابض ہونے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس نے ارکاٹ اور حیدر آباد میں اپنی سازشوں اور مکاریوں کا جال
 دوپیا تھا۔

نواب ارکاٹ والا جاہ نے اسے کو رومندل کا علاقہ دے دیا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی باقی
 ست کا ایجنٹ بھی بنا دیا تھا۔

اس طرح کمپنی یعنی انگریز ریاست ارکاٹ کے ایک طرح حاکم بن گئے تھے اور نواب والا جاہ محض
 اسے کا حکمران رہ گیا تھا۔

انگریزوں کو بھی حیدر علی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی طاقت پسند تھی اور انہوں نے بھی یہ محسوس کر لیا تھا

کہ اگر جنوبی ہند میں حیدر علی خاں کی حکومت باقی ہی نہ تھی تو ان کے قدم ہندوستان میں نہ جم سکیں گے۔ جنوبی ہند کی جو تھیں طاقت مرہٹے تھے۔ مرہٹوں کو بھی ایک نئی اسلامی سلطنت کا جنوبی ہند میں تیزی سے اقتدار حاصل کرنا ناگوار لگا رہا تھا۔

جنوبی ہند کی آخری اور سب سے کمزور طاقت ریاست میسور کا ہندو خاندان تھا جسے حیدر علی نے معزول کر کے ایک رسمی سارا جہ بنادیا تھا۔ یہ خاندان حیدر علی سے اپنا اقتدار واپس لینے کی کوشش میں تھا۔ خصوصاً میسور کی رانیاں دن رات اسی تلک و دو میں لگی رہتی تھیں۔

میسور کے پچھلے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جس وقت حیدر علی، میسور کے سپہ سالار تھے اس وقت راجہ میسور نے اپنے ہندو سردار کھانڈے راؤ کے ذریعے مرہٹوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ حیدر علی کا خاتمہ کیا جاسکے مگر یہ سازش کامیاب نہ ہو سکی۔

اس سازش کے نتیجے میں حیدر علی کو راجہ کھانڈے راؤ اور مرہٹہ شکم کا میدان جنگ میں مقابلہ کرنا پڑا۔ حیدر علی کامیاب ہوئے اور انہوں نے راجہ کو اقتدار سے محروم کر کے اس کے لیے تین لاکھ کی جاگیر مقرر کر کے اسے مرنگا پٹم ہی میں رہنے کی اجازت دیدی۔

یہ شاید نہیں، یقیناً بہت بڑی غلطی تھی۔ کیونکہ راجہ کا خاندان اپنی سابقہ شان و شوکت کی واپسی کی سازشوں میں مشغول رہنے لگا تھا۔

نواب حیدر علی خاں کی اس غلطی نتیجے میں ان کے خلاف پہلی سازش ہوئی۔

اس سازش کے بعد مزید سازشوں کا سلسلہ اس طرح شروع ہوا کہ میسور کی رانیاں نے اپنے ایک معتمد رائے درگ سری نواس راؤ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر کے پاس بھیجا تاکہ کمپنی حیدر علی کے خلاف انہیں مدد دے۔

اس وقت کمپنی کا گورنر لارڈ پیکاٹ تھا۔ اس نے اس سفارت کا جواب مثبت انداز میں دیا اور رانیاں کو مدد کا یقین دلایا۔

لیکن تب تک انگریزوں کی یہ صرف زبانی یقین دہانی تھی۔ انہوں نے رانیاں سے وعدہ کے باوجود حیدر علی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ دراصل وہ اس وقت حیدر علی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے قابل ہی نہ تھے۔

ادھر سے مایوس ہو کر رانیاں نے ۱۷۶۹ء میں اپنا ایک ایچی مرہٹوں کے پیشوا مادھورائے کے پاس بھیجا۔ وہ پونا میں تھا۔

رانیاں نے اس سے درخواست کی کہ ہندو ہونے کے ناطے وہ میسور کو حیدر علی کے ہاتھوں سے بھات دلائے۔

یہ حیدر علی کے خلاف دوسری سازش تھی۔

اس سازش کے نتیجے میں مادھورائے پیشوا ایک بڑے مرہٹہ شکم کے ساتھ حیدر علی پر حملہ آور ہوا لیکن اس نے حیدر علی خاں کے ہاتھوں پلے درپے شکستیں کھائیں اور اسے بالآخر صلح کر کے اپنے مرکز پونا واپس جانا پڑا۔

اس کے دو سال بعد یعنی ۱۷۶۹ء میں حیدر علی کے خلاف تیسری سازش ہوئی۔

اس سازش میں محمد علی والا جاہ، نظام الملک دوم اور انگریز یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی شامل تھے۔

والا جاہ محمد علی اراکٹ کا خود مختار حکمران ہونا چاہتا تھا اور انگریز اس کے ایجنٹ تھے۔

حیدر آباد کے میر عالم اور وزیر اعظم رکن الدولہ انگریزوں کے جال میں پھنس گئے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے حیدر آباد سے ایک معاہدہ کیا۔

اس معاہدے میں مندرجہ ذیل شرائط طے ہوئیں:

۱۔ والا جاہ کو صوبہ اراکٹ کا مستقل اور آزاد حکمران تسلیم کیا گیا اور اسے نذرانہ پیش کرنے سے معاف کر دیا گیا۔

۲۔ نظاما دکن نے درپائے کرشنا کے جنوبی علاقے سے دستبرداری لکھ دی۔

۳۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو نواب والا جاہ کا نائبہ (ایجنٹ) تسلیم کر لیا گیا۔

اس معاہدے میں اور بھی بہت سی شرطیں تھیں لیکن شرط نمبر دس بہت دلچسپ تھی

اس کی مروجہ نظاما دکن نے صوبہ سرکاری دیوانی سات لاکھ روپے سالانہ پیش کش

کے عوض کمپنی کو بخش دیا۔

لیکن صوبہ سرانہ نواب حیدر علی خاں کا قبضہ تھا اس لیے اس معاہدہ کی شق نمبر ۹

کے تحت نواب حیدر علی کو غائب قرار دیا گیا۔

اس سازش کو اپنے طور پر مکمل کرنے کے بعد انگریزوں والا جاہ اور نظاما کی فوجوں نے مل کر حیدر

پر حملہ کر دیا۔

کے نام تھے۔ یہ سازش بھی پکڑ لی گئی۔

سازش اس طرح پکڑ لی گئی کہ سرنگا پٹم کے قلعہ دار کرشن راؤ کی بیوی اپنے غدار شوہر سے باغی ہو گئی اور اس نے سلطان کی والدہ کے پاس پہنچ کے یہ راز افشا کر دیا کہ اس کا شوہر، سلطان کے خلاف ایک زبردست سازش میں ملوث ہے۔

چنانچہ اس کے شوہر کرشن راؤ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔

میسور کی تیسری جنگ کے دوران یہ بات کھل کے سامنے آ گئی تھی اور سلطان کو بھی اس کا پتہ چل گیا تھا کہ اس کی شکست اس کے غدار امراء اور وزرائے دہرے سے ہوئی ہے مگر سلطان نے انہیں ختم کر کے اس مصیبت کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دینے کے بجائے انہیں معاف کر دیا اور ان سے مسیحی اعلیٰ میں قسم لے کر اور حلف اٹھوا کر پھر سازشوں کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔

اس طرح اس نے خود کو امراء اور وزرائے طرف سے ملٹن کر لیا اور پارلیمنٹ کی بناؤ رکھی تاکہ رعایا خود اپنے ہاتھ میں ملکی انتظام لے لے اور خود وہ فوج کی بحری اور بری طاقت مضبوط کرنے میں لگ گیا۔

سلطان نے ایک بار پھر اندرون اور بیرون ہند کے مسلمان حکمرانوں کو اسلام کی سر بلندی کے لیے متحد کرنے کی کوششیں شروع کر دیں لیکن حکام امراء اور وزرائے دل بدل چکے تھے اور انہوں نے بے غیری اور ملک و ملت دشمنی کا جیسے بیڑا اٹھایا تھا۔

وہ اپنی غداروں سے باز نہیں آئے اور آخر میسور کی چوتھی جنگ میں اس قدر غداری ہوئی جس کے ذکر سے روح کا پٹ اٹھی اور قلم تھرا جاتا ہے۔

سلطان نے میسور کی تیسری جنگ کے بعد جس میں سلطان اور انگریزوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا، خود کو جلد ہی سنبھال لیا اور اب اس نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا محکم ارادہ کر لیا۔ انگریز بھی سلطان کی کوششوں سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے جو ان کاروائی کے طور پر سلطان کے خلاف سازشوں کا زبردست جال پھیلایا۔

ان سازشوں کے نتیجے میں ہندو رانیوں اور سلطنت کے ہندو افسران کے علاوہ ہندو عوام بھی کھل کر سلطان کے خلاف ہو گئے۔

بیچ دیا گیا۔ ان سازشوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ انگریزوں نے عبسور ہو کر سلطان بیٹو سے سلطان کی شرائط پر معاہدہ کیا۔

میسور کی دوسری جنگ سے مرہٹوں اور نظام کو یہ امید ہوئی تھی کہ اس جنگ میں سلطان کا خاتمہ ہو جائے گا مگر ان کی امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب سلطان نے اس جنگ میں فتح حاصل کی۔

چنانچہ مرہٹوں اور نظام میں ۸۴ء میں ایک معاہدہ ہوا جس کا نام معاہدہ ایت گیر تھا۔

یہ دراصل سلطنت خداداد کے خلاف ساتویں سازش تھی۔ بہر حال نظام اور مرہٹوں کے مشترکہ لشکر نے سلطان کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا۔ یہ جنگ تین سال جاری رہی اور اس کے نتیجے میں نظام دکن اور مرہٹوں کو شکست ہوئی اور انہیں اپنے کچھ علاقوں سے ہاتھ دھوا پڑا۔ سلطنت خداداد کے خلاف ساتویں سازش میں رانی کے دیوان تمل رائے اور اس کے بھائی نارائن راؤ کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ ان دونوں نے انگریزوں سے مل کر پھر سازش کی اور انگریز جنرل سندوز نے سلطان کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ سلطان نے میڈوز کو حکیم تختستیں دے کر اس کے غرور کو توڑ دیا۔

اس کے بعد سلطان کے خلاف آٹھویں سازش ہوئی۔ اس موقع پر انگریز امریشے اور نظام تینوں کچھا ہو گئے۔ انہوں نے مل کر سلطان کے خلاف کاروائی کی۔

یہ بڑی زبردست سازش تھی اور میسور کی رانیاں اور ان کے گھر گے درپردہ اس میں شریک تھے۔

اتفاقاً عین میدان جنگ میں کرنل رید کا ایک جاسوس پکڑا گیا جس کے پاس جاس کے نام خط تھا۔ جاسوس نے یہ خط ایک ہانس کے اندر چھپا رکھا تھا جسے وہ عساکر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس میں شیشہ گری راؤ اور کرشن راؤ

پھر میسور کی وہ چوتھی جنگ ہوئی جس میں ایساں فروشی اور نمک حرام امراد و زراٹے کھل کر سلطان کے خلاف کام کیا اور سلطان ایک بہادر سپاہی کی طرح ڈٹا ہوا میدان جنگ میں شہید ہو گیا۔
سلطنت کے حصے بٹے کر کے انگریزوں اور نظام نے آپس میں تقسیم کر لیے۔

اور۔

میسور کے معزول ہندو خاندان کو ایک بار پھر میسور کی گدی بخشی گئی۔

ان حالات کے بیان کے بعد قارئین یہ معلوم کرنے کے ضرور خواہشمند ہوں گے کہ:

سلطان کے خلاف جن لوگوں نے سازش کی ان کی اصلیت کیا تھی؟ اور انہوں نے اپنی غداری کا

کیا صلہ پایا؟

یہ بات تو ہم آپ سمجھی جانتے ہیں کہ سلطان کی شہادت اور انگریزوں کی فتح ان کے ہتھیاروں یا ان کے فوجیوں کی بہادری کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ یہ فتح انہیں سلطان کے گھر کے بھیدیوں کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ ان نمک حراموں کو انگریزوں کے حکم جاسوسی نے طرح طرح کے لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ سلطان کے یہ نمک حرام، غدار اور ایمان فروش امراد اور زراٹے یہ چاہتے تھے کہ سلطنت، سلطان کے ہاتھ سے نکل جائے اور انگریز فتح یاب ہو کر انہیں مال و دولت اور اعلیٰ عہدوں سے نوازے۔

پس۔

جب اتحادیوں کی فوجیں سلطنت کی حدود میں داخل ہوئیں تو انگریزوں کے جاسوس اور سپاہی بھیس بدل کے ان غداروں کے مکانات میں آ مقیم ہوئے جو اس سازش میں شریک تھے۔

یہ تمام لوگ تقریباً مسلمان ہی تھے اور یہ تو ابھی تک مشہور ہے کہ شرچاپور (بالاپور) اور دیون ہلی والوں نے انگریزوں کو اپنے گھروں میں چھپا کر رکھا تھا جس کا عاوضہ بعض خاندانوں کو "چراغی" کے نام سے ملتا تھا۔

انگریزوں کی پیش قدمی جاری رہی۔

نمک حرام میر صادق، سلطان کو یہ یقین دلانے لگا کہ انگریزوں کی کیا مجال کہ وہ سلطنت کی حدود میں داخل ہونے کی جرأت کر سکیں۔

پھر جب سلطان خود تلوار سونت کر انگریزوں کے مقابلے پر آیا تو میر عین الدین اور پورنیانے سلطانی فوجوں کو انگریزوں کے توپ خانہ کی زد پر لگا کر ہزاروں مسلمانوں کو شہید کر دیا۔

میر قزالدین جو سلطان کے بعد خود سلطان بننے کے خواب دیکھ رہا تھا وہ انگریز فوج کے پیچھے پیچھے

اسی طرح آیا جیسے دشمن کے بار بار دوا و دستوں میں شامل ہو۔

میر قاسم نے جرنل مارکس کے دستوں کی قلعہ کے اندر تک رہنمائی کی تھی اور قلعہ کے غداروں کا یہ عالم تھا کہ ان کے حکم سے توپوں میں گولوں کے بجائے سن اور مٹی بھر کر انگریزوں پر پھینکی جاتی تھی۔

سید غفار کو انہی غداروں نے شہید کر دیا۔

فوج کو تنخواہ کے بہانے فصیل سے ہٹا لیا گیا۔

سلطان کو قلعہ سے نکال کر دروازہ بند کر دیا گیا۔

حد تو یہ ہے کہ اس مجاہد بے مثل کو آخری دقت میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ دیا گیا اور اس کی شہادت کے بعد اس کے وارثوں کو سلطنت سے محروم کر دیا گیا۔

سلطان نے ان غداروں اور ایمان فروشوں کے ساتھ کیا حسن سلوک کیا اور انہوں نے اس کا کیا صلہ دیا؟ یہ سب باتیں تاریخ ہند اور تاریخ جنوبی ہند کا حصہ بن چکی ہیں۔

ہندوستان اور خاص کر مسلمان قوم ان نمک حراموں کو نہیں بھول سکتی جنہوں نے جلد مازی، دنیا داری اور لالچ میں آ کر ایک ہوشیار، جری اور جلیل القدر مسلمان حکمران کو شہید کرنے میں انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔ ان کی غداریوں اور سیہ کاریوں کی داستان بہت طویل ہے یہاں پر ہم صرف ان کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

بنگال کے نواب سراج الدولہ کے ساتھ غداری کرنے والوں میں میر جعفر کا نام سرفہرست ہے۔ بالکل اسی طرح میسور میں جن لوگوں نے سلطان شیو کے خلاف نمک حرامی اور غداری کا مظاہرہ کیا ان میں سب سے پہلا اور بڑا نام میر صادق کا ہے۔

میر صادق پہلے صوبہ سرزمین رہتا تھا بعد میں ارکاٹ چلا گیا۔ یہ وہی ارکاٹ ہے جس کا حکمران والا جاہ محمد علی تھا۔

جب ارکاٹ کو حیدر علی خاں نے فتح کیا تو والا جاہ کے بہت سے ملازم حیدر علی کی ملازمت میں آ گئے ان میں یہ میر صادق بھی تھا۔

حیدر علی نے اسے ارکاٹ کا ناظم مقرر کر دیا تھا۔

"سلطانی میں میر صادق نے پہلے آصف کے درجہ پر ترقی پائی۔ اس کے بعد سلطان کا چیف سیکرٹری

اور وزیر بنا۔

میسور میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ میر صادق دراصل نظام دکن کے وزیر اعظم میر عاظم کا بھائی تھا یہ عجی الفل اور اہل تشیع سید تھا۔

صاحب تاریخ سلطنت خداداد محمود جنگویری کا بیان ہے کہ:

”میر فارسی لفظ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سادات عجم نے عرب اور عجم میں امتیاز رکھنے کے لیے، سید کیونکہ عربی لفظ ہے اس لیے اس کے بجائے میر کا لفظ

جو کہ فارسی ہے، اسے رواج دیا تھا۔“

میر صادق کی سلطان سے دشمنی کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ سلطان نے اسے ایک بار معزول کر دیا تھا۔ پھر بعد میں اسے بحال بھی کر دیا تھا مگر یہ میر زادہ اس توہین کا درد پر دہ انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔

اس بات میں کچھ زیادہ وزن معلوم نہیں ہوتا۔ میر صادق فطرتاً کینہ پرورد اور کینہی فطرت کا انسان معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب حیدر علی خاں نے نواب اراکٹ کو شکست دے کر اراکٹ پر قبضہ کیا تھا تو اس شخص نے حیدر علی کو خوش کرنے کے لیے کہا تھا:

”نواب بہادر۔ میں نے اتنے روز والا جاہ محمد علی کی اس قدر خدمت کی مگر اس نے

میرے ان خدمات کا کوئی صلہ نہ دیا۔ مجھے تو بیوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اب

نیک قید خانہ میں تھا اور آج آزاد ہوا ہوں۔“

میر صادق نے اپنی چالاکی اور چالوسی سے بہت جلد حیدر علی کے مزاج میں دخل حاصل کر لیا اور نواب نے اسے اراکٹ کا ناظم مقرر کر دیا۔

انگریز مشورخ مجلس اور بودنگ لکھتے ہیں:

”میر صادق نے میسور کی تیسری جنگ کے بعد رعایا پر تشدد شروع کر دیا

تھا۔ مقصد یہ تھا کہ رعیت کو سلطان کے خلاف کیا جائے۔“

میسور کی تیسری جنگ کے بعد سلطان نے ایک مجلس شوریٰ بنا کر رعایا کو حکومت کی ذمہ داری دے دی تھی۔ اس پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ کا نام ”زمرہ غم نباشد“ رکھا گیا تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ جب رعایا کو حکومت کا ذمہ دار کر دیا گیا یعنی حکومت عوام کی ہو گئی تو پھر نہ تو عوام کوئی سازش کریں گے اور نہ ترقی کے کاموں میں دخل اندازی کریں گے۔

صاحب نشان حیدری لکھتے ہیں کہ:

”میر صادق نے اپنے رسوخ سے اس پارلیمنٹ کو یکساں بنا دیا تھا اور

تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔“

اسی کتاب میں ایک اور جگہ رقم ہے:

”یہ میر زادہ (میر صادق) جب سلطان کے روبرو ہوتا تو بات بات پر

قرآن کی قسم کھاتا تھا اس لیے سلطان کو اس پر حد درجہ اعتماد تھا۔“

سیوگن میٹر کا مصنف جواکہ کرمانی لکھتا ہے:

”میر صادق، سلطان ہم کوئی بھڑپنچے نہیں دیتا تھا۔“

یہی وجہ تھی کہ سلطان کو میسور کی تیسری اور چوتھی جنگ میں مسلسل شکستیں اٹھانا پڑیں۔

محاصرے کے آخری دن یعنی ۲۴ مئی ۱۷۹۹ء کو جب سلطان کو انگریزوں کے قلعہ میں آنے کی اطلاع ملی تو سلطان سوار ہو کر ڈڈی دروازے سے باہر نکلا۔

اس وقت اس ملک حرام میر صادق نے ڈڈی دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں سلطان واپس آکر انگریزوں سے صلح نہ کر لے۔

دروازہ بند کرنے کے بعد اس ایمان فروشی نے انگریزوں کو نصیب قلعہ پر سلطان کی موجودگی کی خبر بھیجی جس کے نتیجہ میں انگریز فوجوں نے سٹ کر تین اطراف سے سلطان پر گولیوں کی بارش کر دی اور سلطان تشدد ہو گیا۔

میر صادق کی غدار کی کا پتہ اس تصویر سے بھی چلتا ہے جو دریا دولت باغ کی مغربی دیوار پر بائیں جانب لگی ہے۔

اس تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ میر صادق، گھوڑے پر سوار سلطان کے آگے ہاتھ جوڑے تسلیم کرتا ہوا، منہ پھیر کر انگریز فوج کو اشارہ کر رہا ہے کہ:

”سلطان یہی ہے۔“

اس تصویر میں دوسرے غداروں کو بھی دکھایا گیا ہے جو دائیں اور بائیں سے اشارے کرتے ہوئے بتلا رہے ہیں کہ:

”سلطان یہی ہے۔“

یہ تصویر کرنل ولزلی کے حکم سے کھینچی گئی تھی۔

تاریخ نشان حیدری میں لکھا ہے:

کچھ بھی ہو مگر اس کی قبر عبرت کا ایک نمونہ ہے اور اس پر ایسی دیرانی برستی ہے کہ دیکھنے والے پر خوف اور دہشت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔
علامہ اقبال نے جاوید نامہ "میں عالم خیال میں دوزخ کے اس طبقہ کی تصویر کھینچی ہے جہاں ارواحِ ذلیلہ رکھی جاتی ہیں۔ دہلی ہنگال کے غدار میر جعفر اور میسور کے غدار میر صادق کو اس طرح رکھے ہوئے دکھایا گیا ہے:

اندرونِ او دو طاغوتِ کمن
روحِ قویٰ کشتہ از بسِ وطن
جعفر از ہنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

ترجمہ:

یہاں (دوزخ میں) دو ایسے پُرانے شیطانوں کی روحیں موجود ہیں جنہوں نے قوم اور وطن کی روحوں کو قتل کر دیا تھا۔
ان میں ایک روح ہنگال کے مردِ مجاہد اور شہید آزادی سراج الدولہ کے قاتل میر جعفر کی ہے اور دوسری روح شیر و کھن سلطانی پٹنہ اور سلطنتِ خداؤں کے قاتل میر صادق کی ہے۔

علامہ اقبال کی اس نظم ہی میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ میر جعفر اور میر صادق دونوں رچکے ہیں لیکن ان کی روحیں زندہ ہیں اور قوموں کو غارت کرنے کے لیے آج بھی جگہ جگہ میر جعفر اور میر صادق موجود ہیں۔

اس فریاد کو سن کے دوزخ بھی ان شیطانوں کی ارجح کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے
اس پر یہ غدار دہائی دیتے اور فریاد کرتے ہیں تو دوزخ جواب دیتی ہے کہ:
"یہ دنیا بے ابتدا اور بے انتہا ہے اور یہاں غدار کسے لیے کٹی جگہ نہیں اور نہ اس کا کوئی مولا ہے۔"

"نہک حرام میر صادق نے سلطان کو مورچہ کی طرف جلتے ہوئے دیکھ کر ڈوڑی دروازہ کو جو سلطان کی واپسی کا راستہ تھا بند کر دیا اور خود گنہگار کا راستہ لیا (نہک قلعہ کے باہر جا کر اپنی کونٹھی میں رہے) لیکن جب وہ قلعہ کے مشرقی دروازے پر پہنچا تو سلطان کے ایک جانشین سپاہی نے جو اُسی کی نہک حرامی سے واقف ہو چکا تھا، اسے گھوڑے سے کھینچ کے توار کے ایک ہی وار سے اسی کا کام تمام کر دیا۔ اس کے چار دن بعد اس کی بے گور و کفن لاش اسی جگہ گاڑ دی گئی۔
آج بھی لوگ آتے جلتے اسی کی قبر پر تھکتے، پیشاب کرتے اور لعنت سے یاد کرتے ہیں۔"

جس سپاہی نے نہک حرام میر صادق کو قتل کیا تھا اسی کا نام احمد خاں تھا۔ وہ کٹر پتہ کا باشندہ تھا۔ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ میر صادق کی لاش اسی جگہ دفن کر دی گئی جہاں وہ قتل ہوا تھا اور آج بھی لوگ قلعہ کے مشرقی دروازے کے قریب مٹی کے ایک ڈھیر پر پتھر اور ٹھنڈا مار تے اور پیشاب کرتے ہیں۔ محمود بنگلوری کا خیال ہے کہ:

"جس طرح میر معین الدین کی قبر کو یہ کہہ کہ لوگوں کی لعنت اور لعنہ سے محفوظ کر لیا گیا کہ وہ ایک بڑے پیر کی قبر ہے اسی طرح میر صادق کی اصل قبر کو چھپایا گیا ہو اور یہ بات مشہور کر دی گئی ہو کہ وہ غدار جس جگہ قتل ہوا تھا، اسی جگہ دفن ہے۔ لیکن اس بارے میں کوئی مصدقہ روایت نہیں ملتی۔ یہ مفروضہ ہے کہ لوگ میر صادق سے اس قدر برا فرودختہ تھے کہ اس کی قبر بھی بنانے دیتے تھے۔"

ایک تحقیق یہ بھی ہے کہ:

"میر صادق کی لاش کو انگریزوں نے اٹھو اکر قلعہ کے شمال مشرق میں برج سے تھوڑے فاصلے پر دفن کر دیا تھا مگر انگریزوں کو یہ علم نہ تھا کہ مسلمانوں کے مرنے کے بعد شمالاً جنوباً دفن ہوتے ہیں۔ اس لیے ہوا یہ کہ انگریزوں نے اسے شرقاً غرباً دفن کر دیا اور اس کی یہ قبر آج تک اسی طرح (شرقاً غروباً) موجود ہے۔"

سلطان کے جن بڑے بڑے امرا اور وزرا نے سلطان اور ملک و ملت سے غداری کی میر غلام علی بنگو

ان میں دوسرے نمبر پر ہے۔

بہس وقت نواب حیدر علی خاں نے ارکاٹ فتح کیا تھا تو میرنگڑ ابھی امیر صادق اور دوسرے ملازمین مرکار ارکاٹ کے ساتھ، خوشامد کر کے حیدر علی کی ملازمت میں آگیا تھا اور یہاں آتے ہی میر صادق کا دست باز دین گیا تھا۔

سلطان کے دربار میں میر صاحبان کی جو ایک فوج کی فوج نظر آتی ہے، یہ سب کے سب نواب بہادر کے نمک خوار تھے جو ارکاٹ کی فتح کے بعد سلطنت حیدر علی کی خدمت میں آگئے تھے۔

میر غلام علی لنگڑ ابھی عجی سید زادہ تھا اور اس کا تعلق شیعہ فرقے سے تھا۔ سلطان نے باپ کے انتقال پر ان کے تمام امراء اور وزراء کو اپنی ملازمت میں قبول کر لیا تھا۔ سلطان نے اس لنگڑے کو افواج کا ناظم اعلیٰ (آئی جی) بنادیا تھا۔ بعد میں یہ میریم (لارڈ آف دی انڈیز میزٹری) اور وزیر بنا۔

میرنگڑ ابطا تیز طرار، چالاک اور زود فہم تھا۔ سلطان نے دربار ترکی اور دیگر شاہوں و بادشاہوں کے درباروں میں جو سفارتیں بھی بھیجیں تھیں ان میں شامل رہا تھا۔

یہ شخص حاضر جراتی میں اپنا نانی نہ رکھتا تھا۔

ایک مرتبہ جب یہ قسطنطنیہ (ترکی) کی ایک سڑک پر جا رہا تھا تو اچانک بارش آگئی۔ یہ پناہ لینے کے لیے تیز تیز بھاگنے لگا۔

اس کے ساتھ جو ترکی افسر تھا، اس نے کہا:

”بارش تو خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ تم اسی سے کیوں بھاگ رہے ہو؟“

میرنگڑ نے فوراً جواب دیا:

”بے شک بارش رحمت الہی ہے مگر میں اس وجہ سے بھاگ رہا ہوں کہ میں بارش میرے قدحوں تلے نہ آجائے اور یہ بات اس کی بے حرمتی کا باعث ہوگی۔“

اسی میرنگڑ کے بارے میں یہ قصہ بھی مشہور ہے کہ جب وہ قسطنطنیہ کے بعد مصر سے واپس آ رہا تھا تو اس کے پاس بہت سے قیمتی ثنائت اور مال و دولت تھی جو اسے ترکی اور مصر میں نذر کی گئی تھی۔

شریف مکہ جو انتہائی لالچی آدمی تھا، اتنا مال و دولت دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے میرنگڑ سے کہا:

”میر غلام علی، تمہاری سفارت کا اثنا بڑا خزانہ لے کر سفر کرنا مناسب نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم یہ خزانہ فی الحال خرمن دیدو۔ پھر بوقت ضرورت یہ قرض تمہیں بھجوا دیا جائے گا۔“

میرنگڑ، شریف مکہ کی نیت بھانپ گیا۔

اس نے اسے کوئی جواب نہ دیا بلکہ عرب میں اپنے قیام کو طویل کر دیا تاکہ وہ شریف مکہ کو یہ اطمینان دلا سکے کہ اسے شریف مکہ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

دوسری طرف اس نے سلطان کی طرف سے ایک جعلی خط خود اپنے نام لکھ کر چند آدمیوں کو دباؤں سے باہر بھجوا دیا۔

یہ لوگ وہ جعلی خط جو میرنگڑ کے نام تھا بیکر مکہ پہنچے۔ مکہ میں باہر سے آنے والوں کی سخت تلاشی لی جاتی تھی۔ چنانچہ وہ جعلی خط شریف مکہ کے آدمیوں نے برآمد کر کے شریف مکہ کو پہنچا دیا۔ شریف مکہ نے وہ خط کھول کر پڑھا۔ اس میں سلطان نے میرنگڑ کو لکھا تھا:

”میر غلام علی کو معلوم ہو کہ خدا کے فضل و کرم سے پورا ہندوستان ہم نے

فتح کر لیا ہے۔ اب ہم بہت جلد ایک زبردست فوج کے ساتھ ساحل عرب پر

حملہ کرنے والے ہیں تاکہ مقامات مقدسہ پر بھی سلطنت حیدر علی کا قبضہ رہے۔“

یہ خط پڑھ کر شریف مکہ کے ہوش اڑ گئے اور اس کے لڑکے اور اداوے ٹھٹھے پڑ گئے۔ اس نے

میرنگڑ کے کی بہت زیادہ خدمت کرنا شروع کر دی۔ مبادا وہ سلطان کے حملہ کی صورت میں کہیں اس کی شکایت سلطان سے نہ کر دے۔

میر غلام علی کے لنگڑا ہونے کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ بے انتہا مغرور اور خود پرست تھا۔ کسی

کے سامنے سر جھکانا وہ اپنی قوم میں سمجھتا تھا اس لیے اس نے اپنی انائی تکیں کے لیے کسی حکم سے کوئی دوا

لے کر استعمال کی جس سے اس کے ایک پیر میں ننگ پیدا ہو گیا۔

چنانچہ جب کبھی اسے دربار میں جانا ہوتا تو وہ چاندی کی ایک چوکی پر بیٹھ کے جاتا تھا اور انگریزوں

میں وہ ”غلام آف دی سلور چیئر“ (نقرتی چوکی کا غلام) کے نام سے مشہور تھا۔

نواب حیدر علی کے زمانے میں طرز معاشرت اور دربار داری کے اصول کچھ اور تھے۔ ان کے دربار میں

تعظیم و تکریم لازمی خیال کی جاتی تھی اور یہی وجہ میر غلام علی کے پریشک کہ لینے کی تھی کہ دربار میں تعظیم و

لہنے سے اسے معذور سمجھا جائے۔

سلطان کے برسرِ اقتدار آنے تک میر غلام علی یا تو واقعی لنگڑا ہو گیا تھا یا لوگوں نے اسے ہمیشہ کا

لنگڑا تسلیم کر لیا تھا۔

سلطان نے لارڈ کارنوالس سے معاہدے کی شرائط طے کرنے کے لیے میرنگڑے ہی کو بھیجا تھا۔ جب

یہ انگریزی کیپ میں پہنچا تو اس طرح کہ وہ چاندی کی چوکی پر بیٹھا تھا اور چوکی اٹھائے دو آدمی چل رہے تھے۔ وہاں لارڈ کارنوالس کے علاوہ مرہٹہ سردار اور میر نظام علی خاں بھی بیٹھے تھے۔

غلام علی خاں چوکی سے اترے اور فرشتے پر پاؤں پھیلانے کے بیٹھ گیا۔ ہلاند یہ تھا کہ وہ لنگڑا ہے۔

غلام علی لنگڑا ہے کہ قسطنطنیہ سے واپسی پر اس کے پاس اتنا بڑا خزانہ اور قیمتی تحائف جمع ہو گئے تھے کہ شریف کم کی نیت بدل گئی تھی۔ یہ سب تمام تحائف اور خزانہ کے ساتھ مرزا کاظم پہنچا تو اس نے لاکھوں کے وہ قیمتی تحائف گھر رکھ لیے اور سلطان کو پیش نہ کیے۔

جاننے والوں نے یہ خبر سلطان تک پہنچا دی اور یہاں تک بخبری ہوئی کہ میر لنگڑا نے چوری کیا ہو اسامان اپنے گھر کے کس کمرے میں رکھا ہے؟ پس۔

سلطان نے کووالی شہر کو میر لنگڑے کے محل پر چھاپہ مارنے کا حکم دیا۔ بخبری بالکل صحیح ہوئی تھی۔ تمام تحائف برآمد کر لیے گئے۔

سلطان نے بڑے اسفوس کے ساتھ اسے نظر بند کر دیا۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ اپنے قسطنطنیہ میں قیام کے دوران میر لنگڑے نے وہاں موجود انگریز سفیر سے رشوت لے کر اسے سلطان کے اس خط کے مندرجات سے آگاہ کر دیا تھا جو سلطان نے ترکی کے خلیفہ کو لکھا تھا۔

اب یہ سلطان کی کمزوری یا عفو و درگزر کی انتہا کہ سلطان نے اسے چند ہی دنوں بعد معافی دیکر رہا کر دیا۔ یہ نہیں بلکہ اس کے عہد سے میں اضافہ کر کے اسے وزیر بحر بنا دیا۔ سلطان کو اس پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ ہر کام میں اس سے مشورہ لیا کرتا تھا۔

ان تمام نوازشات کے باوجود یہ ایسا نمک حرام تھا کہ یہ سلطان کا شدید مخالف ہو گیا اور جب سلطان کی شہادت کے بعد سلطنت قبضہ ہونے لگی اور سلطان کے کسی شہزادے کو تخت نشین کرنے پر غور شروع ہوا تو یہی غدار خضاب جس نے کشن کے سامنے کہا تھا کہ:

افعی کشتن و بچہ اش را نگہداشتن کار خرد مندان نیست

(سامنے کو مارنا اور اس کے بچہ کو بانا کوئی عقلمندی کی بات نہیں)

مشہور ہے کہ میر لنگڑے کی اسی رائے کے پیش نظر کشن نے سلطان کے شہزادوں کو نہ صرف سلطنت

بھرم کر دیا بلکہ پورے شاہی خاندان کو مع جملہ متعلقین اور غلام اور لونڈیوں کے مرزا کاظم بدر کر کے مٹے بیچ دیا۔

اپنے دشمن آقا کو سامنے سے تشبیہ دینا اور اس کے بچوں کو سلطنت سے محروم کرنا میر غلام علی لنگڑے جیسا نمک حرام اور ایمان فروش ہی کر سکتا تھا۔ بقول محمود بنگلوری:

”میر غلام علی لنگڑے کو دراصل یہ خطرہ تھا کہ اگر سلطان کے کسی شہزادے کو حکومت مل گئی تو وہ اس سے ضرور انتقام لے گا۔ اس لیے میر لنگڑا اور اس فتنیل کے تمام لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ حکومت شہزادوں کو نہ دی جائے اور وہ اس میں کامیاب ہوئے۔“

میر غلام علی کی قبر اس کے بولے ہوئے قبرے میں ہے۔ گنبد میں دو قبریں ہیں۔ ایک بڑی اور بری چھوٹی۔ بڑی قبر میر لنگڑے کی ہے۔

لوگوں کے ڈر کی وجہ سے بڑی قبر ایک زمانہ تک زمانہ طرز کی بنی رہی۔ پھر بعد میں تبدیل دی گئی تھی۔

کتب مرزا کاظم کے مصنف پارسنس نے میر لنگڑے کا مقبرہ دیکھا تھا اور اس نے ۱۹۳۱ء میں یہ باتھا کہ:

”گنبد میں دو زمانہ قبریں ہیں۔“

ن جب وہ ۱۹۳۹ء میں وہاں دوبارہ گیا تو بڑی قبر مردانہ طرز کی بنا دی گئی تھی۔ پنا پنچہ اس نے واپس لکھا کہ:

”اب وہ قبر مردانہ طرز پر بن گئی ہے جو دس سال پہلے زمانہ طرز کی تھی۔“

میر غلام علی لنگڑا، ذوال مرزا کاظم کے بعد دس سال تک زندہ رہا۔ کرنل کرک پیٹرک نے اسے کہہ:

”میں نے میر غلام علی لنگڑے کو ۱۸۰۹ء میں مرزا کاظم میں دیکھا تھا۔ اس کے عزیز و اقارب اب بھی دیوار اور حیدر آباد میں موجود ہیں۔“

انگریز اس شخص کی چالاکی اور ہدایتی سے اس قدر مخالف تھے کہ انہوں نے ذوال سلطنت کے بعد کوئی سرکاری عہدہ نہیں دیا۔ اسے صرف تین ہزار طلائی پکڑا سالانہ دے کر کاروبار سلطنت سے

لڑکی نے کنوئیں میں گر کر خودکشی کر لی۔

سلطنتِ خدا و کاتبِ ابرہہ اعداد اور ایمانِ فروش بدر الزمان خاں نائٹھ اور اس کے خاندان کو بیان کیا گیا ہے۔

یہ وہ داغ تھا جس نے اہلِ ناطقہ کو سلطان کا دشمن بنادیا۔

اس عداوت اور دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے میسور کی تیسری جنگ میں ہمدی علی نٹھ نے عید گاہ کا

درجہ غداری کوہ کے انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا۔

اسی طرح میسور کی چوٹی پر جب سلطان نے چل ورگ جلنے کا فیصلہ کیا تو محمد مراد ناٹھ کے

یہی بدکردارانِ مائطہ نے باقاعدہ سازش کے تحت سلطان کو وہاں جانے سے روک دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان مسلمان سلطانیت خداداد کے تابع گزار نہ ہو سکا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل نواز نے سلطان کی مکمل ترقی کا مفہوم بدل دیا ہے۔

مگر یہ فیصلہ بغیر کسی مزاحمت کے طرہ آئے اور سلطان کی دایسی کا راستہ بن سو گاتہ لگا کر اسے نکلیں

ملیں اور انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ سب اہل نواز کی غداری سے ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے ان غداروں

ران کے ساتھیوں کو اقتل کرنا شروع کر دیا۔

سلطان کے وفاداروں نے چار رستے واروں اور محمد رسول کو قتل کر دیا۔ علی رضا، علی ناظم

بہادر اور بہاؤ والے ہیں چپ سے اور وفاداروں نے اٹھ نہ آ سقے، اس وجہ سے بیچ کئے مگر میر صادق
اشتر خاں قتل کر دیے گئے۔

عام طور پر سلطان کی شکست اور شہادت کی ذمہ داری مرہا و قریب و الحاکم سے اور بعض اوقات سے

یہ عذر سب سے پہلے قتل ہوا اور نہ اس کی پوری ذمہ داری اس کی مجلس وزارت رسا حاتی جس میں غلام علی

طہ بدر الزمان نانٹھ اور علی رضا اور اس کے رشتہ دار تھے۔ گویا ان سب نے مل کر سلطان کو تخت سے

کے کرنے کی سازشیں کیں مگر وہ تو سلطان کی اولوالعربی اور حوصلہ مندی تھی کہ ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ چنانچہ

وہ نے یہی فیصلہ کیا کہ سلطان سے صورت شنید ہو جائے تو قصہ ہی ختم ہو جائے۔ ان کا خیال تھا کہ سلطان

انگریزوں نے نوابوں کی غداری کے صلہ میں انہیں بخشش اور جاگہ عطا کر کے ان کا سواغہ بن دیا۔

وہا۔

بدر الزماں خاں کو تین ہزار پگوڈے مالانہ کی پیشکش ملی جس کے لیے اس نے ایندوین اور ایلان بجاتھا

[illegible]

زاد سلطنت کے بعد وہ ایک عرصہ تک زندہ رہا۔
وہ کس نے اپنی تاریخ مرتب کرنے میں بدر الزماں نائٹ سے مدد لی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی
اس نے ایک جگہ لکھا تھا کہ:

بدر الزماں نائٹ کی باتوں میں سچائی نہیں ہوتی تھی۔

بدر الزماں کی سلطان سے عداوت کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ سلطنت کے
وزیر اعظم میر صادق نے سلطان سے بدر الزماں کی شکایت کی تھی اور سلطان نے بدر الزماں کو دو ہفتے
کے لیے نظر بند کر دیا تھا۔ اس وجہ سے وہ سلطان کا دشمن ہو گیا تھا۔

بالفرض اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آیا بھی تھا اور بدر الزماں کو سلطان سے پرغاش ہو گئی تھی تو اسے
سلطان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا چاہیے تھی نہ کہ اس نے سلطنتِ خداداد ہی کو اپنی اس دشمنی کی
بھینٹ چڑھا دیا۔

سلطنتِ خداداد میسور اور سلطانِ پٹو کے ساتھ غداری کرنے والے ملک حراموں میں میر صادق
میر غلام علی سنگھ اور بدر الزماں نائٹ کے بعد چوتھے نمبر پر دو نام آتے ہیں:

۱۔ میر معین الدین

۲۔ میر قمر الدین

تمام انگریز تواریخ میں میر معین الدین کا نام "سید صاحب" لکھا گیا ہے اور یہ ایمان فروش اور
نام سے مشہور تھا۔

سید صاحب جس نے ملک و قوم اور سلطان سے غداری کر کے "سیدوں" کا نام بھی ڈبو دیا، یہ
پہلے کر نالک کی فوج میں ایک معمولی عہدے پر تھا۔ پھر جب نواب حیدر علی نے کرناٹک پر قبضہ کیا تو یہ نواب
حیدر علی کی ملازمت میں آ گیا۔

تو رخصت نہیں لکھتا ہے:

نواب حیدر علی خاں کے زمانے میں میر معین الدین نے حیدر علی سے
غداری کی تھی اور گرم کٹہہ کی جاگیر اپنے نام لکھوا لی تھی۔ گرم کٹہہ کی جاگیر
در اصل حیدر علی خاں کی جاگیر تھی جو نواب بسالت جنگ (دکن) نے اس وقت

حیدر علی کو دی تھی جب انہیں صوبہ سرکا صوبیدار بنایا گیا تھا۔
لیکن وہ کس نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ:

مگر گرم کٹہہ کی جاگیر سلطنتِ مغلیہ کے زمانہ سے میر علی رضا کے خاندان میں
چلی آرہی تھی۔ میر علی رضا کی ہمیشہ سے حیدر علی خاں نے شادی کی تھی جب
میر علی رضا کی نمود بندر میں وفات ہو گئی تو یہ جاگیر سلطنتِ خداداد میں
شامل کر لی گئی۔

اصل بات یہ تھی کہ گرم کٹہہ ایک نہایت مضبوط قلعہ تھا۔ جنگی نقطہ نظر اور اپنے علی وقوع کے لحاظ سے
یہ قلعہ میسور اور پائیں گھاٹ کی کنبی سمجھا جاتا تھا۔ گویا جس کے پاس گرم کٹہہ کا قلعہ ہو وہ میسور اور پائیں گھاٹ
پر دباؤ ڈال سکتا تھا۔

میر معین الدین اس قلعہ کی اہمیت سے واقف تھا اور وہ اپنی ایک الگ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔
اسی لیے اس نے مرہٹوں سے مارش کر کے گرم کٹہہ کی جاگیر اپنے نام لکھوا لی تھی۔
میسور کی جو تھی جنگ میں بھی میر معین الدین نے اسی جاگیر کے حصول کے لیے سلطان سے غداری
کی تھی۔

حیدر علی خاں نے میر معین الدین کو غداری کے باوجود عفا کر کے اس کے عہدہ پر بحال کر دیا تھا
پھر میسور کی تیسری جنگ میں میر معین الدین نے بڑی وفاداری اور بہادری دکھائی۔ اسی وفاداری کی بنا پر
سلطان نے اسے سپہ سالار بنا دیا۔ اور ۱۷۹۵ء میں سلطان نے اس کی دختر خدیجہ زبانی بیگم سے عقد کیا تھا
اس بیگم سے ۱۷۹۷ء میں ایک بچہ پیدا ہوا مگر چند ہی دن بعد زچہ و بچہ دونوں انتقال کر گئے۔

میسور کی تیسری جنگ میں انگریزوں کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سلطان کے وفادار کون ہیں اور غدار
کون ہیں۔ چنانچہ میسور کی چوتھی جنگ کے موقع پر انگریزوں نے سلطان کے تمام وفاداروں پر ڈور سے
ڈانٹ شروع کر دیے تھے۔

انگریزوں کو یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ میر معین الدین کے علاوہ میر قمر الدین بھی گرم کٹہہ کی جاگیر رکھتا
خواہش مند ہے۔ پس۔ مکار ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان دونوں کو الگ الگ اس بات کا یقین دلایا کہ
سلطنتِ خداداد کے خاتمہ پر گرم کٹہہ اسے دیا جائے گا۔

یہ مشہور کردیا گیا کہ یہ کسی پیر کی قبر ہے۔
اس طرح یہ غدار گرم کٹہہ کی جاگیر حاصل کرنے کی خواہش دل ہی میں بیٹے ہوئے تیر خاک
پہنچ گیا۔

میر معین الدین کی قبر کے تعویذ کو سبز رنگ سے رنگا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے یہ قبر سید کی ہے
قبر کے چاروں طرف ایک مختصر سی چار دیواری اور سائبان ہے۔ سائبان کی کمارت معمول اور شکستہ ہے۔
یہ قبر اسی غدار کی ہونے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ یہ اسی جگہ واقع ہے جہاں اس کی
کوٹھی تھی۔ مہجر آئن کی تحریر بھی اس کا ثبوت پیش کرتی ہے۔
میر معین الدین اور میر قمر الدین، دونوں غدار آپس میں رشتہ دار بھی تھے۔



اس فریب کے تحت ہی دونوں "میر" سلطان کے خلاف میسور کی چوتھی جنگ میں سرگرم عمل
نظر آئے ہیں۔

میر قمر الدین نے غدار کی صمد میں گرم کٹہہ کی جاگیر حاصل کرنی مگر میر معین الدین اپنے آقاؤں ہی
کے ہاتھوں گتے کی موت مارا گیا۔

میر معین الدین نے مالوہلی (گلشن آباد) کے میدان میں سلطانی فوج کو انگریزی توپ خانے کی زد پر
لگا کر سلطان کے ساتھ غدار کی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے بعد پھر جب ایک اور غدار میر قاسم نے جرنل ہارس
کی فوج کو جنوب مغربی گوشہ میں ایک گھنے باغ کی آڑ میں گھرا یا تھا تو اس وقت اس گوشہ کی مدافعت میر
معین الدین کے سپرد ہوئی تھی۔

غدار میر قاسم قلعہ کے اس گوشہ کی کمزوری سے واقف تھا کیونکہ ایک زمانے میں وہ قلعہ دار
رہ چکا تھا۔

میر معین الدین نے اس گوشہ قلعہ کی مدافعت کی ہی نہیں، اس نے یہاں سے سلطان کے دغا دار سپہ سالار
سید غفار کو ہٹایا۔ پھر فوج کو تنخواہ لینے کے بہانے فیصل سے نیچے بھیج دیا اور اپنی کینہہ طبع کا ثبوت دیتے
ہوئے جھنڈیوں کے ذریعے انگریزوں کو میدان صاف ہونے کی اطلاع دیدی اور انگریز فوج بغیر کسی مزاحمت
کے قلعہ میں داخل ہو گئی۔

میر معین الدین نے ہی دغا دار ملک و ملت سپہ دار سید غفار کے سر پر سبز چھتری لگا کر انگریزوں
کو اس جانبازی نشانہ ہی کی صفی جس پر انگریزوں نے اس جو ائمہ کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔

قلعہ پر انگریزوں کے قبضہ کے دوران افغان فوجی کے عالم میں میر معین الدین انگریزوں ہی کے
ہاتھوں سخت زخمی ہوا۔ مہجر ڈلاس اور مہجر آئن نے اسے پانکی میں ڈلو کر گھر بھجوانے کی کوشش کی مگر
وہ وہیں دم توڑ گیا۔

دوسرے دن مہجر آئن اس کے بھائی کے ہمراہ اس کے گھر گیا۔ اس کی حویلی بڑی ناگفتہ بہ حالت میں
تھی کیونکہ اسے لوٹ کر بر باد کر دیا گیا تھا۔ لوٹنے والوں نے غور توں اور بچوں سے بھی بڑی بدسلوکی
کا مظاہرہ کیا تھا۔

میر معین الدین کی لاشیں ایک ہمسائے کے گھر پرٹی تھی اور اس کے پاس میر معین الدین کا آٹھ سالہ
بچہ بیٹھا رو رہا تھا۔

لاش کو دلوں سے اٹھوا کر اکاٹ باغ کے احاطہ میں دفن کیا گیا اور قبر کو توہین سے بچانے کے لیے

یہاں تک کہ یہ دونوں آدمی یعنی میر قمر الدین اور میر معین الدین آپس میں رشتہ دار بھی تھے؟
یہ چیز ہمیں معیوب معلوم ہوتی ہے لیکن انگریزوں سے اسے ایک سیاسی چال قرار دیتی ہے۔ انگریزوں
نے مختلف اوقات میں اس قسم کی حرکات کی ہیں۔ موجودہ دور میں فلسطین کے معاملہ میں بھی انگریزوں نے
اسی پالیسی نہایت کیننگی کا مظاہرہ کیا ہے کہ ایک طرف انہوں نے فلسطین عربوں کو دینے کا وعدہ کیا تھا اور دوسری
طرف یہودیوں سے بھی یہی وعدہ کر رکھا تھا۔ پھر وقت آنے پر فلسطین یہودیوں کو دے دیا گیا اور عرب
منہ دیکھتے رہ گئے۔

یہاں گرم کٹہہ کی جاگیر بھی ایک دقت میں انگریزوں نے میر معین الدین اور میر قمر الدین کو دینے کا
وعدہ بلکہ تحریری معاہدہ کیا مگر معین الدین چونکہ ۱۹۲۲ء میں کو مارا گیا اس لیے گرم کٹہہ کی جاگیر قمر الدین
کو ملی گئی۔

قمر الدین نے فتح زکندہ کے موقع پر بھی سلطان سے غدار کی کئی اور حیدر آباد سے سلطان کے خلاف
خود کتابت کرتا رہا تھا جس کی رپورٹ سپر سالار برلمان الدین نے سلطان کو بھیجی تھی اور قمر الدین کو چند دن کے
لیے نظر بند بھی کر دیا گیا تھا مگر پھر بحال کر کے معافی دیدی گئی تھی۔
کرنل وکس نے اپنی تاریخ میں میر قمر الدین کا ایک واقعہ اور بھی لکھا ہے جس سے اس کی غدار، مکاری
اور ایمان فروشی ظاہر ہوتی ہے۔
ایک دوسرے واقعے کے تذکرے سے میر قمر الدین کی تخت و تاج سے بے پناہ محبت اور چاہت کا
اظہار ہوتا ہے۔
کرنل وکس لکھتا ہے:

”جس وقت سلطان قلعہ ادھونی پر حملہ میں مصروف تھا تو ارباٹ کے مفتی
سراج الدین محمود خاں کا انتقال ہو گیا۔ مفتی صاحب سے لوگوں کو بے حد
عقیدت تھی اس لیے ان کا جنازہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منگایا گیا۔
روانہ کیا گیا مگر نہ معلوم یہ افواہ کس طرح اڑی کہ خود سلطان کا انتقال ہو گیا
ہے اور اس کا جنازہ بڑی شان سے منگایا گیا ہے۔“

یہ افواہ ایسی مشہور ہوئی کہ سرٹریکٹر سن جو حکومت میں عارضی طور پر
گورنر تھا اس نے مدراس کے گورنر کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ وہ سلطان
کے جانشین کے پاس جا کر باد دینے کے لیے کسی خاص آدمی کو دربار میں

میر میرا خاندان کا ایک اور بڑا نمک حرام میر قمر الدین تھا۔
یہ میر علی رضا کی ایک حرم کے بطن سے تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ سلطان کا سوتیلا
میر بھی تھا۔
قارئین جانئے ہیں کہ سلطان کے والد حیدر علی خاں نے میر علی رضا کی بہن سے شادی کی تھی۔ یوں میر
علی رضا سلطان کا ماموں تھا۔
میر قمر الدین کی نظر شروع ہی سے گرم کٹہہ پر تھی بلکہ اس ایمان فروش کے حوصلے اس قدر بڑھے ہوئے
تھے کہ وہ مملکت خدا داد کا حکمران بننا چاہتا تھا۔

اس سلسلے میں میر قمر الدین نے کوششیں بھی شروع کی تھیں۔ اس نے سلطان کی ایک بیٹی کا رشتہ بھی
کسی کے ذریعے مانگا تھا مگر سلطان نے انکار کر دیا تھا۔

تخت و تاج کی ہوس میں میر قمر الدین نے میر معین الدین کی طرح عیسو کی جو تھی یعنی آخری جنگ میں
سلطان سے غدار کی اور انگریزوں سے مل گیا۔

میر قمر الدین نے بھی گرم کٹہہ کی جاگیر اپنے نام لکھوائی تھی جبکہ یہ جاگیر انگریزوں نے میر معین الدین
کو بھی دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس سے انگریزوں کی بددیانتی، مکاری، دغا بازی، پالیسی اور بیاری پوری
طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔

یہاں پر یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ انگریزوں نے ایک ہی جاگیر دو آدمیوں کو دینے کا وعدہ کس طرح کر

خلاف ہو گیا اور انتقام کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔
میر قاسم جب وطن سے واپس آیا تو سلطان نے اسے مٹھن کرنے کے لیے سرنگا پٹم کا قلعہ بنا دیا۔
چند برسوں کے بعد میر قاسم نے پھر وطن جانے کی اجازت مانگی اور یہ درخواست بھی کی کہ اب اسے ملازمت
سے سبکدوش کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے آخری ایام اپنے وطن میں گزارے۔
یہ ۱۷۹۸ء کے آخری ایام تھے۔

نیکسول سلطان نے میر قاسم کو نہ صرف جانے کی اجازت دی بلکہ اس کا اعزاز بڑھانے کے لیے
ایک دن دربار عام میں میر قاسم کو مخاطب کر کے کہا:
”تم نے اپنے سلطان کی وفاداری سے خدمت کی ہے۔ اس لیے تمہارا سلطان تمہیں اجازت دیتا ہے
کہ تم اپنے وطن جا کر آرام سے زندگی کے بقیہ دن گزارو۔
جو لوگ وفاداری سے سلطان اور سلطنت کی خدمت کرتے ہیں ان کی خدمت کے اعتراف کے طور پر
ان کی قدر کو فی جلیبے اس لیے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ سلطان کے دل میں تمہاری قدر و منزلت ہے تاکہ کہیں
یہ نہ کہا جائے کہ سلطان نے تمہاری قدر نہیں کی تھی۔“
اس خطاب کے بعد سلطان نے میر قاسم کو خود اپنے دستِ خاص سے مندرجہ ذیل انعامات سے
نوازا:

دو عدد زرین شالیں
ایک دوپٹہ
ایک مرصع زیور
ایک گھوڑا خاص شاہی اصطبل کا
ایک مرصع تلوار
ایک ڈھال!

اس کے بعد سلطان نے فرمایا:

”تمہارا سلطان قدردانی بھی کرتا ہے اور انعام بھی دیتا ہے۔“

میر قاسم ادب بجالایا اور خوش خوش رخصت ہوا۔

ایک بیان یہ بھی ہے کہ میر قاسم کو پورینا اور میر صادق نے اپنے منصوبے کے تحت سرنگا پٹم سے
رخصت کرا دیا تھا کیونکہ یہ وہی وقت تھا کہ جب انگریزوں اور غداروں کی سازشیں بار آور ہونے لگی

بیچے۔ اس وقت قمر الدین کسی اور جگہ تھا۔
اسے جو معلوم ہوا کہ سلطان فوت ہو گیا ہے تو جس قدر فوج اس کے
پاس تھی اور جتنی وہ حاصل کر سکتا تھا، اسے لے کر سرنگا پٹم پہنچ گیا۔ سلطان نے
اس کی بغاوت کو بڑی مشکل سے فرو کیا تھا اور دو سال کے لیے قمر الدین کو
نظر بند کر دیا تھا۔

میسور کے اہل ان فوجوں اور نمک حراموں میں ایک اور بڑا نام میر قاسم علی بن بشیر نور الدین کا ہے۔
یہ بھی میر صادق اور میر سنگڑے کی طرح بچی النسل سید زادہ تھا۔ اس کی تمام زندگی سلطان کی خدمت میں
گزری تھی۔ اسی کا وطن حیدر آباد کی سرحد پر تھا۔
ایک دفعہ میر قاسم نے سلطان سے گھر جانے کی اجازت مانگی۔ سلطان نے اجازت دے دی اور یہ
وطن روانہ ہوا۔

اس کی روانگی کے فوراً بعد پورینا اور میر صادق نے سلطان سے شکایت کی کہ میر قاسم بہت ماسرکاری
مال اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔

اس اطلاع پر سلطان نے میر قاسم کو معرمان کے واپس لانے کا حکم دیا۔ چنانچہ اسے پکڑ کر واپس
لایا گیا۔ اس کے ساتھ مختصر سامان تھا۔

سلطان کے حکم سے میر قاسم کے سامان کی تلاشی لی گئی مگر اس کے پاس سے کوئی ماسرکاری مال برآمد نہ ہوا۔
سلطان نے اسے دوبارہ وطن جانے کی اجازت دیدی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ پورینا اور میر صادق نے سلطان سے میر قاسم کی بھوٹی شکایت کی تھی۔ اہل وجہ
یہ تھی کہ میر قاسم اس وقت تک سلطان کے وفاداروں میں سے تھا۔ پورینا اور میر صادق اپنی چال بازیوں سے
سلطان کے تمام وفاداروں کو سلطان کے خلاف کرنے جارہے تھے۔

میر قاسم کی شکایت اس وجہ سے کی گئی تھی کہ سلطان اسے گرفتار کر کے دربار میں بلوائے گا اور دربار
میں سب کے سامنے اس کی تلاشی ہوگی۔ ایک امیر کے لیے یہ بڑی سبکی اور بدنامی کی بات تھی اور یہی پورینا
میر صادق کا مقصد تھا۔

سلطان نے میر قاسم کو تلاشی کے بعد جانے دیا مگر وہ کم ظرف تھا۔ وہ اسی وقت سے سلطان کے

نہیں اور میر قاسم کو سلطان سے اپنی توبہ کا بدلہ لینے کا موقع مل رہا تھا۔

سلطان کے اس لطاف شاہانہ کا بدلہ اس نمک حرام نے جس طرح دیا وہ میڈوز کے اس خط سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

وہ لکھتا ہے:

”میر قاسم اپنے وطن حیدر آباد جانے کے بجائے انگریزوں سے جا کر ملتا ہے اور انگریز فوج کو موسمی کے محفوظ راستے سے لاکھ قلعے کے جنوب مغربی گوشے میں عین مقابل اس گنجان باغ میں ٹھہراتا ہے جہاں سے انگریزی فوج ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو قلعہ پر حملہ آور ہوئی۔

قلعہ کا یہ پہلو سب سے کمزور تھا۔ انگریز سپہ سالار کو جس شخص نے اس کمزور پہلو سے مطلع کیا وہ بھی میر قاسم تھا۔“

اس نمک حرام نے فقط اتنا ہی نہیں کیا بلکہ پوری ایمان فروشی کا ثبوت دیا۔ میڈوز کے چل کر اس کی غدار کی اس طرح تشریح کرتا ہے:

”دو پہر کا وقت تھا (۴ مئی کو) جب حملہ کی تیاریاں مکمل ہو چکیں تو جنرل میر ڈن فوج کو خندقوں سے لے کر نکلا اور دیا پار کر کے تفصیل قلعہ پر چڑھا۔ انگریز فوج میں جو سب سے آگے تھا وہ جنرل میر ڈن تھا۔ اس کی رہنمائی کے لیے ایک شخص اس سے بھی آگے آگے تھا اور وہ میر قاسم تھا جو تفصیل قلعہ پر پہنچنے سے بھی پہلے چڑھا تھا۔“

اس سازش کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ لارڈ ولزلی کو ان نمک حراموں کی کاروائی پر پورا پورا اعتماد اور یقین تھا کہ یہ لوگ سلطان کو ضرور دھوکہ دیں گے۔ اسی لیے اس نے جنرل ہارس کو قطعی حکم دیا تھا کہ:

”جب تک سرنگا پٹم پر قبضہ نہ ہو جائے صلح کی گفتگو نہ کی جائے کیونکہ اس شہر کے ہمارے قبضہ میں آجانے سے ہندوستان کی قسمت کا دروازہ ہمارے لیے کھل جائے گا۔“

پس—

جنرل ہارس نے سلطان کو صلح کے لیے جو شرائط بھیجی تھیں وہ کامل اطاعت بلکہ غلامی کے ذمے سے ہیں

آتی تھیں۔

اگر ہم مندرجہ بالا تحریر پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ولزلی کو جنگ سے پہلے ہی اس سازش کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔

ہندو ذات کے ٹکڑاؤں میں یوں تو بہت سے نام شامل ہیں جنہوں نے نواب بہادر حیدر علی خاں اور پھر سلطان ٹیپو کے عہد میں سلطنت خداداد کو ختم کر کے میسور کے پرانے ہندو راجہ کو برسر اقتدار لانے کی کسی منظم سازشیں کیں۔

ان میں خاص خاص کھاندے راؤ، ترمل راؤ، رنگیا اور شامیا وغیرہ شامل ہیں لیکن یہ نواب بہادر اور سلطان کو کوشش کے باوجود نقصان نہ پہنچا سکے۔ ان تمام لوگوں کی سازشیں پکڑی گئیں اور یہ سب اپنے کیفر و کار کو پہنچے۔

لیکن— ان سب کے علاوہ ایک اور نام پورنیا کا بھی ہے:

پورنیا نے اگرچہ اپنی ترقی کے لیے بہت جدوجہد کی لیکن یہ اس قدر خطرناک سازشی تھا کہ آخری وقت تک سلطان کو خریب دیتا رہا اور آخر سلطنت خداداد کا خاتمہ کرنے میں اس نے میر صادق جیسا ہی کردار ادا کیا۔

پورنیا، حیدر علی کے زمانے میں سرکاری ملازمت میں آیا۔ پہلے رسل در سائل کا افسر اعلیٰ مقرر ہوا۔ پھر وزیر مالیات اور دیوان (وزیر اعظم) مقرر ہوا۔

وزیر مالی ہونے کی وجہ سے اسے تمام سرکاری ٹیکوں اور ان محکموں کے افسران بالا تک رسائی حاصل تھی اس لیے اکثر غدار اس کے اشاروں پر نہا جتے تھے۔

پورنیا نے افسردہ اور ثروت دے کر سلطان کے محکمہ جاسوسی کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ پھر آخری وقت میں یعنی میسور کی چوتھی جنگ کے دوران عین جنگ کے لمحات میں اس نے تنخواہ تقسیم کرنے کے بدلے تفصیل سے فوج کو جس طرح نیچے اتارنا تھا اس کا حال بیان کیا جا چکا ہے۔

ماڈرن میسور کا مصنف پورنیا کا حال یوں بیان کرتا ہے:

”پورنیا ۱۷۹۶ء میں ضلع ترچنا پل کے موضع تردکبہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے باپ کا نام کرشنا چاری اور ماں کا نام کشتی امان تھا۔“

کیا اور اس کے تقرر کو رانی نے فوراً قبول کر لیا۔
اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ پورنیا کی غداری کس قدر گہری تھی۔ سلطان کو پورنیا پر آخر وقت تک اعتماد رہا اور اسے اس غدار پر ذرا بھی شک نہ ہوا۔
میسور میں مشہور ہے کہ حیدر علی خاں نے اپنے آخری وقت میں سلطان کو ایک خط لکھا تھا جس میں تحریر تھا کہ:

”پورنیا اور میر صادق کو قتل کر دیا جائے۔“

مگر افسوس کہ سلطان نے باپ کی اس تحریر کو درخور اعتناء نہ سمجھا بلکہ اس نے ان پر اور زیادہ نوازشوں کی بارش شروع کر دی۔

اس سے سلطان کی طبیعت کے اس پہلو کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ حیدر علی کے برعکس غداروں اور ایساں فردوشوں کو اخلاقی مارو سے کہ اپنا ہمنوا بنانا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں سلطان کی ہر کوشش چہرہ ناکامی سے دوچار ہوتی۔

غلام علی لنگڑا، قمر الدین، معین الدین وغیرہ کے بارے میں سلطان کو علم تھا کہ وہ غداری کر رہے ہیں۔ بعض کو تو ایمان فروشی اور غداری کرتے ہوئے پکڑا بھی گیا لیکن سلطان نے ان کے ساتھ اعلیٰ قدر کا مہارہ کیا اور معاف کر دیا۔
اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

یہی کہ ان غداروں اور نیک حراموں نے سلطنتِ خدا داد کا خاتمہ کر دیا۔
ماڈرن میسور کے مصنف کی مندرجہ بالا تحریر سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ پورنیا کے دماغ میں خود ہی میسور میں ہندو راج قائم کرنے کا خیال تھا اس لیے جب رانی لکشمی نے اسے اپنی سازشوں میں شریک ہونے کی دعوت دی تو پورنیا انکار نہ کر سکا۔

یہ ضرور ہے کہ پورنیا نے کسی سازش میں کھلی حصہ نہ لیا لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ ہندو درپردہ سازش کھلی ہوئی سازش سے بہت زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ پورنیا کو کرشن راؤ کی سفارش سے سرکاری ملازمت ملی تھی در کرشن راؤ جب اپنی سازش میں ناکام ہو کر گرفتار ہوا تھا اور اسے قتل کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا اس نے کہا تھا:

”..... میں نے جو آگ لگائی ہے وہ سلطان کے بجائے نہ بچھ سکے گی۔“

پورنیا جب گیارہ سال کا ہوا تو اس کا باپ مر گیا۔ یہ بہت غریب تھا اس لیے اس کی ماں دوسروں کے گھروں میں کام کاج کرتی تھی۔ پورنیا کا ایک بڑا بھائی ونگٹا راؤ بھی تھا۔

۱۷۹۰ء میں یہ خاندان تردکپور چھوڑ کر سختی منگلی آ گیا۔ یہاں پورنیا نے ایک بیٹے رلیکا کی ملازمت کر لی۔

رلیکا کے تعلقات مرنگاپٹم کے ایک بیٹے سے تھے جس کے تعلقات آگے شاہی محلات سے تھے۔ اس تعلق سے پورنیا اکثر مرنگاپٹم جاتا آتا رہتا تھا۔ بعد میں پورنیا مرنگاپٹم کے اس بیٹے کے پاس ملازم ہو گیا۔ اب اس کی آمد و رفت شاہی محلات میں ہو گئی۔

یہاں اس کی شناسائی داروغہ محلات شاہی کرشن راؤ سے ہوئی کرشن راؤ نے نواب حیدر علی خاں سے سفارش کر کے اسے سرکاری ملازمت دلوا دی۔

یہاں سے اس کی ترقی کا زمانہ شروع ہوا۔

حیدر علی خاں اور سلطان کی نوازشوں سے اس نے اس قدر ترقی کی کہ اس کو نوٹ، نقارہ، پابکی اور عماری کے علاوہ طلائی، جیر، پکڑنے کی بھی اجازت تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص کے ساتھ سلطان نے اتنی نوازشیں کیں آخر اس نے ایسی غداری کیلنگی اور نیک حرامی کا مظاہرہ کیوں کیا؟
اس سلسلے میں ماڈرن میسور میں لکھا ہے کہ:

پورنیا چونکہ ہندو تھا اس لیے میسور کی سابق رانی لکشمی نے اس سے درخواست کی کہ وہ میسور میں دوبارہ ہندو راج قائم کرنے میں اس کی مدد کرے۔ پورنیا نے رانی سے وعدہ کیا اور سلطان کے خلاف سازشوں میں شامل ہو گیا۔

مگر پورنیا بہت چلاک تھا اس لیے اس نے کھانڈے راؤ کی طرح کھل کر بغاوت نہیں کی (یعنی پوشیدہ رہ کر غداری کی)۔ اس کی اس پالیسی ہی کی وجہ سے انگریزوں نے اسے میسور کی نئی ہندو ریاست کا دیوان مقرر

اس سے شبہ ہوتا ہے کہ کرشن راؤ کے دوسرے مانتھپوں میں پورنیا بھی شامل تھا جو اپنی چالاکی کی وجہ سے پکڑا نہ جاسکا اس طرح کرشن راؤ کا یہ کہنا صحیح ثابت ہوا کہ اس کی لگائی ہوئی آگ کو سلطان نہ بجھا سکے گا۔ اسی لیے کہ کرشن راؤ کے بعد پورنیا جیسے بہت سے لوگ اس آگ کو جلانے اور ہوا دینے کے لیے موجود تھے۔

ہندوؤں کی سازش کا مرکز "سری رنگا" کا مندر تھا۔ وہاں یہ ہندو سازشی جمع ہوتے تھے ایک مصنف نے "سری رنگا" کے بٹ کے بارے میں کیا خوب جملہ لکھا ہے:

"اگر اس بٹ کے زبان ہوتی تو وہ کہہ سکتا کہ اسی کے سینے میں کھنڈہ

راز پوشیدہ ہیں۔"

اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سلطان اور فرانس کے درمیان جو عداوت ہو اتنا اس کی نقل رانی میسور کو سونے پورنیا کے اور کوئی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ رانی نے اس عداوت کی نقل اپنے ایجنٹ نزل راؤ کے ہاتھ گورنر مدراس کو بھیجی تھی جس نے انگریزوں کو سلطان کے خلاف چوکنا اور پہلے سے زیادہ ہتھیار کر دیا تھا۔

پورنیا اس قدر گہرا تھا کہ اس کی سازش آخری وقت تک بے نقاب نہیں ہوتی لیکن جب سب کچھ ہو چکا ہوتا ہے اور پورنیا کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اب سلطنت خداداد کا خاتمہ یقینی ہے اور وہ بالکل محفوظ ہے تو پھر یہ نمک حرام علی الاعلان اپنی غداری کو ظاہر کرتا ہے اور تفصیل قلعہ میں شگاف پر او و جنوبی فصیل پر متعین فوج کو تنخواہ کے بدلے مسجد اعلیٰ کے پاس بلوایا ہے اور اس طرح انگریز فوج کو قلعہ پر چڑھانے کی مہلت فراہم کرتا ہے۔

پورنیا نے کرشن راؤ کے اعلان اور اپنے شامیائی سازش کو علی جامہ پہنا کر ثابت کر دیا کہ کرشن راؤ نے ٹھیک کہا تھا کہ جو آگ اس نے لگائی ہے وہ سلطان سے نہ بجھے گی۔

پس۔

پورنیا کی گہری سازش کامیاب ہوئی اور سلطنت خداداد کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی کارکردگی کے صلہ میں پورنیا کو میسور کی نئی ہندو ریاست کا وزیر اعظم بنا دیا گیا؛ مورخ باسوں نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

"یہ اسی سازش کا نتیجہ تھا کہ پورنیا کو میسور کا دیوان بنا دیا گیا۔"

مورخ رئیس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

"جب سلطنت خداداد کا خاتمہ ہو گیا تو پورنیا کو نئی ریاست کا دیوان بنایا گیا۔

مگر چھ تریں راؤ کو رانی کی سفارش حاصل تھی مگر مسروپ نے رانی کو ایک خط لکھ کر سمجھا دیا۔ یہ خط مرہٹی زبان میں تھا اور اس پر "سری دب" کے دستخط تھے۔

ایک اور تاریخ میں مذکور ہے:

"پورنیا، حیدر علی خاں اور سلطان دونوں کی ملازمت میں رہ چکا تھا لیکن وہ بغیر کسی حرمت اور افسوس کے اب اپنے نئے ہندو اتحاد کی ملازمت سے اس طرح غمگن ہو گیا جیسے ملک میں کوئی انقلاب ہی رونما نہیں ہوا۔"

غداری اور نمک حرامی خواہ ہندو میں ہو خواہ مسلمان میں ہے یہ بدترین گناہ! اس لیے جس طرح مسلمانوں میں میر صادق کا نام بطور منافق، غدار اور نمک حرام مشہور ہے اسی طرح پورنیا کا نام بھی ہندوؤں میں منافق، نمک حرام اور غدار کے طور پر مشہور ہے۔ یہاں تک کہ وہاں کی ایک علاقائی زبان میں ایک شاعر نے میر صادق اور پورنیا پر ایک نظم لکھی ہے جو ہر جگہ گراموفون پر گائی جاتی تھی۔ (واضح رہے کہ آج کل گراموفون کا رواج متروک ہو گیا ہے)۔

۲۴ مئی ۱۷۹۹ء کے ہنگامہ میں جو لوگ زندہ رہے ان غداروں میں خاص طور پر جو افراد قابل ذکر ہیں ان کے نام یہ ہیں:

پورنیا

قرالدین

راجہ خاں

میر غلام علی سنگھ

بدرازاں نانکھ اور

غلام علی خاں بخشا

ان غداروں کو (موساٹے پورنیا کے) کمپنی کی جانب سے شنشیں دی گئیں۔ پورنیا کو غداری کے صلہ میں

میسور کی نئی ہندو ریاست کا دیوان بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے کوہندو میں جاگیر بھی دی گئی جس کی سالانہ آمدنی تین لاکھ روپے تھی۔

یہ خدارسرنکا پٹم میں ۸۱۱ء میں ملتا تھا۔

پورنیا کی کوٹھی سرنکا پٹم میں اسکاٹ باغ کے جنوب مشرق میں دریائے کاویری کی جنوبی شاخ کے کنارے واقع ہے اور اس پر اس کے نام کا پتھر بھی لگا ہوا ہے۔ یہ کوٹھی "پورنیا باغ" کے نام سے مشہور ہے۔

پورنیا کے ذکر کے ساتھ ہی تمل راڈ اور نارائن راڈ کے حالات لکھنا بھی ضروری ہیں کیونکہ یہ دونوں بھائی تین دور میں رہ کر سلطنت خداداد کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔

یہ دونوں ملے بھائی تھے۔ ان میں سے تمل راڈ نے میسور کی رانی سے مدد لیا تھا کہ سلطنت کی بحالی کے بعد سے میسور کا دیوان بنایا جلائے گا لیکن انگریزوں نے پورنیا کو دیوان بنا کر نہ صرف اس کی ماری خواہشوں پر پانی پھیر دیا بلکہ ریاست میسور میں اسے قدام رکھنے سے بھی روک دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ مدراس ہی میں مقیم رہے۔

پیردائش آف میسور میں لکھا ہے کہ:

"جب سلطان کی شہادت اور سلطنت خداداد کے زوال کی خبریں ان دونوں بھائیوں کو ملیں تو انہوں نے گاڑیوں میں بھر کر لوگوں میں شکر بانٹی تھی۔"

۴۔ مئی ۱۷۹۹ء مطابق ۲۸۔ ذیقعد ۱۲۱۳ھ ہجری کو جو معرکہ سرنکا پٹم میں ہوا اور جس میں سلطان فتح علی خاں یثیونے شہادت پائی، اس معرکہ میں کام کرنے والوں اور خاص خاص لوگوں کا ذکر کتاب الاعراس میں تفصیل سے دیا گیا ہے۔ اس کا کچھ حصہ قارئین کی معلومات کے لیے ذیل میں دیا جا رہا ہے:

"بست دہشتم ماہ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ بروز شنبہ در حرب نصاری
پورش قلعہ میں یثیون سلطان بر حمت حتی پیوست و قریب دوازدہ ہزار
سپاہ (بارہ ہزار ۱۲۰۰) خاص و عام در آں روز شہید و کشتہ شدند۔"

تاریخ

یثیون بوجہ دین محمد شہید شد

۱۲۱۳ھ

خاص خاص مرنے والوں اور شہیدوں کے نام ذیل میں دیے جا رہے ہیں:

- ۱۔ میر میران محمد رضا خاں
- ۲۔ سید اشرف "
- ۳۔ محمد حسین "
- ۴۔ میر محمد صادق علی (ننگ ملت، ایمان فروش خدار)

۵۔ آصف سید محمد خاں

۶۔ نواب حسین علی خاں شہید فرزند قطب الدین خاں

۷۔ غلام حسین داروغہ نوشک خانہ

۸۔ محمد یوسف داروغہ نعمت خانہ

۹۔ غلام حیدر خاں، میرزائے دفتر مسجد

۱۰۔ میر میراں سید غفار شہید

۱۱۔ میر خازن شیخ استغیل

۱۲۔ آصف شیر خاں

۱۳۔ خازن سید بدھن

۱۴۔ میر نواب میر معین الدین

۱۵۔ محمد براہیم عرض بگی

۱۶۔ مولانا عبدالرحیم استاد دفتر مسجد

سیدلار و تیلدار و نوردار سپاہی وغیرہ دوازدہ ہزار کس کشتہ شہرند
از فرمان سختی۔

اس فہرست میں صرف دو ناموں کے ساتھ "شہید" لکھا ہوا ہے۔ اس میں ایک نام میر میراں سید غفار
کا ہے۔

سید غفار کے بارے میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ سلطان کے سب سے زیادہ قابل اعتماد اور وفادار
افروں میں سے ایک تھا۔ اس کی تعیناتی ۴ مئی کو تحصیل کے ننگلف اور تحصیل کے قریب اس باغ کے سامنے
تھی جس میں ایک غدار میر قاسم نے انگیز فوج کو لاکے چھپا دیا تھا۔

چونکہ قلعہ کا ہی صدر سب سے زیادہ کمزور تھا اس لیے حملہ اسی سمت سے ہونا تھا مگر میر میراں سید غفار
کی موجودگی میں انگیز فوج کی ہمت نہ تھی کہ وہ تحصیل پر آسکتی۔
چونکہ سازش تیار ہو چکی تھی اس لیے میر حسین الدین جو میر میراں سید غفار کا افسر تھا، اس نے سید

سے کہا کہ وہ سلطان کے پاس جا کے انہیں مطلع کر دے کہ آج قلعہ پر حملہ ہو گا اس لیے محتاط اور تیار رہیں۔
سید غفار کو کیا پتہ تھا کہ اس کا افسر ہی ملک و ملت اور وطن سے غداری کر رہا ہے۔ وہ تحصیل حکم کے لیے سلطان
کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی اجماعی فوجیں میر معین نے انگیزوں کو اشارہ کر دیا اور انگیز فوج بغیر کسی مزاحمت کے
باغ سے نکلی اور تحصیل پر پہنچی اور ادھر پر چڑھنا شروع کر دیا۔

جبکہ اس وقت سید غفار سلطان کو اطلاع دے کر واپس آیا تو انگیز فوج کو تحصیل پر چڑھتے دیکھ
کر حیران رہ گیا۔

ابھی وہ حالات کا اندازہ بھی نہ کر پایا تھا کہ اس کے سر پر ایک مہر بھرتی بان دی گئی جو اس بات کی نشانی
تھی کہ سید غفار اس بھرتی کے نیچے موجود ہے۔

یہ کام میر معین الدین نے کر لیا تھا۔

سید غفار کی نشان دہی ہوتے ہی اس پر انگیز فوج کی طرف سے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی اور یہ وفادار
اپنے ہی خون میں نہانا ہوا شہید ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی انگیز فوج بے دھرمک تحصیل قلعہ پر دوڑنے لگی۔

۴ مئی کی اس قیامت منبری کا دو مرا شہید نواب حسین علی خاں تھا۔ یہ وفادار ۴ مئی کی صبح شہید ہوا تھا۔
اس سے پہلے شب میں جو مال حسین علی خاں کا نکاح ہوا تھا۔ ایک شب کا دو ہما صبح ہی صبح اپنے مقام تعیناتی
پر پہنچی۔ چروں کے تقریباً دس بجے اس کی لاش سلطان کے سامنے لائی گئی۔ مورچہ کی حفاظت کرتے ہوئے
اسے گولہ لگا تھا۔

سلطان اس جوان سال اور صرف ایک شب کے دو ہما کو لاش بنا دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔
"ہفت خوان حیدری" کا مصنف لکھتا ہے کہ:

"جب نوجوان دو ہما کی لاشیں گھر پر لائی گئی تو اس کی ایک شب کی دہن
کی آہ و زاری سن کر دیکھنے والوں کا کلبی چھٹنے لگا۔ سوگوار دہن نے اپنی تمام عمر
اسی طرح بسر کر دی۔ وہ مدت العز زندہ رہی مگر ہر دم اس کی زبان پر ہم۔ مئی
کے واقعات رہتے تھے۔"

اب تک ہم سلطان بیہوش کو یحیئیت ایک حکمران اور سلطان دیکھتے اور پرکھتے رہے ہیں اب آئیے سلطان شہید کو ایک انسان کے پیمانے پر جانچتے اور تولتے ہیں۔ اس میں ہم سلطان کے چہرے ہرے خدو خال، مشاغل اور عادات و اطوار کا جائزہ لیں گے۔

سلطان کی تشکل و صورت کے بارے میں میجر آرن کی ایک تحریر پہلے لکھی جا چکی ہے۔ "نشانِ چہرہ" کے مصنف اس کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سلطان کا رنگ گندمی تھا، رنگ خدار اور آنکھیں پُر آب اور بڑی بڑی تھیں۔ چہرے کے خدو خال نہایت نازک تھے اور ہاتھ پاؤں بھی چھوٹے چھوٹے تھے۔ سلطان وارہی منڈاتا تھا۔ گردن پر بل پڑتے تھے۔ قد پانچ فٹ اور آٹھ انچ تھا۔"

سلطان کے خدو خال کے اس تذکرہ سے سلطان کی اس طاقت کا قطعی اندازہ نہیں ہوتا جو اس کے بازوؤں، پیٹھوں، گلہ بول اور خصوصیت سے بچوں میں تھی۔

سلطان کی جسمانی طاقت ہی نے اسے ایک پھر پھر شکستیں سہارا دیں اور ہر شہنشاہ بنایا تھا۔ اس کی گلائیوں اور بچوں میں یہ طاقت تھی کہ وہ شیروں اور چیتوں سے زور آزمائی کرتا تھا۔ ان درندوں کو سلطان نے پال رکھا تھا اور ان سے دروازہ زور آزمائی کرتا تھا۔

سلطان لباس بہت سادہ استعمال کرتا تھا۔ اس کا لباس شرعی ہوتا تھا۔ ٹھڈی کے نیچے ایک سفید رد مال باندھا کرتا تھا۔ کمر کی پٹی میں ایک پیش قبض اور تلوار رستی تھی۔

گھوڑے کی سواری سلطان کو بہت پسند تھی۔ انتہائی مجبوری کی حالت میں پانکی یا کوئی دوسری سواری استعمال کرتا تھا۔

سلطان کا طرزِ کلام نہایت شیریں اور ملائم تھا۔ اس کی زبان سے کبھی کوئی سخت یا فحش کلمہ نہیں نکلتا تھا اور اکثر اس کی زبان پر یہ جملہ رہتا تھا:

"گیدڑ کی سو مالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔"

سلطان عام طور پر فارسی زبان میں گفتگو کرتا تھا حالانکہ اسے گھڑی اور دکھنی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ چنانچہ صاحبِ حیات حیدری لکھتے ہیں:

"وہ مغفور ہر ایک علم سے بہتر ضرورت بہرہ ور تھا۔ گفتگو فارسی زبان میں کیا کرتا۔ محض ایسا کہ کسی امر میں مطابق جبرالامور اور سالک کے اعتدال سے

باہر قدم نہ رکھتا تھا۔ ایسی مزاح و ہزل کا جس سے کسرِ شانِ اسلام پائی جاتی کیا امکان کہ اس پر شریعت کی مجلس میں مذکور نکلا۔"

سلطان بیہوشِ بغرت و حجت کا بیٹلا تھا۔ اس نے تمام عمر کسی کو ہاتھ اٹھا کر سلام نہیں کیا اور نہ دوسرے کو ایسے سلام کی اجازت دی۔

۱۷۹۲ء میں جب سلطان کو میسور کی تیسری جنگ میں معصور ہو کر جمہورِ صالح کرنا پڑی اور لارڈ کارنولس کو ایک لاکھ کی رقم اور دیوے ریٹال کے طور پر انگریزوں کی تحویل میں دینا پڑے، اس دن سے سلطان نے ہنر پر سونا چھوڑ دیا۔ وہ فرس زین پر ایک کھدر کا موٹا کپڑا بچھا کر موٹا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک انگریزوں سے انتقام نہ لے لوں گا اس وقت تک چار پائی پر نہ سوؤں گا۔

سلطان شہید ہو گیا مگر اس نے دم آخر تک چار پائی سے پیٹھ نہیں لگائی۔ سلطان کو تھنیک اور تسخر کی باتیں بالکل پسند نہ تھیں۔ کسی کو اس کے سامنے ایسی باتیں کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

سلطان نے ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت دیکھ کر اندازہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں میں عجیب اور خصوصیت سے ہندوانہ خصلتیں اس قدر سرایت کر گئی ہیں اور انہوں نے غیر اسلامی رسم و رواج کو اتنا زیادہ اختیار کر لیا ہے کہ انہیں شناخت کرنا مشکل ہو جا رہا ہے۔ جب تک یہ اپنی موجودہ حالت بدل کر زمانہ قدیم کے مسلمانوں جیسی سادگی اختیار نہیں کریں گے یہ دنیا میں ترقی نہیں کر سکتے۔

چنانچہ سلطان نے تمام تکلفات کو برطرف کر دیا اور اپنی نشست و برخاست، اسلام و آداب اور تحریر و تقریر میں ایسی سادگی اختیار کی جو آپ اپنا نمونہ بن گئی۔

سلطنتِ مغلیہ کے اثر سے درباریوں کو بادشاہ کے سامنے کئی بار جھک کے بلکہ زبیں بوس ہو کے سلام پیش کرنا پڑتا تھا۔ بادشاہ کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہونا تو ایک عام بات تھی۔ یہاں تک کہ مسجدوں کے اندر بھی امیر و غریب کی تقریبی پیدا ہو گئی تھی اور لوگ مسجد میں داخل ہونے والے امرا اور وزرا کو تعظیم پیش کرتے تھے۔

سلطان نے اس طریقہ کو ختم کرنے کے لیے خود اپنے لیے یہ قاعدہ بنایا کہ وہ خاموشی سے سر جھکائے مسجد

۱۔ اسلام میں اشارے سے سلام کرنے کی ممانعت ہے۔ یقیناً سلطان اسی اسلامی حکم کی متابعت میں ایسا کرتا تھا۔

میں داخل ہو جاتا اور جہاں پر جگہ ملتی وہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیتا۔

سلطان کے معمولات بھی بہت سادہ مگر بے حد منظم تھے۔

سلطان علی الصبیح بیدار ہوتا اور نماز فجر کے بعد کم از کم ایک گھنٹہ تلاوت کرتا۔ پھر نصف گھنٹہ نوشہ تیار میں جو اہل بیت و غیرہ کا معائنہ کرتا۔ اس کے بعد سیر کو جاتا۔

سیر سے واپسی پر سلطان ناشتہ کرتا۔ ناشتہ پر سلطان کے ساتھ تین چھوٹے شہزادے اور ایک غنشی ہوتا تھا۔

سلطان اکثر خطوط ناشتہ کے دوران ہی لکھتا تھا۔ اس کے ناشتہ میں زیادہ تر پھل اور دودھ ہوتا تھا۔

ناشتہ کے بعد سلطان فوج کے معائنہ کو جاتا۔

وہاں سے فارغ ہو کر محل آتا۔ اس وقت باہر سے آئے ہوئے خطوط اور رپورٹیں سلطان کے سامنے پیش کی جاتیں اور اسی وقت احکامات صادر ہوتے تھے۔

رات کے کھانے پر بڑے شہزادے اور افرانِ سلطنت ضرور موجود ہوتے تھے۔ کھانے پر فنِ تاریخ اور شہزادے کلام کا ذکر ہوتا۔

کھانے کے بعد چہل قدمی کی جاتی۔ پھر سلطان بستر پر چلا جاتا اور مینڈائے تک کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتا رہتا۔

سلطان پہلے سہری اور پھر چٹ پر سونا تھا لیکن میسور کی نیمری جنگ کے بعد اس میں سلطان کو محصور ہو کر انگریزوں سے صلح کرنا پڑی تھی اور اس کے دبیٹے انگریزوں کی تحویل میں بطور یرغمال چلے گئے تھے، تب سے سلطان نے چار پائے سے بیٹھ کر ناچوڑ ڈیا تھا۔ وہ فرش پر کوئی موٹا کپڑا بچھا کر سویا کرتا تھا اور اس کا یہ معمول شہادت تک جاری رہا۔

سلطان کے روزانہ معمولات کے متعلق میسور گزٹیر کا مصنف لکھتا ہے:

”سلطان میں صبح سے بڑا دھنپ یہ تھا کہ وہ دن بھر بغیر آرام کیے اپنی سلطنت کے کاموں میں مصروف رہتا تھا اور ہر کام قرینہ اور باقاعدگی سے ہوتا تھا۔

سلطان روزانہ اپنے لختہ سے اس قدر خط و کتابت کرتا تھا کہ دیکھ کر اس کی جفاکشی اور دل و درماغ پر جھرت ہوتی تھی۔

سلطان بہت بڑا غنشی تھا۔ طب، تجارت، معاملات مذہبی و فوجی اور بے شمار دوسرے امور میں اسے یکساں قابلیت اور درک حاصل تھی۔ اس کا ثبوت ان خطوط کو پڑھنے سے ملتا ہے جو اس نے دوسرے لوگوں کو لکھے تھے۔

زوالِ سلطنتِ خدا داد کے بعد سلطان کا ذاتی کتب خانہ کربل کرک میٹرک کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنی کتاب کے دیباچہ میں سلطان کی علمی قابلیت کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہے:

”سلطان کی تحریر دوسری تحریروں سے بالکل متمیز تھی۔ تحریر عجمی مگر اس قدر پر معنی ہوتی تھی کہ ایک ایک لفظ سے کئی کئی معنی نکلتے تھے۔ اس کی تحریر کا خاص وصف یہ تھا کہ وہ ایک ہی نظر میں پہچانی جاتی تھی کہ یہ سلطان کے قلم سے نکلی ہے الفاظ میں حکیم پایا جاتا تھا۔

اور۔ ایچ۔ کیسبل لکھتا ہے:

”سلطان نہایت آسانی سے نظم و نثر لکھتا تھا اور اس کے مضمون میں ایک خاص شان پائی جاتی تھی۔ اس نے کبھی کسی کو سلام نہیں کیا اور نہ کسی سے سلام قبول کیا۔“

کتاب ”تحفۃ المجاہدین“ اور دوسری کئی کتب جیسے وقائع منازل، احکام نامہ و غیرہ سلطان کی خاص نگارانی میں کھیں گئیں۔ ان میں بہت سے مضامین اور اشعار خود سلطان کے تصنیف کردہ ہیں۔

سلطان اپنے فرامین اور دوسری تحریروں پر، جو منشیوں کے ہاتھ کی لکھی ہوتی تھیں، لکھا کر آغازِ بندار پر اپنے لختہ سے ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ اپنے قلم سے لکھتا اور اختتامِ عبارت پر اپنے دستخط ثبت کر دیتا تھا تاکہ اس میں کسی قسم کا اضافہ نہ ہو سکے۔

کتاب ”تختۃ المجاہدین“ (فتح المجاہدین) میں فارسی اور اردو آیات اور احکام ہیں۔ کتاب میں مصنف کا نام ہے:

”میرزین العابدین شہسوری۔“

مگر مصنف خود اقرار کرتا ہے کہ کتاب سلطان کی زیرِ نگرانی لکھی گئی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سلطان کس قدر قادرِ الکلام شاعر اور نثر نگار تھا۔ اس سے اس کی علمی جنگی قابلیت اور فراخ دلی کا اظہار بھی ہرگز نہیں ہے۔

میرزین العابدین، حیدرآباد کے میرِ عالم کے بھائی اور سلطان کے میرِ منشی تھے۔ ان کے متعلق کوئی ثبوت

موجود نہیں کہ وہ زوال سلطنتِ خدا داد کی کسی سازش میں شریک رہے ہوں لیکن حیدر آباد اور میرٹھ کی سلطان کے ساتھ کھلی ہوئی دشمنی کو دیکھتے ہوئے سخت تعجب ہوتا ہے کہ سلطان نے انہیں کس طرح اس قدر اہم عہدہ دے رکھا تھا۔

سلطان کو ان پر کسی قسم کا شبہ نہیں تھا اور وہ بحیثیت ایک سچا مسلمان ہونے کے دد مروت سے بھی ایسی ہی سچائی کی امید رکھتا تھا۔

سلطان کی علیت اور علم دوستی کا نتیجہ تھا کہ اس نے مرزا گاجپٹم میں جمیع الامور کے نام سے اپنا زیر نگینی ایک یونیورسٹی قائم کی تھی۔

اس یونیورسٹی کا کتب خانہ نہایت اہم اور بیش قیمت کتب پر مشتمل تھا۔ زوال مرزا گاجپٹم کے بعد مرزا گاجپٹم میں لوٹ مار ہوئی، اس کے بعد بھی اس یونیورسٹی کے کتب خانے میں مندرجہ ذیل "تلمی کتب" موجود تھیں:

قرآن مجید	تفسیر
۲۴ جلدیں	۴۱ جلدیں
کتب و مناقب	تسوف
۳۵ جلدیں	۵۶ جلدیں
علم اخلاق	فقہ
۲۴ جلدیں	۹۵ جلدیں
احادیث	النبیات
۲ جلدیں	۳۶ جلدیں
علوم و فنون (آرٹس)	فلسفہ
۱۹ جلدیں	۵۲ جلدیں
نجوم	ریاضی
۲۰ جلدیں	۷ جلدیں
حکمت (طب)	تحقیق زبان
۲۲ جلدیں	۴۵ جلدیں
فرہنگ و لغات	کتب نظم
۲۹ جلدیں	۱۹ جلدیں

ہندی اور دوسری نظم کی کتابیں	ہندی اور دکنی انشاء
۲۳ جلدیں	۴ جلدیں
ترکی نثر	قصص و حکایات
۲ جلدیں	۱۸ جلدیں

یہ کتب خانہ ماسوائے چند کتب کے، تمام کا تمام ولایت بھیج دیا گیا۔ مرن چند کتابیں گلگتہ بھی بھیجی گئی تھیں۔

سلطان کے بارے میں سچا اسٹوارٹ اور پروفیسر آر۔ ایس۔ گھوش لکھتے ہیں:

کتب خانہ کی ترتیب و تہذیب کے لیے ایک متمم مقرر تھا۔ سلطان کو تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا۔ اس کے حکم اور فرمائش سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر فوجی اور دیوانی معاملات پر مشتمل ہیں۔ سلطان نے اپنے فرامین کے متعدد مجموعے تیار کرائے تھے جو آج بھی یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

سلطان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جو کتاب پڑھ چکا اس پر سرٹت کر دیتا تھا۔ اس طرح اکثر کتابوں پر اس کی سرٹتیں ہیں۔

۱۷۹۹ء میں جب سلطنتِ خدا داد زوال پذیر ہوئی تو مرزا گاجپٹم کا یہ کتب خانہ چھ سال تک نظر التفات سے محروم رہا اور کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔ اس کے بعد سچا اسٹوارٹ نے اردو، فارسی اور عربی مخطوطات کی ایک فہرست تیار کرانی جو ۱۸۰۸ء میں کیمبرج میں چھپ کے تیار ہوئی۔

اس کتب خانے کی جو چند کتابیں گلگتہ بھیجی گئی تھیں وہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے حوالے کر دی گئی تھیں۔

سلطانی کتب خانہ کی جو کتابیں اس سوسائٹی کے پاس ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے:

- ۱۔ رسالہ بدکھا
- ۲۔ منتخب ضوابطِ سلطانی
- ۳۔ رسالہ بھجری
- ۴۔ ضابطہ انشاء
- ۵۔ راہ رفتن و سوارسی
- ۶۔ فتح الہما ہدین (تحفۃ الہما ہدین)
- ۷۔ روزنامہ وکلاٹے حیدر آباد
- ۸۔ وقائع منازل

اردو کی تمام کتابیں انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہیں۔
مبجرا سٹوارٹ نے اپنی فرست میں تمام کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

- ۱۔ تذکرہ شعرائے ہندی مصنف: فتح علی حسین تصنیف: ۱۱۶۵ء
- ۲۔ علی نامہ مصنف: ملا نصر قی تصنیف: ۱۰۷۱ء
- ۳۔ گلشن عشق مصنف: " تصنیف: ۱۰۶۸ء
- ۴۔ کلیت قلوب شاہ مصنف: قطب شاہ تصنیف: ۱۰۶۸ء

ان کتابوں کی تفصیل بہت طویل ہے اس لیے صرف نام درج کیے جا رہے ہیں:

- ۵۔ قصہ رضوان شاہ (خائن)
- ۶۔ قصہ ماہ بیکہ (خائن)
- ۷۔ قصہ بہرام گل اندام (طبعی)
- ۸۔ پھول بون (ابن نشائی)
- ۹۔ طوطی نامہ (ابن نشائی)
- ۱۰۔ قصہ پدماوت دھنی (ابن نشائی)
- ۱۱۔ قصہ لعل و گوہر (عارف الدین خاں)
- ۱۲۔ دیوان یقیں (انعام اللہ یقیں)
- ۱۳۔ بھوک بل (مترجم شہاب الدین)
- ۱۴۔ مفرح القلوب (مترجم حسین علی)
- ۱۵۔ دیوان سودا - قصائد سودا (مرزا سودا)
- ۱۶۔ سری گینیش (ترجمہ)
- ۱۷۔ سند رسکھار ہندی (ترجمہ)
- ۱۸۔ دہوری ہندی (درودیش بگراتی)
- ۱۹۔ روضۃ الشہداء (فارسی سے ترجمہ)
- ۲۰۔ رسالہ سرور درراگ (مترجم سید الکبرگ)
- ۲۱۔ نشاط العشق شرح غوثیہ (ترجمہ)
- ۲۲۔ مفتاح الصلوٰۃ (مترجم فتح محمد برہانی)
- ۲۳۔ خلاصہ سلطانی (سید امام الدین و محمد قاضی مرزا کاظم)
- ۲۴۔ کلید زبان تنگی

ان کتب کے علاوہ دوسرے کتب خانے میں قرآن مجید کا وہ نسخہ بھی ہے جو شہنشاہ اورنگ زیب کا لکھا ہوا ہے اور سلطان ٹیپو کے زمانے سے دستیاب ہوا تھا۔ یہ قرآن شریف کا نسخہ اس وقت دس ہزار روپے ہدیہ کا تھا۔ نہایت ہی نفیس خط نسخہ میں لکھا ہوا اور عمدہ نقش و نگار سے مزین ہے۔

سلطان نے شرعی احکام کے لیے فتوے مرتب کروائے تھے۔ اس نے جمیع الامور کے نام سے جو بیوروٹی قائم کی تھی اس میں مذہبی تعلیم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔

سلطان کو ایجا و اختراع کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس نے سینوں کے نام ابجد کے حساب سے رکھے تھے۔ اس نے میسور کے تمام شہروں کے نام بھی بدل دیے تھے۔

ذیل میں وہ چند نام دیے جا رہے ہیں جو سلطان نے پرانے ناموں کو تبدیل کر کے رائج کرانے لگے تھے:

پرانے نام	نیا نام
جیش	عسکر
بندوق	تفنگ
توپ	درخش
بان	شہاب
اشرفی	راختی - احمدی - صدیقی
صن	فاردنی
اٹنی	باقری
دون	کاظمی
آنہ	آبیہ



سلطان ٹیپو، سلطان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت زائد اور مستحق انسان بھی تھا۔ وہ بلا ناغہ نماز فجر کے بعد ملاوت کرتا تھا اور نماز کا اس قدر پابند تھا کہ جب مسجد اعلیٰ کا افتتاح ہوا تو سوال اٹھا کہ پہلی نماز کون پڑھائے؟

اس موقع پر بڑے بڑے علما اور مشائخ موجود تھے۔ طے یہ ہوا کہ جو شخص صاحبِ ترتیب ہو وہ امام ہو۔

کرے مگر وہاں صاحبِ تربیت کوئی بھی نہ تھا۔

اس وقت سلطان نے کہا:

”الحمد للہ۔ میں صاحبِ تربیت ہوں۔“

اس طرح مسجدِ اعلیٰ میں پہلی نمازی امامت خود سلطان نے کی۔

ایک بار ایسا ہوا کہ سلطان نماز عید کے بعد والدہ ماجدہ کی مجلس میں سلام کے لیے گیا۔ بعد تسلیم و نیاز کے سلطان وہیں ایک کمرے میں لیٹ گیا اور اسے نیند آ گئی۔

اس دوران نواب بہادر صید علی خاں کی دو منظور نظر کینز میں اپنے حجروں سے نکل کے سلطان کے پاس پہنچیں اور اس کے پیروانے لگیں۔

سلطان کی آنکھ کھل گئی۔ اسے کینزوں کی اس حرکت پر سخت طیش آیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ کینزوں کا ارادہ کیا ہے:

وہ خوفِ خدا سے کانپ اٹھا۔

پھر اس نے ان کینزوں سے کہا:

”یہ تمہنے کیا کیا۔ تم تو میری مائیں ہو۔ میں اس روسیاسی پر قیامت کے روز اپنے باپ کو کیا جواب دوں گا؟“

پھر سلطان نے ان کینزوں کو خواجہ سرا کے حوالے کیا اور حکم دیا:

”انہیں ایسی سزا دو کہ دوسروں کو عبرت ہو۔“

زنا سے سلطان کو اس قدر نفرت تھی کہ اس نے زانیوں کے لیے قتل کی سزا مقرر کی تھی۔

یہ واقعہ لکھا جا چکا ہے کہ اگر بیروں سے ایک جنگ کے دوران اسے معلوم ہوا کہ پائیں گھاٹے ہیں چند مسلمان عورتیں انگریزوں کے ساتھ زنا کی مرتکب ہوئی ہیں۔ پس سلطان نے ان عورتوں کے قتل کا حکم دیا تھا۔

صاحبِ نشانِ حیدری لکھتے ہیں:

”سلطان اس قدر کامل الجہاد تھا کہ سوائے اس کے بیروں کے ٹخنوں اور

کلائیوں کے اس کے جسم کو کسی نے برہنہ نہ دیکھا۔ یہاں تک کہ وہ حمام میں بھی

اپنے جسم کو چھلٹے رکھتا۔

حضرت عثمانؓ کے بعد اس اعتبار سے دنیا میں سلطان جیسا کہ دوسری

حیرت انگیز مثال تھا۔“

سلطان کبیر شرم و حیاء واری صرت اس کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ اس نے اس کا پرچار کیا۔ جیسا کہ اچھا کیا۔ اس کے لیے قانون وضع کیا۔

ملا بار اور کرگ کی عورتیں قدیم زمانے سے مراد سینہ کھول کر باہر نکلتی تھیں اور صرف ایک غنیمت سماعتہ بند باندھتی تھیں۔

سلطان نے فرمان جاری کیا کہ کوئی عورت مراد سینہ کھول کر باہر نہ نکلے۔ اگر کسی نے فرمان کی خلاف ورزی کی تو اسے سزا دی جائے گی۔

چنانچہ۔ اس فرمان کے جاری ہوتے ہی وہاں کی عورتیں مراد سینے پر کپڑا ڈال کر باہر نکلنے لگیں اور نہ بند بھی لیا کر دیا گیا۔ عیسویں چوٹی سینے کا رواج بھی سلطان کے اسی فرمان کا بہن منت ہے۔

رہیں نے اپنی تاریخ میں ہندو خواتین کی سلطنتِ خدا داؤ کے قیام سے پہلے کے حالات پر ایک طویل مقالہ لکھا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

وہ لکھتا ہے:

”ہندو راج کے زمانہ میں عورتوں کی حالت مددِ رجسٹری ہوتی تھی۔ وہ ذلت

اور خوف سے سہمی زندگی گزارتی تھیں۔ سر بازار ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

بڑے بڑے شہروں میں سرکاری طور پر عورتوں کی فروخت کے لیے منڈیاں قائم

تھیں اور ان منڈیوں سے راجہ کو آمدنی ہوتی تھی جو ”سما یا جا را“ کہلاتی تھی۔“

سلطان نے عورتوں کی فروخت کو ممنوع قرار دے دیا اور عورت کا گھر سے بے چادر باہر نکلتا جرم قرار دے دیا۔

انگریز مورخ مشرقی بادشاہوں کو بتا کر کہتے ہیں کہ شاہی عسکروں میں سینکڑوں عورتوں کو بادشاہ اپنے عیش و آرام اور بدکاری کے لیے رکھتے تھے مگر سلطان کی ذات اس طرح کے کسی بھی عیب سے بالکل پاک اور مبرا تھی۔

دیکھیں جیسا متعصب مورخ بھی سلطان کی پاک بازی کا اعتراف کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنی تاریخ میں اس کے متعلق لکھتا ہے:

”سلطان کے عمل میں ایک وقت میں تین سے زیادہ بیگمات کبھی نہیں

رہیں۔ سلطان کی شادی دو خواتین سے ہوئی تھی۔ ان میں جب ایک کا انتقال

ہوا تو سلطان نے ایک اور شادی کی تھی۔ سلطان کی شہادت کے وقت اس کی کوئی بیگم زندہ نہ تھی۔

اس سے پہلے دو کیمزوں کا سلطان کے سپرد ہونے کا واقعہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے بھی سلطان کی کمال حیا واری اور پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے۔

والدین کی اطاعت گزار میں سلطان اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ والدین خاص کر والدہ کے ان احکامات کی بھی تعمیل کرتا تھا جو اس کے مزاج کے خلاف ہوتے تھے۔

میسور گز بیٹرنے اس کی تصدیق اس طرح کی ہے:

”سلطان کا نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ اپنی والدہ کا مدد درجہ احترام کرتا تھا۔ ماں کی نصیحت سے اس نے کبھی بے اعتنائی نہیں کی، اگرچہ بعض اوقات والدہ کی خواہشات اس کی مرضی کے بالکل خلاف ہوتی تھیں۔“

سلطان کی انسانی ہمدردی پر تو میسور کو گہج بھی فخر ہے۔ شہر کے قریب چامند کی پہاڑی پر کالی دیوی کا مندر تھا۔ اس مندر میں ہندو دیوی کی خوشنودی کے لیے انسانوں کی قربانی دیتے تھے۔ یہ رسم ہندوؤں میں قدیم زمانے سے چلی آرہی تھی مگر سلطان نے اس رسم کو ”قوبن آدم“ قرار دیا اور اس رسم کو قانوناً بند کر دیا۔

میسور گورنمنٹ کی شائع کردہ کتاب ”راہنمائے میسور“ میں لکھا ہے کہ:

”اس پہاڑی کا نام کالی دیوی یا چامند کی ہے۔ ناکہ پر رکھا گیا تھا۔ کالی کی پوجا اس مندر میں ہوتی تھی جو پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔“

زمانہ قدیم سے یہاں انسانی قربانی ہوتی تھی جو سلطنت حیدری (سلطنت خداداد) کے زمانہ میں سختی سے روک دی گئی۔“

اسی ہمدردی کے تحت سلطان نے پوری سلطنت خداداد میں سرکاری خرچ پر یتیم خانے قائم کیے۔ اس کام کی ابتدا حیدر علی خاں کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ سلطان نے اس میں اضافہ اور باقاعدگی پیدا کی۔ ان یتیم خانوں کے بارے میں دکنس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

”سلطان نے ان یتیم خانوں میں ان بچوں کو داخل کیا جو گروگ کی بغاوت کے بعد اپنے والدین کے ساتھ امیر ہو کر آئے تھے۔ ان بچوں کو اسلامی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس سے سلطان کا مقصد اشاعت اسلام تھا۔ اس کے علاوہ ان

یتیم خانوں سے سلطان کی مراد یہ بھی تھی کہ جو بچے یہاں سے جوان ہو کر نکلیں وہ فوج میں بھرتی کر لیے جائیں۔

سلطان ترکی کے سلطان سلیم کی تقلید میں پگچری فوج کی طرز پر اپنی فوج تیار کرنا چاہتا تھا۔

ترکی کے سلطان سلیم نے حکم دے رکھا تھا کہ عیسائیوں سے جنگ میں جو لڑکے (بچے) گرفتار ہو کر آئیں ان کو ایک ایک جگہ رکھ کر پرورش کیا جائے۔ یہ بچے سلطان ترکی کے اپنے بچے کہلاتے تھے اور انہیں یہی بتایا جاتا کہ ان کے والدین سلطان اور سلطانہ ہیں۔

ان بچوں کو بہترین غذا اور عمدہ ترین سپہ گری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جوان ہو کر یہ بچے انتہائی بہادر اور سلطان کے سب سے زیادہ وفادار فوجی ہوتے تھے۔

سلطان نے ان کی ایک فوج قائم کی اور اس کا نام پگچری رکھا۔ سلطان ان خاص فوجیوں سے اپنی اندرونی بغاوتوں کو ختم کرتا اور انہیں بہت خاص خاص جنگوں میں استعمال کرتا تھا۔

پگچری فوج کے سواروں کے سروں پر لمبی چوہچ دار ٹوپیاں ہوتی تھیں اور یہ فوج درہی سے پہچان لی جاتی تھی۔

سلطان ترکی کی یہ فوج بہادر اور وفادار تو ضرور تھی لیکن آگے چل کر یہ اتنی خود سر ہو گئی کہ اسے ”مہورا“ ختم کر دیا گیا۔

سلطان شہید کی تخت نشینی سے پہلے میسور میں ”غلامی“ کا بھی رواج تھا۔ سلطان نے اس غلامی کا ایک فرمان جاری کر کے اس برائی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

اس حکم میں وضاحت کی گئی کہ لوگ اپنی مرضی سے دوسرے کی ملازمت اور نوکری تو اختیار کر سکتے ہیں مگر کسی کو ہمیشہ کے لیے غلام نہیں بنایا جاسکتا۔

سلطان کی رحمت کی ہزاروں داستانیں مشہور اور زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ مرثیوں سے جنگ کے دور کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ:

سلطان کو یہ اطلاع ملی کہ سپاہیوں کی زیادتی سے خنزروہ ہو کر ایک گاؤں کی عورتوں نے دریا میں ڈوب کر اپنی جانیں دیدیں۔

سلطان بیخبر سن کر غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے ملزموں کو عبرت ناک سزائیں دیں تاکہ آئندہ ایسا واقعہ نہ دہرائے ہو۔

فوج کا ایک خاص فن سمجھے جاتے تھے۔

کرنل آر تھروڈزلی جو بعد میں ڈیوک آف ونگٹن ہوا، لکھتا ہے:

"اس کی سوار فوج دنیا کی بہترین فوج ہے۔ ہمارے اس ملک میں داخل ہونے کے وقت سے وہ ہمارے پیچھے اس طرح لگی رہی کہ ہماری فوج میں سے ایک آدمی کا بھی کیپ سے باہر نکلا مشکل ہو گیا تھا لیکن ہم ایک ایسے راستے سے آگے بڑھے جو بالکل غیر معروف تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم ہنگو کو چھوڑ کر آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔"

کرنل آر تھروڈزلی نے بھی اس خود میں صاف طور پر اعتراف کیا ہے کہ اس نے ایک غیر معروف راستہ اختیار کیا تھا اس لیے قلعہ سرنگاچیم تک بغیر کسی مزاحمت کے پہنچ گیا۔ یہ غیر معروف راستہ اسی غدار میر قاسم کا بنایا ہوا تھا جو کہ انگریز فوج کو اس باغ ملک لے گیا تھا جس میں چھپی ہوئی فوج قلعہ سے دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس کے بعد اسی ایمان فروشنے اس فوج کو اس وقت بھی راستہ دکھایا تھا جب سید غفار کو میر حسین الدین نے سبز چھتری کے نیچے انگریز فوج کی گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

سلطان کی شکست کی وجہ اس کی جنگی قابلیت کا فقدان نہیں بلکہ اس کے امرا اور وزرا کی غداری تھی بالکل اسی طرح جس طرح عربوں کی غداری سے ترکی سلطنت اور قلا شورو بازار کی بے ایمانی سے امیر امان اللہ خان کی حکومت (افغانستان) کا تختہ الٹا گیا تھا۔

جس طرح نواب حیدر علی خاں قلعہ بنانے میں مشاق تھے اسی طرح سلطان۔ ٹیپو بھی قلعہ تعمیر کرانے کے فن سے پوری طرح واقف تھا۔ اس کے بنائے ہوئے قلعے آج بھی موجود ہیں۔ اسی طرح سلطان ابغیر ملک کے فن میں بھی ملاق تھا۔

کرنل ڈلزی اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے:

"جب ہم محل میں سلطان کے خاص کمرے میں پہنچے تو یہاں چار پائی کے

قریب میز پر آئینہ اس کا ایک نقشہ، چند کاغذات جن پر آئینہ اس کے نقشے بنے ہوئے

تھے اور پُرکار وغیرہ کا ایک کس رکھا ہوا تھا۔"

سلطان کی شجاعت اور بہادری میں تو کوئی شبہ نہ رہی نہیں سکتا۔ وہ دست بدست جنگوں میں ہڈیاں خود ٹکراتے ہوئے اور شہر زنی کے جوہر دکھاتا تھا۔

شیر کا شکار سلطان کی بہترین تفریح تھی۔ سلطان کی بہادری کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔

اسی جنگ کے دوران مرہٹوں کی بہت سی یوزنیں گرفتار ہو کر آئیں سلطان نے ان لوگوں کو بڑی عزت کے ساتھ الگ جیوں میں رکھا۔

اگرچہ اس وقت مرہٹوں کے ساتھ جنگ ہو رہی تھی مگر سلطان نے دربار جنگ ہی ان کو توڑنے کو گراں بہا سمجھا دے کہ سخت پہرے میں مرہٹوں کے مرکز پونا بھجوا دیا۔

ایک شب میدان جنگ میں سلطان اپنے خیمے میں آرام کر رہا تھا کہ اسے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ سلطان بے چین ہو گیا۔ اٹھ کے باہر گیا اور خود حال دریافت کیا۔

معلوم ہوا کہ قیدی پیاس سے بے حال ہیں۔

سلطان نے انہیں خود پانی پلایا اور اس وقت تک خیمے کے اندر واپس نہیں گیا جب تک وہ قیدی سونیس گئے۔

سلطان ٹیپو ایک وقت نئی قسم کے علوم و فنون کا ماہر تھا۔ بورنگ اپنی تاریخ میں سلطان کی صفات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"وہ وزارت کا کام کر سکتا تھا۔ سپہ سالاری میں طاق تھا۔ امیر البحر تھا اور

سب قسم کے علوم و فنون میں کامل مہارت رکھتا تھا۔

اس کی جنگی مہارت اور قابلیت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ جس وقت جنگی

میڑ تیار کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے امیرانہم میں ہمازدوں کے غولے تک

بیچ دیے تھے کہ ان غولوں کے مطابق جہاز تیار کیے جائیں۔

ان کے پسند سے کے متعلق ہدایت ہوتی تھی کہ تانبے کے بنائے جائیں

نیز اس کے لیے جنگی بھی نامزد کر دیا گیا تھا۔"

میدان جنگ میں سلطان کی قابلیت اور شہرت محتاج بیان نہیں۔ مدراس پر اس کا مشہور دھاوا، سیلی، بریٹن وائٹ، فلورن اور منرو کی شکست اور دوسری لڑائیاں اس کا یقین ثبوت دیتا کرتی ہیں مگر ۱۷۹۹ء کی جنگ میں میڈوز سے شکست کے متعلق ایک انگریز افسر لکھتا ہے:

"اس نے میدان جنگ میں اس قابلیت کا اظہار نہیں کیا جو حیدر علی کا طرہ

امتیاز تھا۔ اس نے سب سے بڑی غلطی یہی کی کہ اپنی سوار فوج میں نمایاں کمی کر

دی اور اس کے عوض توپ خانہ کو بڑھا دیا جس کی وجہ سے ییسو کی تیسری اور

چوتھی جنگ میں وہ اچانک حملے نہیں ہو پائے جو ان جنگوں سے پہلے حیدر

یام شہزادگی میں شہزادہ پیو ایک فرانسیسی کے ساتھ جنگل میں شیر کا شکار کھینے گیا۔ یہ دونوں انتہائی مہم
نہے کہ اچانک شیر سامنے آگیا۔

فرانسیسی نے فوراً اپنی بندوق سنبھالی اور چالا کہ شیر پر گولی چلا دی۔ شہزادے کو اس کی یہ بات
سخت ناگوار گزری۔ اس نے فرانسیسی سے بندوق چھین لی۔ پھر خود دو دھاری تلوار سونت کر شیر کی طرف بڑھا۔
شیر جست لگا کر شہزادے پر گرا۔

شہزادہ چیترا بدل کر ایک طرف ہوا اور تلوار کا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ شیر کی گلی دونوں ٹانگیں قلم ہو گئیں۔
زخمی شیر زور سے دھاڑا اور کٹی ٹانگوں کے ساتھ دوبارہ شہزادے پر چھلانگ لگادی۔
شہزادہ اس بار بھی چیترا بدل کر ایک طرف ہو گیا اور اس پر ایسا دار کیا کہ شیر کی پچھلی دونوں ٹانگیں
بھی کٹ گئیں۔

اب شیر بغیر ٹانگوں کے زمین پٹ رہا تھا۔

اور فرانسیسی شکاری کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

سلطان کی یہی وہ مردانگی تھی کہ وہ آخری دقت تک داد و شجاعت دینا ہوا لڑتا رہا اور اس نے اپنے قول کی
تصدیق کر دی کہ:

”شیر کا ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔“

سلطان نے کئی شیر اپنے محل میں پال رکھے تھے۔ شیر کی لڑائی، صفات اور اس کا رنگ سلطان کو اس قدر
پسند تھا کہ اس کے محلات، اس کی تعمیر کردہ مسجد اور گنبد تمام اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

سلطان کے تمام ہتھیاروں پر:

”اسد اللہ غالب“

کندہ تھا۔

میسور میں یہ روایت بھی زبان زد خاص و عام ہے کہ نواب بہادر جیدر علی خاں نے نظام الملک مسیور
نظام علی خاں والی دکن کو پیغام بھیجا تھا کہ:

”مگر آپس میں شادیاں ہو جائیں تو آئندہ دونوں سلطنتوں میں اتحاد رہے گا۔“

اس سلسلہ میں نواب نے تجویز پیش کی کہ نظام الملک کی دختر سے سلطان ٹیپو کی شادی کر دی جائے۔ چنانچہ

جیدر . . . دے شہزادے کی تصویر طلب کی گئی اور چند مشہور مصور جیدر آباد سے سرنگا پٹم بھیجے گئے تاکہ شہزادے
کی تصویر بنا سکیں۔

شہزادہ ان مصوروں کو عمل کے اسی حصے میں لے گیا جہاں اس نے اپنے شیر پال رکھے تھے۔ ایک مصور
نے حیران ہو کر پوچھا:

”شہزادہ بہادر۔ ان شیروں کا آپ کی تصویر سے کیا تعلق ہو گا؟“

شہزادے نے جواب دیا:

”میں ان شیروں سے کشتی لڑوں گا اور تم تصویر بناؤ گے کیونکہ مردوں کی بہترین تصویر ان کی
جو انفرادی ہوتی ہے۔“

کاش!

شہزادے کی شادی نظام کی دختر سے ہو جاتی تو ممکن تھا کہ سرنگا پٹم اس عظیم المیہ سے دوچار نہ ہوتا جو ہم
۱۷۹۹ء کو سلطان کی شہادت سے شروع ہوا۔

مگر — کارخانہ قدرت کے نظام پر کسی کو اختیار نہیں۔ اس وحدۃ لا شریک کے سبب ہی رنگ نرا
اور نیا رہے ہوتے ہیں۔

میسور گزر بٹیر کا مصنف سلطان کے اوصاف کے ذیل میں لکھتا ہے:

”اس کی سپاہیانہ زندگی، ذاتی بہادری اور بے جگری، اور ایسے وقت میں

بھی جب اس کی شکست یقینی تھی، اس کا اپنے آپ کو دشمن کے حوالے نہ کرنا۔

شجاعت اور جو انفرادی کردہ بے نظیر مثال ہے جس کے لیے وہ حدودِ تبرع کا

مستحق ہے۔

ان لوگوں سے، جنہیں وہ اپنا دوست سمجھتا تھا، اس نے کبھی بے وفائی

نہیں کی۔

میسور کی چوتھی لڑائی میں (۱۷۹۹ء) انگریزوں کا مطالبہ تھا کہ اس کی ملازمت

میں جو چند فرانسیسی ہیں اس کے حوالے کر دیے جائیں تو اس کا سخت و ناجائز

سکتا ہے۔

لیکن — اس کی شجاعت نے اسے گوارا نہ کیا۔

یہ بات مشہور ہے کہ سکندر اور جوہیس سیر کے بعد نپولین بونا پارٹ دنیا کا سب سے عظیم سپہ سالار فاتح اور جہل تھا۔

بے شک نپولین بہت بڑا فاتح تھا لیکن اگر ہم نپولین اور سلطان شہید کے آخری لمحات کا موازنہ کریں تو یہ حیرت ناک بات سامنے آتی ہے کہ سلطان شہید کی شخصیت، نپولین کی شخصیت سے کہیں زیادہ عظیم اذی وقار اور شاندار ہے۔

یہ درست ہے کہ نپولین نے بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں مگر جب اسے اپنے امرا کی سازش اور غداری کی وجہ سے شکست کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے اپنے وطن کو دشمن کے سپرد کرتے ہوئے دشمن کی اطاعت قبول کر لی۔

نپولین کو قید کر دیا گیا اور اسی قید میں وہ مر گیا۔

مگر۔

جب سلطان پر یہ وقت آیا اور اسے بھی اپنے امرا اور وزرائی سازشوں اور غداریوں کی وجہ سے شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو اس نے انگریز کی اطاعت قبول کرنے کے بجائے اپنی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے میدان جنگ میں ملک و ملت کا دفاع کرتے ہوئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیا۔

اس طرح سلطان شہید نے اپنے لیے وہ موت پسندی جس کے لیے اس کا ہم عصر دوست نپولین بونا پارٹ ہمیشہ ترستار رہا۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس مال و دولت کی فراوانی تھی اور اس دولت نے انہیں راہِ راست سے بھٹکا دیا تھا۔ ان میں آرام طلبی اور عیش پرستی حذرِ بڑھ گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حکومت سے لاپرواہ ہوتے چلے گئے اور ان کا زیادہ دقت بے وقت اور بے مقصد خارجہ جنگوں میں گزرنے لگا۔

اس سے ہندوستان میں آنے والی مغربی قوموں کو یہ موقع ملا کہ وہ تجارت کے نام پر اپنی حکومتیں ہندوستان میں قائم کرنے لگے۔ انہیں اپنی سلطنت کے قیام اور وسعت کا خیال مسلم حکمرانوں کی آنے والی دکن کی آپس کی لڑائیوں سے پیدا ہوا۔

سلطان نے اپنے والد نواب حیدر علی خاں کے راہ میں بھی انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کا غور سے مطالعہ کیا تھا

اور خود ان سے خبردار بنا بھی ہوا تھا۔

کرناٹک کے والا جاہ محمد علی، دکن کے نظام الملک اور مرہٹوں کی انگریز دوستی اس کے سامنے تھی۔ نواب حیدر علی خاں نے جو گھمٹی جنگ لڑی تھی۔ انہوں نے انگریزوں، نظام اور مرہٹوں سے الگ الگ بھی جنگ کی تھی اور ان کی متحدہ طاقت کو بھی پاش پاش کیا تھا۔

پھر سلطان ٹیپو کا زمانہ آیا تو یہی تمام طاقتیں اس کے آگے صف آرا ہو گئیں۔ سلطان جو انگریز اور شہنشاہ میں اپنے باپ سے کسی طرح کم نہ تھا مگر نواب مرحوم کے دربار میں ملک و ملت فروش کہتے۔ پھر نواب مرحوم اپنے دشمنوں اور غداروں کی سخت کد کھاتا تھا اور انہیں معاف کرنے کے بجائے سخت سزا دیں دیتا تھا جس سے دوسروں کو عبرت حاصل ہوتی تھی۔

حیدر علی خاں جو کہ ان پڑھ تھے اس لیے ان کے مزاج میں سختی اور اکھڑن تھا جبکہ سلطان شہید ایک عالم فاضل اور بڑا انسان تھا۔

چنانچہ سلطان ٹیپو نے مسلمانوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے سختی اور سنگین سزاؤں کے بجائے ان میں جو شہنشاہ پیدا کرنے اور انہوں نے لاقصد کیا اور اس کے لیے عملی اقدامات کیے۔ سلطان نے مسلم قوم کی برائیوں کا واحد علاج یہ سمجھا کہ مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جہاد کا درس بھی دیا جائے۔

اس کے خیال میں جہاد ہی وہ واحد علاج تھا جو مسلمانوں کو غارتگیوں سے بچا سکتا تھا اور ہندوستان بھی غیر ملکیوں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔

پس

سلطان نے یہ بات مسلمانوں کو سمجھائی کہ اسلام اور آزادی دو الگ الگ نظریے نہیں ہیں۔ اسی لیے اس نے اپنی کتاب "فتح المجاہدین" میں مسلمانوں کو خاص طور پر جہاد کی تعلیم دی۔

اس کتاب میں بہت سے مسائل ہیں جن میں سے صرف دو کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۱ پر تحریر ہے:

"جہاد با کفار از برائے نفرتِ دینِ محمد اسلام است۔"

ترجمہ:

کافروں سے جہاد دراصل نفرتِ اسلام کا دوسرا نام ہے۔

اسی کتاب کے صفحہ ۵ پر لکھا ہے:

”نیکو نیست باج وادان با کفار با قدرۃ بر جہاد“

ترجمہ:

”جہاد کی طاقت رکھتے ہوئے کافر کو خراج دینا نیکی نہیں ہے۔“

سلطان نے مسلمانوں میں جذبہ عہد پیداکرنے کے لیے ”مؤید المجاہدین“ کے نام سے اپنے جمعہ کے خطبات کی تدوین کا حکم دیا۔ یہی خطبات مسجدوں میں بھی پڑھے جلتے تھے۔ اس کتاب میں پچاس خطبات جمعہ اور دو خطبے عیدین کے ہیں۔

سلطان نے اس کتاب کی تصنیف کا سبب دیا پھر میں، خود اس طرح بیان کیا ہے:

”اس زمانہ میں کہ پندرہویں صدی، ہجری ہے اور اس وجہ سے سلطنت تیموریہ دہلی

پر خانہ زادوں اور ملک حراموں کی وجہ سے تباہی آگئی ہے اور ایک غیبر قوم

روز بروز غلبہ پاتی ہوئی ملک پر مسلط ہوئی جا رہی ہے، خلع ہند کے باشندے

کسب کمال سے عاری اور درس و تدریس اور احکام مذہب سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔

اس لیے حکم سلطانی ان خطبات کی فارسی زبان میں ترویج کی جاتی ہے۔

اب تک خطبات جمعہ عربی زبان میں تھے مگر اکثریت اس زبان سے نا آشنا

ہو گئی ہے اس لیے فارسی کو موزوں سمجھا گیا۔“

ایک بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ سلطان اس قدر مذہبی جذبہ رکھنے کے باوجود بے انتہاء وادار اور بے تعصب فتاویٰ کی متعصب مؤرخین نے سلطان کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس میں انگریزوں کا ایک مقصد پوشیدہ تھا۔

دراصل انگریز ہندوستان میں ”لٹراڈ اور حکومت کردہ“ کی پالیسی پر عمل پیرا تھے چنانچہ انہوں نے ایسی تواریخ مرتب کرائیں جنہیں پڑھ کر ہندو مسلمانوں کے خلاف ہو گئے۔

چونکہ انگریز اور ہندو دونوں ہی مسلمانوں کے خلاف تھے اس لیے ان کے گٹھ جوڑ سے جنوبی ہند کی تاریخ ایک خاص ڈھب سے ترتیب دے کر لکھی گئی۔ ایسی لکھی جانے والی تاریخوں میں کوئی حوالہ یا کوئی سند نہ ہوتی تھی۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور بعد میں آنے والی نسلیں میں بھی غلط تواریخ رواج پائی گئیں درنہ انگریزوں کی بھی

تحقیق کر کے تاریخ لکھی جاتی تو میسور کا ذرہ ذرہ سلطان کی رواداری کا شہد تھا۔

ریاست میسور میں داخل ہوتے ہی ہمیں ہندوؤں کے مندر دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض مندر ہزار ہا سال سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔

اگر سلطان ذرا بھی متعصب ہوتا تو ان مندروں اور عبادت گاہوں کو زمین بوس کر سکتا تھا لیکن اس نے تو اپنے زمانے میں ان مندروں کے لیے جاگیریں مقرر کی تھیں۔ ان جاگیروں کے کاغذات اور اس سلسلے میں سلطان کے فرامین اب بھی ان مندروں میں موجود ہیں اور ان کی بنا پر آج تک ان مندروں کو مراعات حاصل ہیں۔

ریاست کے دارالسلطنت مرنگاپٹم پر اترتے ہی سب سے پہلے نظریں دو بڑے بڑے مندروں پر پڑتی ہیں جو شیش کے بالکل قریب ہیں۔

سلطان کا محل ان مندروں کے بالکل پاس تھا۔ محل کے پیچھے بلکہ محل سے بالکل ملا ہوا ایک اور بڑا مندر ہے جنگلوں میں بھی محل سے بالکل متصل ایک مندر آج بھی موجود ہے۔

ان مندروں کے علاوہ مرنگاپٹم، میسور، بنجی گڑھ اور السور (بنگلور) وغیرہ میں سینکڑوں سال پرانے مندر موجود ہیں۔ سلطان نے ان سے کوئی تعزیر نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے ان کے اخراجات کے لیے جاگیریں عطا کیں۔ سلطان ان مندروں کے پتھروں اور بنجاریوں کی بہت عزت کرتا تھا جس کا ایک ثبوت ریاست کے آرکولوجیکل کی رپورٹوں سے بخوبی ملتا ہے۔

ایسی ہی ایک رپورٹ میں لکھا ہے،

”مرنگاپٹم کے مندر میں حیدر علی خاں اور سلطان ٹیپو کے تین تین خطوط اور

فرمان ملے ہیں۔ ان خطوط اور فرامین میں سلطان نے سن ہجری کے ساتھ ساتھ سن

(یعنی سن سلطان نے ایسا کیا تھا) بھی استعمال ہوا ہے۔

ان میں سرخ رنگ کا کاغذ استعمال ہوا ہے اور بعض کی لوح پر سلطان کی تحریر

بھی لگی ہے۔

ان خطوط میں سلطان نے مرنگاپٹم کے گرو کا نام اور القاب پہلے لکھے ہیں اور

اپنے نام کے ساتھ کوئی خطاب یا القاب نہیں لگایا۔ ان خطوط سے میسور کی تیسری

لڑائی پر روشنی پڑتی ہے۔“

سلطان ٹیپو کی ہندوؤں کے ساتھ رواداری کی مثال ان خطوط سے ملتی ہے جو سلطان اور مرنگاپٹم کے گرو نے ایک دوسرے کو لکھے تھے۔

قارئین جانتے ہیں کہ میسور کی تیسری جنگ میں انگریزوں کا نظام اور مرہٹوں کی متحدہ فوجوں نے سلطان پر طغیان کیا تھا۔ اس حملہ میں مرہٹوں کا سپہ سالار اگرچہ پر مورام تھا مگر اس نے اپنے حملے کے دوران مرہٹوں کو کھٹکے کر برباد کر دیا تھا۔

چنانچہ مندر کے گردنے سلطان کو لکھا کہ:

”مرہٹی فوج نے مرہٹوں کے مندر کو لوٹ کے تباہ کر دیا ہے۔ مارزا دیوی کو اپنی جگہ سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے۔ مندر کا سامان جس کی قیمت ۶۰ لاکھ کے قریب ہے اور مندر کے تمام ہاتھی گھوڑے جس مرہٹے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“

گرو کے اس خط کے جواب میں سلطان نے اسے لکھا،

”ہم ان دشمنوں کو مرزا دے رہے ہیں جو ہمارے ملک پر چڑھائی کر کے ہمارے رعایا کو سزا دے رہے ہیں۔ اس لیے یہ آپ کا اور مندر کے دوسرے برہمنوں کا فرض ہے کہ دشمنوں کی تباہی کے لیے خدا سے دعا کریں کہ ہمارا ملک محفوظ اور رعایا خوش و خرم رہے۔“

ان لوگوں کو جو مقدس مقامات کی بے حرمتی کرنے سے باز نہیں آتے،

بہت جلد انہیں اپنے کرتوتوں کا خیارہ جھگٹنا پڑے گا۔

لوگ بدی کا کام ہتے ہوئے کہتے ہیں مگر خیارہ روتے ہوئے جھگٹنا ہوگا۔

گروؤں سے دغا بازی خود اپنی نسل منقطع کرنے کے برابر ہے۔

اس خط کے ساتھ سلطان نے ایک حکمنامہ آصف کے نام بھیجا تھا جس میں حاکم علاقہ کو حکم دیا گیا تھا

کہ دو سو راجس (سوتے کی اشرفیان) نقد اور ۲۰۰ راجس کی اجناس گرو کی خدمت میں پیش کرنے۔

ایک دوسرے خط میں سلطان نے گرو کو تحریر کیا تھا کہ:

”آپ کو اختیار ہے کہ انعامی دیہات سے جن چیزوں کی آپ کو ضرورت ہو وہ

حاصل کر لیں۔ اس رقم سے سارے دیوی کے بت کو نصیب کرتے ہوئے برہمنوں

کو کھانا کھلائیں اور ہمارے دشمنوں کی تباہی کے لیے دعا کریں۔ آپ کا بھیجا ہوا پرا

اور شاہین موصول ہوئیں۔

آپ کے استعمال کے لیے ایک جوڑی شال اور دیوی کے بت کے لیے

کپڑے ارسال کیے جاتے ہیں۔ آپ کی سواری کے لیے ایک ہاتھی روانہ کیا

جاتا ہے۔“

گرو نے سلطان سے شکایت کی تھی کہ ان کے چیلوں پر باہر جانے آنے پر مکاری افسروں نے پابندی لگا دی ہے۔ سلطان نے اپنے ایک حکم میں اس پابندی کو فوراً منسوخ کر دیا۔

ماہ حیدری کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ گرو نے مندر میں دو خاص رسوم ادا کرنے کے لیے سلطان کو درخواست پیش کی تھی۔ یہ رسوم مسلسل ۸ دن تک جاری رہتی تھیں۔

اس کے جواب میں سلطان نے ایک طرف تو گرو کے آصف کو حکمنامہ بھیجا کہ وہ گرو کے پاس جا کر ان رسومات کے جملہ اشقات کر لے اور ہر طرح ان کی مدد کرے۔

اس کے ساتھ ہی سلطان نے گرو کو لکھا:

”آپ کی حسبِ مرضی پوجا کے دنوں میں روزانہ ایک ہزار برہمنوں کو کھانا کھلانے اور نقدی دینے کے متعلق آصف کو حکم بھیج دیا گیا ہے۔“



مٹاڑی یا سنگالی نام کی ایک جنگلی قوم مرہٹوں کے مندر کے قریب واقع جنگل میں رہتی تھی۔ وہ اکثر مندر پر حملہ کر کے لوگوں کو پریشان کرتی رہتی تھی۔ اس سے محفوظ رہنے کے لیے گرو نے سلطان کو خط لکھا کہ سلطان نے فوراً سپاہیوں کا پرہ مندر کے گرد لگا دیا۔ پھر جنگلیوں کو باہر آنے یا مندر پر حملہ کرنے کی دوبارہ ہمت نہ ہوئی۔

مندرجہ کے ایک اور ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے سارے دیوی کے بت کے استعمال کے لیے ایک پاکی اور ایک دوسری پالکی گرو کے استعمال کے لیے بذریعہ چوہدری فقیر محمد، گرو کو مرہٹوں بھیجی تھی۔ اس مندر کے ریکارڈ میں ایک اور خط موجود ہے جس میں سلطان نے مندر کے عامل سید محمد کو حکم دیا ہے:

”سوامی جی سمندری غسل کے لیے جانے والے ہیں۔ انہیں سفر میں تمام

ضروریات مہیا کی جائیں۔“

میسور کی تیسری جنگ میں مرہٹے اس مندر کا تمام سامان لوٹ کر لے گئے تھے۔ گرو نے سلطان سے درخواست کی کہ اسے مرہٹوں کے مرکز پونا جانے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ خود وہاں جا کر پر مورام بھاد سے مندر کے سامان کی واپسی کے لیے گفتگو کر سکیں۔

سلطان نے فوراً ان کے جلنے کے لیے راہداری اور تمام سفری ضرورتوں کا انتظام کرا دیا۔ مگر دربار سے چونکہ پہنچ گئے۔

دہلی انہوں نے سامان کی واپسی کی بہت کوشش کی مگر انہیں کوئی کامیابی نہ ہوئی حالانکہ پونائیں انہوں نے ایک طویل عرصہ گزارا۔

مرنگری کا مندر جنوبی ہند اور میسور میں بہت متبرک خیال کیا جاتا تھا۔ اس مندر کا گرد و دہلی کے راجاؤں کا راجاؤں کا رہنما تصور کیا جاتا تھا اور اسے تمام شاہی تقریبات میں مدعو کیا جاتا تھا۔

سلطان نے اپنی غیر مسلم رعایا اور ان کے مندروں کو جو مراعات دی تھیں ان کی تفصیل کے لیے الگ سے ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ سلطان کے دہلی کے مندر دلی کو جو تھارے اور برتن ملایکے تھے آج بھی دہلی موجود ہیں اور اپنی زبان حال سے سلطان کی رواداری کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔



سلطان فیض شہید کی زندگی اور سلطنت خداداد کے عروج و زوال کی کہانی
اس قدر تفصیل سے بیان کرنے کے باوجود اب بھی تشنہ ادنا مکمل ہے کیونکہ سلطان کی ذات میں خداوند گیم نے اس قدر صفات سمودی تھیں کہ اس کے ہر وصف کے بیان کے لیے ایک باب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

سلطان فیض پر اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ اگرچہ کچھ کم نہیں مگر اس کی زندگی کے ابھی اور بہت سے ایسے گوشے ہیں جن پر نگہنی ضرورت ہے۔

سلطان کی ذات و صفات پر لکھنے والوں نے توبہ لکھا ہے کہ:

ہندوستان کی پرانی تاریخوں میں سلطان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ دراصل انگریزوں اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ سے تیار ہونے والی ایک مکمل سازش کے تحت لکھا گیا تھا جس کا مقصد سلطان کو ہندوؤں، مسلمانوں اور عالم اسلام میں بدنام کرنا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سلطان پر نہ صرف مزید تحقیق کی جائے بلکہ ہمارے دور کی تاریخوں میں غفلت یا کسی اور وجہ سے سلطان شہید کے بارے میں جو غلط بلکہ بے سرو پا باتیں لکھی گئی ہیں ان کی نشاندہی کی جائے اور انہیں تاریخوں سے حذف کرنے کا سرکاری اور غیر سرکاری طور پر انتظام ہونا چاہیے۔

سلطان کے حالات اور واقعات کے ذکر کے بعد یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کا بھی مختصر حال بیان کیا جائے جسے سرنگاپٹم کہا جاتا ہے۔

اس شہر کو نہ صرف سلطنت خدا داد میسور کے دارالسلطنت ہونے کا فخر حاصل ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ اپنے دور کا ایک عظیم الشان شہر تھا۔

آئیے دیکھتے ہیں کہ سرنگاپٹم

ماضی میں کس حالت میں تھا؟

اور۔۔۔ آج کس حال میں ہے؟

اس صفحہ کے بالمقابل قلعہ سرنگاپٹم کا ایک نقشہ دیا جا رہا ہے جس میں ان تمام مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں ۲۰ مئی ۱۹۹۲ء کو قیامت صغریٰ برپا ہوئی تھی اور سلطان شیوا اپنے ایمان فروختی، ننگ جلاں اور غدا امرا اور وزرا کے ہاتھوں اپنے ہی خون میں نہا کر شہید ہو گیا تھا۔

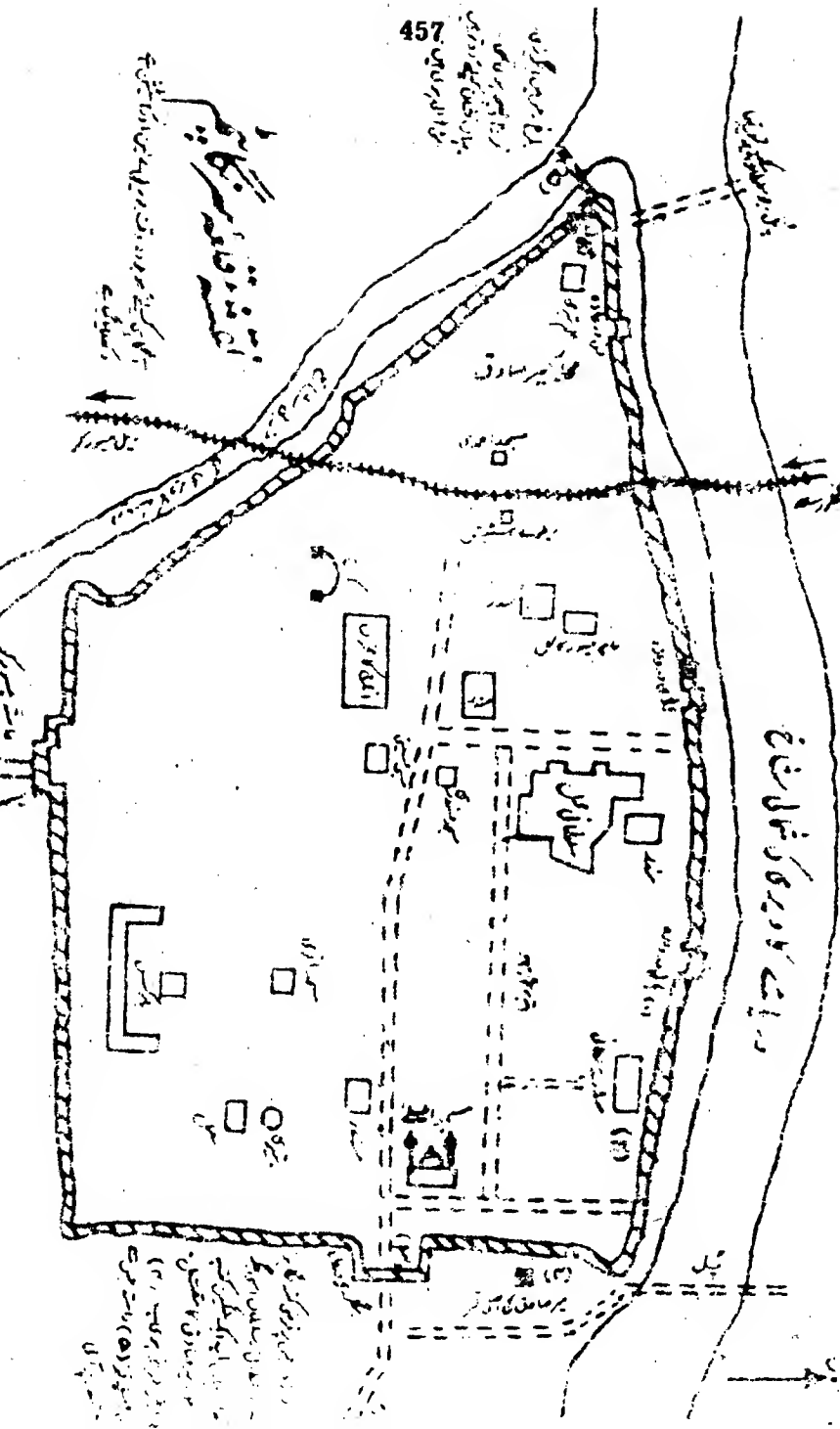
سلطنت خدا داد میسور کے دارالسلطنت سرنگاپٹم کا جو حال سلطان شیوا کی زندگی میں تھا اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

”مہاراجا خدا داد میسور سرنگاپٹم کا نام سلطان نے ظفر آباد رکھا تھا یہ میسور کے جنوبی حصہ میں دریائے کاویری کا ایک جزیرہ ہے۔ اس کی لمبائی چار میل سے کچھ زیادہ اور چوڑائی ایک میل سے کچھ زیادہ ہے۔ اس شہر کی بنیاد نویں صدی عیسوی میں پڑی تھی۔

جنوبی ہند میں عہد قدیم میں وجیانگر کی ایک عظیم ہندو ریاست تھی سرنگاپٹم کا راجہ وجیانگر کے ماتحت تھا۔ اس نے ۱۲۵۲ء میں راجہ کی اجازت سے سرنگاپٹم میں قلعہ تعمیر کرایا اور ۱۲۶۰ء میں اسے اپنی راجدھانی بنایا۔ اُس وقت سے ۱۷۹۹ء تک یہ شہر دارالسلطنت ہی رہا۔

۱۷۶۱ء میں نواب حیدر علی خاں میسور کے قدیم راجہ خاندان کو معزول کر کے خود برسرِ اقتدار بنے۔ اس وقت سے لے کر زوالِ سلطنتِ خدا داد یعنی ۴۰ سال تک اس شہر کو جو عروج حاصل رہا وہ تدریج کا ایک درخشاں اور تابندہ باب ہے۔

حیدر علی خاں نے سرنگاپٹم کے پرانے قلعہ کو گرا کر اس کی جگہ نیا قلعہ تعمیر کیا۔



حیدر علی خاں کے بعد ان کے بیٹے سلطان ٹیپو نے اس میں متعدد تبدیلیاں
کیں۔ قلعہ کے اندر دوسری فصیل اور خندق بنوائی۔ انگریزوں نے اس فصیل کو
گرا کر خندق پر کر وادی تھی۔

زوال سے قبل ۱۷۹۲ء میں سرنگاپٹم کی جو کیفیت تھی اسے کارنوالس کاسٹن آفیسر میجر ڈیرام
یوں بیان کرتے ہیں:

”اس وقت قلعہ سے لے کر لال باغ تک آبادی ہی آبادی تھی۔ اس کا مشرق
حصہ گنجام کہلاتا ہے جو ایک کچی مٹی کی دیوار سے گھرا ہے (یہ دیوار گنجام ہے جہاں
خدا میر صادق کا محل تھا۔ گنجام جلتے ہوئے اسے ایک وفادار سپاہی نے تہہ نہ
کر دیا تھا)۔ اس کے اندر جو شہر ہے وہ برابر برابر بھٹی میں تقسیم ہے اور ہر
مربع کے چاروں طرف وسیع، فراخ اور خوش نما شہر ہیں جن کے دونوں طرف
سایہ دار درخت لگے ہیں۔ اس میں وہ تاجر رہتے ہیں جو فوجی اور شہری ضروریات
کے لیے ہر قسم کی اشیاء فروخت کرتے ہیں۔

گنجام سے مشرق جانب وہ بلع ہے جو لال باغ کے ناک سے موسوم ہے۔ یہ
نہایت خوش نما باغ ہے اور اس میں انواع و اقسام کے چل دار درخت لگے
ہیں۔ روشوں کے دونوں طرف شمشاد کے درخت اپنا سایہ ڈال رہے ہیں۔
شہر کے مغربی جانب قلعہ کی سفید دیواریں ہیں جن کے اوپر سے قدیم
مندروں اور مسجدوں کے مینار نظر آتے ہیں۔ یہ ایک بے حد دلکش منظر
پیش کرتا ہے۔

قلعہ اور بلع کے درمیان فی حصہ کی گنجان آبادی کو دیکھا جائے تو یہ اقرار کرنا
پڑتا ہے کہ ہند کا یہ عروس اہلاد اُس دور کا متمول ترین، خوبصورت ترین اور ب
سے زیادہ سکون بخش خطہ زمین تھا۔

۱۸۰۴ء میں یعنی سرنگاپٹم کے زوال کے بعد ایک انگریز مورخ یہاں آیا۔ وہ لکھتا ہے:
”شہر کی آبادی ۳ لاکھ کے قریب ہے۔“

سلطنتِ خداداد میسور کے اس خوبصورت دارالسلطنت میں داخل ہونے کے لیے دریا
کا ویری پر دو پل ہیں۔ ایک شمالی جانب اور دوسرا جنوب میں ہے۔ شمال مغربی

سمت میں سلطان نے دہلی دروازے کے مقابل ایک پل کی بنیاد رکھی تھی جو
اب بھی موجود ہے۔

قلعہ میں داخل ہونے کے لیے متعدد دروازے ہیں۔

مشرق میں بنگلوری دروازہ

جنوب میں میسوری دروازہ اور کاتھی دروازہ

شمال میں پانی دروازہ اور

شمال مغرب میں دہلی دروازہ ہے۔“

آج — اس جزیرے میں مسجد اعلیٰ، اور باغ، مقبرہ امجد احمدی کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں۔
قلعہ کے اندر پٹن میں تھوڑی سی آبادی ہے۔

قلعہ کا مشرقی حصہ جو گنجام باغ کہلاتا تھا آج ویران ہے۔ اس کے قریب لال باغ تھا لیکن اس کا وجود
ہی باقی نہیں رہا۔

سلطانی محلات کو ڈھاد یا گلیا ہے صرف ایک ٹکستہ دیوار کتبہ لگانے کے لیے چھوڑ دی گئی ہے۔ کتبہ
پر حرف یہ لکھا ہے:

”یہاں سلطانی محل تھا۔“

سلطانی محل ایک عالی شان، خوبصورت مگر مادہ اور چھوٹی سی عمارت تھا۔ وسط میں ایک کشادہ اور وسیع کمرہ
تھا جس میں سلطان کی رہائش تھی۔ اس کے اندر چاروں طرف ایک سنہری کانس بنی ہوئی تھی اور اس پر ایک
نٹ چوڑے اور لمبے الفاظ میں آیات قرآنی لکھی ہوئی تھیں۔ ان آیات پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔

محل کے مشرق میں مسجد اعلیٰ ایک چھوٹے چھوٹے محلات تھے جن میں شہزادے اور سلطان کے دوسرے
غریب زاد اقارب رہتے تھے۔

محل کے عین مغرب میں مریزاں کا مندر تھا۔ ساتھ ہی راجہ کا محل تھا۔ جنوب میں محل سے ملحق ایک اور
مند رہے۔ اس طرح شمال مشرق میں ایک قدیم مندر ہے۔

سلطانی محل کے تین اطراف میں گودام تھے۔ زمانہ حصے کو جلنے والے راستے پر شیر بندے ہوتے تھے۔
محل کے اندام کے وقت بے شمار چیزیں فروخت کر دی گئیں۔ ان میں سے سنگ سیاہ کے ستون آج بھی
بنگلوری کا جامع مسجد میں لگے ہوئے ہیں۔

سلطانی محل کے ساتھ بنگلوری دروازے سے ملحق مسجد اعلیٰ کی بنیاد ۱۷۰۲ھ میں رکھی گئی تھی۔ اس کے

سر بنگلہ مینار آج بھی شکوہ سلطان کو ظاہر کرتے ہیں۔

یہ وہ مسجد ہے جس کے در و دیوار پر فدایانِ آزادی کے لوہے کے پھینٹے پڑے ہوئے ہیں۔ اس عمارت کے درجے ہیں:

اوپر کے حصے میں مسجد ہے جس پر پہنچنے کے لیے دونوں طرف پختہ سیڑھیاں بنی ہیں۔ میناروں پر جانے کے لیے بھی سیڑھیاں بنی ہیں۔

سلطان کی خانہ بہنگا نہ یہیں ادا ہوتی تھی۔

سلطان مسجدِ اعلیٰ میں عمارت سے داخل نہیں ہوتا تھا تاکہ نمازیوں کے استغفران میں یا مسجد کے احترام میں کوئی فرق نہ پڑے۔

مسجد کے بڑے کمرے میں شمالی جانب ایک چھوٹا دروازہ تھا جو اب بند کر دیا گیا ہے۔ سلطان اسی دروازے سے داخل ہو کر پہلی جگہ پر فی الفور عبادت میں مشغول ہو جاتا تھا تاکہ خدا کے گھر میں تمام بندے ایک ہی صف اور ایک ہی مقام پر رہیں۔

سلطان کا دیوانِ عام دریا دولت کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دریائے کا دیر کی شمالی شاخ سے ۲۰ گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ عمارت دو منزلہ ہے۔ دو مری منزل کے ایک جھروکے میں سلطان کی نشست گاہ تھی۔ سامنے براہ راست جس میں امرا و وزراء کی نشستیں تھیں۔

دیواروں پر معنی خیز تصویریں ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل افراد کی تصاویر شامل ہیں:

نانا فرخزاد، مرہٹہ وزیر پونا

محمد علی والا جاہ

نظام الملک

نواب کرٹپہ

نواب شاہنور

ایک فریم میں سرنگا پٹم کا نقشہ بھی دیا گیا ہے جس پر سلطان کے دستخط کا عکس بھی ہے۔

دریا دولت باغ سے مشرقی سمت گزرتے ہوئے سلطان شہید کا مقبرہ آتا ہے جو سلطان نے خود تیار کرایا تھا۔

مقبرہ کے اندر بیر (شیر کا) رنگ کیا گیا ہے۔ اس میں تین قبریں ہیں:

۱۔ نواب حیدر علی خاں کی

۲۔ سلطان کی والدہ ماجدہ کی

۳۔ خود سلطان کی۔

مقبرہ کی عمارت سلطنت و جلال کا عبرت افزا منظر ہے۔ مقبرہ کے باہر مغزی دروازے پر چوکھٹ کے دائیں بائیں تاریخیں درج ہیں۔ یہ تاریخیں سید شیخ الجعفری میر حسین علی کی لکھی ہوئی ہیں اور کتبے ۱۲۱۳ھ میں سید عبدالقادر نے بنائے تھے۔

صحن میں مسجدِ اقصیٰ ہے۔ اس میں بھی سیری رنگ کیا گیا ہے جو سلطان شہید کی شہرہ کے ساتھ دلچسپی کا منظر ہے۔

گنجنام کے راستے میں عید گاہ کے قریب ایک مینار ہے جس پر انگریز مقتولین کے نام درج ہیں جو ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ہلاک ہوئے تھے۔

اس کے قریب ہی تنگ وطن میر غلام علی سنگوڑا کی کوٹھی اور ایک مقبرہ ہے جس میں دو زمانہ قبریں ہیں اس کے مغربی جانب خدارنگ حرام پور دنیا کا باغ ہے۔

سلطان شہید کی جگہ شہادت پر ایک چوبی لکھا ہے۔ لوگ اس جگہ بیٹھ کر ماتم کناں ہوتے ہیں۔ امریکی مورخ برنارڈ ڈوئی کلف نے یہیں بیٹھ کر اپنا مرثیہ لکھا تھا۔

انگریزوں نے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے پانی دروازہ کے قریب ایک کتبہ لگا دیا تھا کہ سلطان اس دروازے کے شمال میں شہید ہوا تھا۔ حالانکہ حقیقت میں سلطان مشرقی دروازے یعنی بنگلوری دروازے کے قریب شہید ہوا تھا۔

یورپ میں سلطان کی زیادہ تر باقیات و تدفینیں اور برگ شاہ میں موجود ہیں جن کی تعداد ۲۳ بتائی جاتی ہے۔

ان میں اہم اشیائیں ہیں:

۱۔ سلطان کے تخت ہما کے قدموں کا ایک طلائی شیر

۲۔ جواہرات سے مزین کپا

۳۔ جواہرات سے مزین کلاہ

۴۔ جامنی رنگ کا چغڑا اور اسی رنگ کی نگلیں خود جس پر طلائی کام ہے۔

۵۔ ایک ٹوپی

۶۔ گھوڑے کا سار اور گھوڑے کا خود وغیرہ!

حضرت علیؓ

جناب علیؓ رضی اللہ عنہ پر بہت لکھا گیا ہے اود
قیامت تک لکھا جاتا رہے گا مگر معروف سیرت نگار جناب سیرت
طیلس آبادی دایم کے غیر جانبدار اود سحر نگار ظم نے ایک بالکل
نئے انداز سے سیرت امیر المؤمنین کرم اللہ وجہہ کو مکمل کر کے
سیرت نگاری کا حق ادا کر دیا ہے تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل
یہ سیرت ایک مقدس درس کا درجہ رکھتی ہے۔ فوراً طلب کیجئے
بڑا سا عمدہ سفید کاغذ ہدیہ ۱۵۰/۰۰ روپے

مکتبہ القریش سرگھر روڈ، چوک رُود و بازار لاہور

یہ چیزیں تو اس قیمتی سرمے کا عشر عشر بھی نہیں جو سلطان کے محل سے لوٹی گئی تھیں۔ ان اشیاء کی
مالیت کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔
مختصر یہ کہ جب سلطان ہی کو اس کے امرا اور وزراء نے شہید کر دیا تو اس کی باقیات کا کیا غم!
یہ تو ایک کامیابی حقیقت ہے کہ مسلمان کو کبھی کسی دشمن نے اس قدر نقصان نہیں پہنچایا جس قدر نقصان
خود اسے اپنے ہی مسلمان ہم قوموں کی غارتگریوں کی وجہ سے پہنچا۔
ان حالات کو کھتے ہوئے دل رزنا اور آنکھیں رونی ہیں:
رفیقو کیا کموں رونا میں اپنی چشم گزریاں کا
بہیں کھتے ہی دریا گہ نچو ٹوں باٹ داماں کا

(سيف الله) خالد بن ولید ○

خالد بن ولید (سيف الله) کے جنگی کارنامے نہ صرف اُن کی ولولہ انگیز قیادت کی وجہ سے مسلمانوں میں انتہائی مقبول ہیں بلکہ اُن کی فتوحات کو مغربی ممالک بھی بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

خالد بن ولید دنیا کی جنگی تاریخ میں شاید واحد سپہ سالار ہیں جس نے کسی جنگ میں بھی شکست نہیں کھائی۔ جنگِ موتہ میں اُنہیں اس وقت سپہ سالاری دی گئی جب مسلمانوں کے تین عظیم جنرل شہید ہو چکے تھے اور صرف تین ہزار کا اسلامی لشکر وولا کھرومیوں کے گھیرے میں آیا ہوا تھا مگر وہ اپنی بے مثل شجاعت اور اعلیٰ جنگی حکمتِ عملی سے پورے لشکر کو رومیوں کے چنگل سے چھڑا لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے 'سيف الله' کا خطاب پایا۔

اُس کے جانے پہچانے ناول نگار الماس ایم کے قلم سے۔

بڑا سائز، عمدہ سفید کاغذ، بہترین طباعت

مکتبہ القریش سرگھر روڈ چوک روڈ بازار لاہور